چند اہم علمی و فکری خطبات

جس میں ملکی و بین ملکی اور قومی و ملی مسائل کی نبض شناسی کرتے ہوئے فکر و عمل کا راستہ متعین کیا گیا ہے، شریعت اسلامی کی نافعیت اور انسانی ضرورت و مصلحت سے اس کی ہم آہنگی پر روشنی ڈالی گئی ہے، علماء اُمت کو اعتدالِ فکر اور جذبہ علم و تحقیق کی دعوت دی گئی ہے اور زبان و بیان کی خوبصورتی اور صاحب خطبات کی سہل نویسی نے جس کو فکری گہرائی اور علمی گیرائی کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی بنا دیا ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

باہتمام

المعہد العالی الاسلامی حیدر آباد (تلنگانہ)

ناشر

جامعہ اسلامیہ بنجاری، اندور (ایم، پی)

طبع اول ۱۴۳۷ھ — ۲۰۱۶ء

کتاب	:	چند اہم علمی وفکری خطبات
مؤلف	:	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
صفحات	:	۳۵۶
کمپیوٹر کتابت	:	محمد نصیر عالم سبیلی فون نمبر : +91 9959897621 (العالم اُردو کمپیوٹرس، کوتہ پیٹ، بارکس، حیدرآباد)
سن طباعت	:	۱۲-۱۴/ رجمادی الاول ۱۴۳۷ — ۲۱-۲۳/ فروری ۲۰۱۶ء

باہتمام : المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد (تلنگانہ)

ناشر : جامعہ اسلامیہ بنجاری، اندور (ایم، پی)

ملنے کے پتے

- المعہد العالی الاسلامی، شاہین نگر حیدرآباد۔
- جامعہ اسلامیہ بنجاری، اندور (ایم، پی)۔
- کتب خانہ نعیمیہ، ضلع سہارنپور، دیوبند (یوپی)۔
- ہندوستان پیپر امپوریم، مچھلی کمان، حیدرآباد۔

فہرست مضامین

● ● ●

عرض ناشر

علم کی امانت کو دوسروں تک پہنچانے کا ایک اہم ذریعہ خطابات اور خطبات ہیں، جو بات برموقع زبان سے کہی جاتی ہے اور حاضرین سن کر اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، اس کو اُردو زبان میں ''تقریر وخطاب'' کہتے ہیں اور جو باتیں کہنی مقصود ہوں، اگر ان کو مرتب انداز میں لکھ دیا جائے تو ان کو ''خطبات'' کہا جاتا ہے، خطبات میں طرز تو خطابت ہی کا ہوتا ہے؛ لیکن سنجیدگی، متانت، تحقیق، فکری گہرائی اور علمی گیرائی کے اعتبار سے وہ ایک تحریری اور تالیفی شان بھی رکھتا ہے، اُردو زبان میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ''خطبات مدراس'' قرآنیات سے متعلق مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ کے خطبات اور ماضی قریب کے اہل علم میں مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ کے ''خطبات بھاولپور'' اور ان کے بعد اسلام کے بین الاقوامی قانون پر ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ کے خطبات ایسے زندہ جاوید علمی وفکری نقوش ہیں، جن کی تابندگی کبھی کم نہیں ہوگی۔

ہمارے زمانے کے علماء ومفکرین میں حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی — **متعنا اللہ بطول حیاتھم** — کے خطبات بڑی وقعت، فکری گیرائی اور علمی گہرائی کے حامل ہوتے ہیں، خود جامعہ اسلامیہ بنجاری میں منعقد ہونے والے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے سیمینار میں انھوں نے جو کلیدی خطبہ دیا، آج بھی اس کی حلاوت محسوس کی جاتی ہے، اس طرح مختلف سیمیناروں میں آپ کے کلیدی خطبوں کو شوق کے کانوں سے سنا جاتا ہے اور دُور دُور تک اس کا چرچا ہوتا ہے، ضرورت تھی کہ مختلف موضوعات پر آپ کے پیش کئے ہوئے فکر انگیز، چشم کشا، حالات کے تجزیہ پر مبنی، زبان وبیان کی حلاوت سے آراستہ اِن پھولوں کا ایک گلدستہ مرتب ہوجائے، جس میں صاحب خطبات کی بالغ نظری کے ساتھ ساتھ اس کی داعیانہ دردمندی قارئین کے دماغ اور دل دونوں پر دستک دے رہی ہے۔

'المعہد العالی الاسلامی حیدر آباد' کی تربیت، رجال کار کی تیاری اور مردم سازی کا ایک ایسا مرکز ہے، جس کو پورے ملک میں اپنے اس کام کے اعتبار سے امتیازی شان حاصل ہے، اس اہم ادارہ کی طرف سے سیرت سیمینار کا انعقاد وقت کی ضرورت کے ادراک کی واضح دلیل ہے اور اس موقع سے حضرت والا نے ان گرانقدر خطبات کی اشاعت کی جو اجازت دی ہے، میں اس کے لئے اپنی طرف سے اور جامعہ اسلامیہ بنجاری کی طرف سے بے حد شکر گزار رہوں۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول کرے اور حضرت والا کا سایۂ عاطفت ملت اسلامیہ ہند پر تادیر قائم ودائم رکھے۔ آمین

ربیع الاول ۱۴۳۷ھ — محمد تصور حسین فلاحی

۳؍جنوری ۲۰۱۶ھ — (مہتمم: جامعہ اسلامیہ بنجاری اندور، ایم، پی)

● ● ●

پیش لفظ

اس حقیر کو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ملک و بیرونِ ملک مختلف اہم پروگراموں میں شرکت کا موقع ملتا رہتا ہے، زیادہ تر تو ان پروگراموں میں زبانی اظہارِ خیال پر اکتفا کرنے کی نوبت آتی ہے؛ مگر بعض پروگراموں میں تحریری خطبات پیش کرنے کی دعوت دی جاتی ہے، ان خطبات کی حیثیت صرف وقتی اظہارِ خیال کی نہیں ہوتی؛ بلکہ فکری، دعوتی، علمی اور اصلاحی نقطۂ نظر سے اس کی مستقل حیثیت ہوتی ہے۔

اسی نقطۂ نظر سے مختلف عزیزوں اور دوستوں کا تقاضا تھا کہ ان خطبات کو یکجا کر دیا جائے؛ چنانچہ سہ ماہی 'بحث ونظر' کے شمارہ نمبر: ۸۸-۸۹ کو اسی مجموعہ کی شکل شائع کیا گیا اور لوگوں نے اسے پسند بھی کیا؛ مگر یہ شمارہ کم پڑ گیا، بہت سے دوست، احباب اور خود المعہد العالی الاسلامی کے طلبہ وفضلاء مستقل کتابی شکل میں اس کی طباعت کے خواہاں تھے، اب جب کہ ۲۱-۲۳ / فروری ۲۰۱۶ء کو معہد میں بین الاقوامی سیرت سیمینار منعقد ہو رہا ہے، محبی فی اللہ جناب مولانا محمد تصور حسین فلاحی زیدت حسناتہ (مہتمم جامعہ اسلامیہ بخاری اندور، ایم، پی) نے اس کی طباعت کی ذمہ داری قبول کی اور وہ اسے اپنے مؤقر دار العلوم کی طرف سے شائع کر رہے ہیں، مولانا موصوف ایک بالغ نظر، دردمند اور داعیانہ مزاج کے حامی عالم دین ہیں، انھوں نے اپنے مشفق استاذ اور مربیٔ خاص حضرت مولانا سید ذو الفقار صاحبؒ (سابق شیخ الحدیث جامعہ فلاح دارین ترکیسر) کی سرپرستی میں جامعہ ہذا کی بنیاد رکھی اور بہت کم وقت میں یہ ادارہ ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے دورۂ حدیث شریف تک پہنچ گیا، اس وقت اس کا شمار مدھیہ پردیش کے چند اہم اور مرکزی مدارس میں ہوتا ہے اور دُور دُور تک اس کا فیض پہنچ رہا ہے۔

اس مجموعہ میں جو خطبات شامل ہیں، وہ متنوع موضوعات پر ہیں؛ لیکن کوشش کی گئی ہے کہ خطبہ جس موضوع پر ہو، اس سے متعلق غور وفکر کے اہم گوشوں کی طرف ضروری اشارہ ہو جائے ——

یہ خطبات زیادہ تر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے فکری، فقہی اور تربیتی اجتماعات کے لئے لکھے گئے ہیں، چند خطبات المعہد العالی الاسلامی کے زیر انتظام منعقد ہونے والے پروگراموں کی مناسبت سے بھی تحریر کئے گئے تھے، اور کچھ وہ بھی ہیں جو بیرونِ ملک کی بعض کانفرنسوں کے لئے تحریر کئے گئے ہیں، افسوس کہ ایک اہم خطبہ جو 'گلوبلائزیشن اور اسلام کی عالمگیریت' سے متعلق تھا اور جو 'مجمع التقریب بین المذاہب' کی دعوت پر تہران (ایران) میں پیش کیا گیا تھا، محفوظ نہیں رہ سکا۔

اس مجموعہ میں وہ فقہی یا اُصولی تحریریں بھی شامل نہیں ہیں، جو موقع بہ موقع کسی پروگرام کی مناسبت سے لکھی گئی ہیں، جیسے اسلام آباد یونیورسٹی میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں ''فقہ حنفی اور حدیث'' پر اور ایک اور کانفرنس میں ''اجتماعی اجتہاد اور عصر حاضر میں اس کے طریقۂ کار'' پر، یا بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کوالالمپور (ملیشیاء) میں پرسنل لا سے متعلق ''قانون شریعت اور قانون ملکی کے درمیان ہم آہنگی کی صورت'' کے عنوان پر، یا وہ مقالات جو خالص فقہی موضوع پر رابطہ عالم اسلامی یا اس کے تحت قائم مجمع الفقہ الاسلامی وغیرہ میں پیش کئے گئے ہیں، کوشش کی جائے گی کہ ان مقالات کا مجموعہ الگ سے شائع ہو، وباللہ التوفیق۔

قارئین کو ان خطبات تک رسائی کے سلسلے میں ان اداروں کا شکر گذار ہونا چاہئے، جن کی دعوت پر یہ خطبات لکھے گئے ہیں اور خاص طور پر محبی مولانا محمد تصور حسین فلاحی (**بارک اللہ فی علومہ وجھودہ**) اور جامعہ اسلامیہ بنجاری کا، اللہ تعالیٰ ان سب اداروں کو اور ان کے بانیوں اور ذمہ داروں کو بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے، **وباللہ التوفیق وھو المستعان**۔

۲۲/ربیع الاول ۱۴۳۷ھ — **خالد سیف اللہ رحمانی**

۳/جنوری ۲۰۱۶ھ — (خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

● ● ●

قرآن مجید — ہدایت کی کلید ☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام علىٰ سيد الأنبياء والمرسلين وعلى آله وأصحابه أجمعين ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أما بعد !

صدر عالی قدر، بزرگان محترم، برادران اسلام! آج کے اس اجتماع کو دیکھ کر اور آپ حضرات کی میزبانی کی سعادت پا کر شکر و سپاس کے جذبات کی لہریں کچھ اس طرح موجزن ہیں کہ انھیں الفاظ کے پیکر میں ڈھالنا دشوار ہو رہا ہے، یہ رسمی الفاظ نہیں ہیں؛ بلکہ یہ دل کی آواز ہے، اللہ تعالیٰ آپ حضرات کی زحمت فرمائی کو قبول فرمائے اور اس اجتماع کو اسلام کی سربلندی اور امت کی سرفرازی کا ذریعہ بنائے۔

حضرات ! انسان خود پیدا نہیں ہوا ہے؛ بلکہ وہ پیدا کیا گیا ہے، اسے جس دنیا میں بسایا گیا ہے، وہ اس دنیا ہی سے نہیں ؛ بلکہ اپنے آپ سے بھی پوری طرح واقف نہیں ہے، وہ اپنے نفع ونقصان سے بھی آگاہ نہیں ہے، وہ اپنی منزل کے بارے میں بھی نہیں جانتا کہ آخر اس دنیا کی آبلہ پائی کر کے اسے کہاں پہنچنا ہے، اور موت کے بعد اس کی خوابگاہ کہاں ہے، اسے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے؟ — ان ساری باتوں کے جاننے کے لئے وہ کسی ایسی ہستی کا محتاج ہے، جس کا علم انسان اور اس کے گرد پھیلی ہوئی کائنات کو محیط ہو، جو انسان کا خیر خواہ اور اس سے محبت رکھنے والی ہو اور جو پوری انسانیت ؛ بلکہ تمام مخلوقات کے ساتھ عدل وانصاف کا برتاؤ کر سکتی ہو۔

وہ ذات ہے خالق کائنات کی ؛ کیوں کہ کسی شئے کی تخلیق کرنے والے سے بڑھ کر اس شئے کی حقیقت اور اس کے نفع ونقصان سے کوئی اور ذات واقف نہیں ہو سکتی ؛ اس لئے اسی کی رہنمائی میں انسان اپنا سفر کامیابی کے ساتھ طے کر سکتا ہے ؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''**أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ**'' (**الأعراف: ۵۴**) یعنی خدا ہی نے انسانیت کی تخلیق کی ہے اور اسی کا حکم انسانیت پر چلنے کے

☆ المعہد العالی الاسلامی کے بین الاقوامی قرآن مجید سیمینار، منعقدہ ۵ تا ۸ رفروری ۲۰۱۱ء کو کلیدی خطبہ پیش کیا گیا۔

لائق ہے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے جیسے کائنات میں انسان کی مادی ضرورتوں کا انتظام کیا ہے، اس کی روحانی ضرورتوں کی تکمیل کا بھی خیال رکھا ہے، اس کو کائنات کے اسباب ووسائل سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ بھی سکھایا گیا ہے اور زندگی گذارنے کے سلسلہ میں بھی اس کی رہنمائی کی گئی ہے، اس رہنمائی کے لئے خدا نے ایک طرف اپنی کتابیں اتاریں، دوسری طرف انسانوں ہی میں اپنے پیغمبر بھیجے؛ کیوں کہ انسان کے لئے انسان ہی نمونۂ عمل بن سکتا ہے، اگر خدا خود انسانی شکل میں آجاتا، جیسا کہ اوتار واد کا تصور ہے تو وہ انسان کے لئے قابل پیروی نہیں بن پاتا؛ کیوں کہ وہ ان خواہشات سے عاری اور ان ضروریات سے فارغ ہوتا، جو انسان کے لوازم میں سے ہیں، ہدایت کے یہی دو چراغ ہیں، جن کی روشنی انسان کو صراط مستقیم پر قائم رکھتی ہے، اس ہدایت ربانی کی ضرورت انسان کو اس لئے بھی ہے کہ وہ اپنی مصلحتوں کے مقابلہ اپنی خواہشات سے شکست کھا جاتا ہے، وہ جن چیزوں کے بارے میں جانتا ہے کہ یہ اس کو نقصان پہنچانے والی ہیں، غلبۂ خواہشات کی وجہ سے ان کا بھی ارتکاب کرنے پر اتر آتا ہے، خدا پر ایمان ،حرام وحلال کی پہچان، آخرت کی جواب دہی کا احساس اور اپنی بے ثباتی کا یقین ہی وہ حقیقتیں ہیں، جو خواہشات کی غلامی سے بچنے میں مُمد ومعاون ہوتی ہیں۔

اپنے اپنے عہد میں جتنی آسمانی کتابیں آئی ہیں اور انسانیت کے لئے جو ہدایت نامے بھیجے گئے ہیں، ان سب کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات والا صفات ہے، اس کے باوجود کہ انسان کی آمیزش پسندی نے قرآن مجید کے علاوہ کسی الہامی کتاب کو مکمل طور پر محفوظ نہیں رہنے دیا، خدا کا یقین، جزا وسزا کا تصور، کچھ کاموں کا باعث اجر ہونا اور کچھ کا سبب مؤاخذہ ہونا تمام مذہبی کتابوں کی مشترکہ تعلیمات ہیں، ان کے علاوہ بھی بہت سی اخلاقی قدریں مذاہب کے درمیان متفق علیہ ہیں، افسوس کہ اس وقت مغرب کے افق سے جو تمدن طلوع ہو رہا ہے، اس کا بنیادی مزاج یہ ہے کہ انسان خدا کے تصور سے آزاد ہوجائے یا برائے نام چھٹی انگلی کی طرح خدا کا اور مذہب کا نام لے، حلال وحرام کی سرحدیں ختم ہوجائیں، لذت پرستی اور خواہشات کی حکمرانی میں کوئی چیز رکاوٹ ڈالنے والی نہ ہو؛ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ آج مغرب اور مغرب زدہ دنیا میں شراب اور پانی میں کوئی فرق نہیں، جائز رشتے بوجھ بن گئے ہیں اور غیر قانونی تعلق فیشن بن گیا ہے، شرم وحیا فرسودہ چیز سمجھی جانے لگی ہے، اور ایسے عالمی نظام کی بنیاد رکھی جارہی ہے، جس میں مذہب کا کہیں گذر نہ ہو اور انسانی زندگی میں اس کو دخل دینے کی بالکل اجازت نہ ہو۔

یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس وقت قریب قریب دنیا کے تمام مذاہب نے اس طوفان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور اپنی مذہبی کتابوں سے ان کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے، دنیا میں اس وقت مسلمان ہی ایک ایسی امت ہیں، جنھوں نے ہزار کوتاہیوں کے باوجود اپنی مذہبی کتاب سے اپنا رشتہ باقی رکھا ہے، وہ چاہے مسجد کی چہار دیواری میں ہو یا مدرسہ و خانقاہ کے احاطہ میں، تجارت کی منڈی میں ہو یا انصاف کی کرسی پر، تخت اقتدار پر ہو یا تختۂ دار پر، مسلمانوں کی بڑی تعداد ہر حال میں اور ہر جگہ اپنے علماء سے حکم شرعی دریافت کرتی ہے اور حلال وحرام کی حدوں کو جاننا اور بہ حد امکان ان پر عمل کرنا چاہتی ہے، یہی وہ بات ہے جس نے مغرب کے میخانۂ الحاد کو امت مسلمہ کے خلاف کھڑا کر دیا ہے کہ مسلمان اس حمام میں آنے کو کیوں تیار نہیں ہیں، جس میں ساری دنیا بے لباس ہو کر آچکی ہے اور یہ اُمت ابھی تک کیوں حلال وحرام اور اخلاق وحیا کے فرسودہ خیالات کی اسیر ہے، اسی باعث مسلمانوں کو بنیاد پرستی، قدامت پسندی اور دقیانوسیت وغیرہ کے طعنے بھی دئے جاتے ہیں؛ لیکن بحمد اللہ مسلمانوں کو خدا اور رسول کی محبت میں طعن وطنز اور سب وشتم کے یہ کانٹے بھی پھول نظر آتے ہیں کہ :

گلہ نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے
نگاہ یار سلامت ہزار میخانے

چنانچہ اس وقت دنیا میں قرآن مجید سے عداوت وعناد کی جو لہر پیدا کی جارہی ہے، جس کا ظہور کبھی قرآن مجید کو جلانے کی شکل میں ہوتا ہے، کبھی حامل قرآن مجید کے کارٹون بنا کر اور کبھی قرآن مجید کے خلاف زہر آلود لٹریچر اور پروپیگنڈے پر مبنی ابلاغی کوششوں کے ذریعہ، ان کا اصل ہدف صرف قرآن دشمنی نہیں ہے ؛ بلکہ خدا بیزاری اور مذہب اور اخلاقی قدروں سے مکمل طور پر آزاد ہوجانے کا جذبہ ہے، —— اسی پس منظر میں قرآن مجید کے موضوع پر یہ سیمینار منعقد کیا جارہا ہے۔

حضرات ! اس کائنات کا ایک فطری نظام یہ ہے کہ جو چیز انسانیت کے لئے مفید اور نافع ہوتی ہے، دست قدرت خود اس کی حفاظت کرتا ہے، قرآن مجید نے اس اُصول کو اِن الفاظ میں بیان کیا ہے :

فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَ أَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ
فِي الْأَرْضِ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ ۔ (الرعد:۱۷)

کائنات کی تمام چیزوں میں فطرت کا یہی نظام جاری وساری ہے؛ یہاں تک کہ یہ انسان جو

اس دنیائے بے ثبات کی سب سے قیمتی شئے ہے، وہ بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں، جب انسان کی صلاحتیں اپنے عروج پر پہنچ کر زوال کی طرف سفر کرتی ہیں تو پھر فرشتۂ غیب اس کو پردۂ ہستی سے ہٹادیتا ہے اور انسان کے قریب ترین اعزہ واقارب بھی اسے زیادہ دیر اپنے پاس رکھنے کو تیار نہیں ہوتے؛ کیوں کہ اب اس سے اس دنیا کا کوئی مفاد متعلق نہیں رہا۔

خدا کا یہی نظام مذہبی کتابوں کے سلسلہ میں بھی رہا ہے، جن کتابوں سے اب انسانیت کی ہدایت اور اس کا روحانی نفع متعلق نہیں ہے، وہ محفوظ نہیں رہیں، بعض کتابیں وہ ہیں، جن کو اہل مذہب الہامی کتاب کہتے ہیں؛ لیکن یہ کتاب کس شخصیت پر الہام ہوئی، وہ اس کو بھی بتانے سے قاصر ہیں اور ان کے پاس اس کی کوئی سند موجود نہیں ہے، محمد رسول اللہ ﷺ سے قریب ترین عہد میں جو کتابیں نازل کی گئیں، ان کا بھی حال یہ ہے کہ وہ اپنی اصل زبان میں موجود نہیں ہیں؛ بلکہ ترجمہ در ترجمہ کی شکل میں ہیں، نہ ان کی کوئی سند ہے اور نہ ان کے جمع وتدوین کی کوئی تاریخ؛ بلکہ اب تک اصلاح کے نام پر ان کی تعبیرات میں تبدیلیاں کی جاتی رہتی ہیں، قرآن مجید سے چوں کہ انسانیت کی ہدایت متعلق ہے اور اب قیامت تک کوئی اور کتاب آنے والی نہیں ہے؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے: ''**إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُون**''۔ (الحجر:۹)

قرآن مجید کی حفاظت کا یہ وعدہ اس شان سے پورا ہوا ہے کہ نہ صرف اس کے الفاظ کی حفاظت کی گئی؛ بلکہ اس کے طرز ادائیگی اور منہج تلاوت کی بھی حفاظت کی گئی اور اس کے لئے مستقل طور پر فن تجوید وقرأت وجود میں آیا، قرآن مجید کے رسم الخط کی بھی حفاظت کی گئی؛ چنانچہ آج بھی رسم عثمانی کے مطابق قرآن کی کتابت ہوتی ہے اور علماء نے اس سے انحراف کرنے سے منع کیا ہے، قرآن مجید کے معانی کی بھی حفاظت کی گئی؛ چنانچہ محدثین نے رسول اللہ ﷺ کی تشریحات کو محفوظ کرکے اور فقہاء نے درست مفاہیم مستنبط کرکے تحریف معنوی کا راستہ بند کردیا؛ حالاں کہ تاریخ میں بعض ایسے گروہ پیدا ہوتے رہے ہیں، جنھوں نے قرآن میں معنوی تحریف کی کوشش کی ہے اور اپنے ذاتی خیالات کو قرآن میں سمونا چاہا ہے؛ لیکن امت میں کبھی ایسے افکار کو پذیرائی حاصل نہیں ہوسکی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس زبان اور بیان کے اس اسلوب کو بھی محفوظ رکھا، جس میں قرآن مجید نازل کیا گیا ہے، پندرہ سو سال سے کم عرصہ میں زبانیں اس قدر بدل جاتی ہیں کہ قدیم زبان کی جگہ گویا ایک نئی زبان پیدا ہوجاتی ہے؛ لیکن اس کے باوجود کہ طویل عرصہ سے عربی زبان، سائنس اور ٹیکنالوجی کی زبان

نہیں ہے اور نہ اس سے لوگوں کے معاشی مفادات متعلق تھے، پھر بھی معجزاتی طور پر نہ صرف یہ زبان محفوظ ہے؛ بلکہ اس کے ادب کا وہی معیار آج تک قائم ہے، جو نزول قرآن کے زمانہ میں تھا، اللہ تعالیٰ نے ان مقامات کی بھی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، جہاں قرآن مجید نازل کیا گیا ہے، یعنی حرمین شریفین کہ انشاء اللہ دجال کے فتنے سے بھی ان کی حفاظت ہوگی اور اللہ نے اس امت کی بھی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے جو قرآن مجید کی حامل ہے؛ چنانچہ حضور ﷺ کی پیشین گوئی ہے کہ اس امت پر اجتماعی عذاب نازل نہ ہوگا، جیسا کہ پچھلی بعض قوموں پر نازل ہو چکا ہے، قرآن مجید کی اس طرح غیر معمولی طور پر حفاظت کا غیبی انتظام دراصل اسی بنیاد پر ہے کہ اب قیامت تک انسانیت کی ہدایت اور اس کی فلاح وکامیابی قرآن مجید سے مربوط ہے۔

حضرات ! قرآن مجید کا اصل مقصد ہدایت ہی ہے؛ اسی لئے اس میں بار بار یاد دلایا گیا ہے کہ ''وہ کتاب ہدایت ہے، متقیوں کے لئے'' (البقرۃ:۲) ''وہ ہدایت ہے تمام انسانیت کے لئے'' (البقرۃ: ۱۸۵) وہ سب سے زیادہ درست اور سیدھے راستے کی رہنمائی کرتا ہے، (الاسراء: ۹) اسی ہدایت کا ایک پہلو یہ ہے کہ جو لوگ قرآن مجید پر ایمان نہیں رکھتے ہیں، وہ بھی قرآن کے بعض احکام کو قبول کرنے پر مجبور ہیں، دنیا کے اکثر مذاہب میں طلاق کا تصور نہیں تھا؛ لیکن طلاق بعض دفعہ ایک ضرورت بن جاتی ہے، جیسے باتھ روم ایک ناپسندیدہ جگہ ہے، جہاں انسان ضرورت سے زیادہ وقت گذارنا نہیں چاہتا؛ لیکن وہ گھر نامکمل ہے، جہاں انسان کی اس ضرورت کو پورا کرنے کا انتظام نہ ہو، اسی طرح طلاق ایک ناپسندیدہ شئے ہے؛ لیکن وہ خاندانی نظام ناقص و ناتمام ہے جس میں نفرت کا شعلہ بھڑک جانے کے بعد رشتۂ نکاح کو ختم کرنے کی گنجائش نہ ہو، اسی طرح عورتوں کو میراث میں حق نہیں ملتا تھا، قرآن نے ماں، بیٹی اور بیوی کو لازماً وارث قرار دیا اور بعض صورتوں میں دوسری خاتون رشتہ داروں کو بھی، (النساء: ۱۲-۱۱) لڑکیوں کو خود اپنے لئے رشتہ کے انتخاب کا حق نہیں تھا، قرآن نے ان کو اس کا حق دیا: ''فَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ اَنۡ يَّنۡكِحۡنَ اَزۡوَاجَهُنَّ'' (البقرۃ: ۲۳۲) قرآن مجید کے ایسے بہت سے احکام ہیں جن کو آج پوری دنیا نے قبول کیا ہے، غرض کہ قرآن صرف آخرت کی فلاح ونجات ہی کے لحاظ سے ہادی نہیں ہے؛ بلکہ وہ خوشگوار، پُرسکون اور بہتر دنیوی زندگی کے لئے بھی ہادی ورہبر ہے۔

بزرگانِ محترم ! یہ سوال بار بار اٹھایا جاتا ہے کہ قرآن مجید اس دور میں اتارا گیا ہے،

جب انسان ترقی کی ابتدائی حالت میں تھا، جب انسان اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنی منزلیں طے کرتا تھا، جب انسانیت آج کی سہولتوں سے محروم تھی، اور آج صورت حال یہ ہے کہ انسان ہوا کے دوش پر اڑتا ہے، اس نے سمندر کی گہرائیوں کو فتح کر لیا ہے، وہ ایک لمحہ میں اپنی آواز مشرق سے مغرب تک پہنچا سکتا ہے اور دنیا کے ایک کونے میں بیٹھ کر دوسرے کونے کے مناظر کو دیکھ سکتا ہے، اس دور کے لئے وہ کتاب کیسے کافی ہو سکتی ہے جو تمدن سے محروم بدوی دور میں نازل کی گئی؟ بظاہر یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے اور بعض اوقات نئی نسل کے دلوں میں شکوک وشبہات کے کانٹے بونے کا باعث بھی بنتی ہے؛ لیکن حقیقت میں یہ محض ایک مغالطہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ترقی ہوئی ہے، ان کا تعلق وسائل سے ہے، انسان کی فطرت اور اس کی بنیادی ضرورتوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، اپنی منزل تک جلد پہنچنے کی خواہش انسان کے اندر پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے، پہلے انسان اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے اونٹوں اور گھوڑوں کا سہارا لیتا تھا، اور اب موٹر، بس، ٹرین اور جہاز کا سہارا لیتا ہے، انسان پہلے بھی بیماریوں سے شفا کا طلب گار تھا اور جڑی بوٹیوں سے استفادہ کرتا تھا، اب بھی وہ صحت وعلاج کے لئے بے قرار رہتا ہے اور آج جو وسائل میسر ہیں، ان سے استفادہ کرتا ہے، کل بھی سچائی کو پسند کیا جاتا تھا، دھوکہ اور جھوٹ کو لوگ ناپسند کرتے تھے، آج بھی سلیم الفطرت انسان کی پسند وناپسند یہی ہے۔

قرآن مجید اصل میں وسائل کو نہیں؛ بلکہ انسان کے فطری جذبات اور برتاؤ کو اپنا موضوع بناتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ کن وسائل کو کس طرح استعمال کیا جائے؟ اگر آپ کے پاس تیز رفتار سواری ہے تو آپ اسے خیر کے کاموں میں استعمال کریں نہ کہ شر کے، اگر آپ کو جدید اور تیز رفتار ذرائع ابلاغ میسر ہیں تو آپ کی طرف سے ان کا استعمال خیر کی اشاعت اور بُرائی کو روکنے میں ہو، اگر آپ نے دفاعی قوت حاصل کی ہے تو اس کا استعمال ظلم کے مقابلہ کے لئے ہو نہ کہ ظلم کرنے کے لئے، غرض کہ قرآن کی تعلیمات کا تعلق اصل میں وسائل کے استعمال سے ہے نہ کہ وسائل کی پیدائش سے؛ اس لئے سائنس جس قدر ترقی کرتی جائے گی، ایجادات واختراعات جس قدر بڑھتی جائیں گی اور وسائل میں جس قدر اضافہ ہوتا جائے گا، قرآن کی ہدایت اور اس کی رہنمائی کی ضرورت بھی بڑھتی جائے گی؛ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ موجودہ ترقیات نے قرآن مجید کی رہنمائی کی ضرورت کو کم نہیں کیا ہے؛ بلکہ بڑھا دیا ہے۔

حضرات ! اس سیمینار کے لئے ایسے عناوین منتخب کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو عصر حاضر کے تناظر میں اہمیت کے حامل ہیں، جن سے انشاء اللہ قرآنی تعلیمات کی آفاقیت، انسانی ضرورت ومصلحت سے ہم آہنگی، فطرت سے موافقت اور عقل وتجربہ کی روشنی میں واقعیت وحقانیت کی وضاحت ہوگی، نیز دعوتی کام کرنے والوں کو بہتر مواد فراہم ہوگا؛ تاکہ ان کی دعوت شعور وآگہی اور بصیرت پر مبنی ہو، نیز اس کے علاوہ قرآن کی تدریس کو مؤثر بنانے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک قرآن کو پہنچانے کے مفید طریقوں کی بھی رہنمائی ہوگی، اللہ تعالیٰ اس اجتماع کو ان مقاصد کے حاصل ہونے کا ذریعہ بنائے!

حضرات ! ہمارے لئے خوشی کی بات ہے کہ اس وقت ہندوستان کا ایک تاریخی شہر حیدرآباد جس کا تاریخی نام ''فرخندہ بنیاد'' ہے، آپ کے لئے دل کی آنکھیں بچھائے ہوئے ہے، اس شہر کی بنیاد ۹۹۹ھ مطابق ۱۵۹۰ء میں محمد قلی قطب شاہ جیسے عابد شب بیدار بادشاہ نے رکھی، اور خود اسے یہ شہر ایسا بھایا کہ اس نے شعر میں اپنے ہی بنائے اور بسائے ہوئے شہر کو داد دی کہ :

لطیف و دل کشا آب و ہوائے
مبارک منزلے فرخندہ جائے

یہ شہر اور دکن کا پورا خطہ ابتدائی دور ہی سے علم وادب کا مرکز رہا ہے، اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ولی دکنی اور اردو کی پہلی نثر ''معراج العاشقین'' جو خواجہ گیسودراز کی طرف منسوب ہے، دونوں کا تعلق دکن سے تھا، اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ اردو کی جائے پیدائش اور جائے پرورش ہے، زمانہ قدیم کے علاوہ ماضیٔ قریب میں بھی اس شہر میں بڑی اہم شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں، جامعہ نظامیہ کے بانی فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ شاہ فاروقی، محدث دکن مولانا عبد اللہ شاہ، تحریک اسلامی کے مؤسس مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا حسام الدین فاضل، نواب وحید الزماں حیدرآبادی (مترجم کتب حدیث) اور میدان تحقیق کے درآبدار اور نادرۂ روزگار ڈاکٹر محمد حمید اللہ اسی شہر سے تعلق رکھتے ہیں، اسی طرح امجد حیدرآبادی جیسے رباعی گو اور اخلاقیات کے شاعر، مخدوم محی الدین جیسے باغیانہ شاعری کے سپہ سالار اور جدید لب ولہجہ کے شعراء شاذ تمکنت اور اوج یعقوبی کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا، حال حال کی شخصیتوں میں مجلس تعمیر ملت کے بانی سید خلیل اللہ حسینی، بلند پایہ واعظ ومصلح اور عالم حضرت مولانا محمد حمید الدین حسامی عاقلؒ اور بالغ نظر حوصلہ مند معروف قائد سلطان صلاح الدین اویسی یہیں

پیدا ہوئے اور یہیں سے ان کی کوششیں پورے ہندوستان تک پہنچیں، گذشتہ ایک دہے میں یہ شہر جن اہم علمی و دینی ہستیوں سے محروم ہوا ہے، ان میں معروف صاحبِ قلم مولانا محمد رضوان القاسمی، مولانا سید اکبرالدین قاسمی اور محترم دوست جناب قاری محمد تقی الدین صاحب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

شہر کی بنیاد بھی ایک ایسے بادشاہ نے رکھی جو سلطان ہونے کے باوجود درویش تھا، اور اس شہر میں اسلام کی دعوت واشاعت کا کام بھی ایک صاحب نسبت بزرگ بابا شرف الدینؒ عراقی سے ہوا ہے، جو براہ راست شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مجاز تھے، یہ عراق سے شمالی ہندوستان اور وہاں سے دکن تشریف لائے، ۶۸۷ھ میں آپ کی وفات ہوئی، آپ کی قبر شہر کے ایک کنارے یہاں سے قریب ایک پہاڑی پر موجود ہے، جو بابا شرف الدین کی پہاڑی کہلاتی ہے، آپ کے ساتھ آپ کے بھائی بابا شہاب الدین بھی تشریف لائے تھے، جنھوں نے اس علاقہ میں بڑا دعوتی کام کیا اور بابا شرف الدین کے چار سال بعد وفات پائی، اس علم پرور شہر میں بہت سے علماء یمن، افغانستان اور شمالی ہند کے علاقوں سے آکر بھی خیمہ زن ہوئے ہیں، مولانا حافظ محمد احمد دیوبندی، مولانا سید مناظر حسن گیلانی، مولانا سید عبدالباری ندوی، مولانا فضل اللہ جیلانی، پروفیسر الیاس برنی، مولانا عبدالقدیر بدایونی، مولانا ابوالوفاء افغانی وغیرہ ان ہی علماء میں ہیں، یہیں ان کی مسند فیض بچھی اور یہیں سے ان کے علم کی روشنی پوری دنیا میں پہنچی، ان کے علاوہ یہ شہر مولانا حبیب الرحمن شیروانی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور ماہر القادری نیز جوش ملیح آبادی جیسے علماء وادباء کا بھی میزبان رہا ہے۔

یہ شہر تحریکوں اور اداروں کا بھی مرکز رہا ہے، خاص کر جامعہ نظامیہ ہندوستان کی قدیم دینی درسگاہوں میں سے ایک ہے، جس کے فیض یافتگان ہندوستان کے علاوہ بیرون ملک میں بھی بکثرت موجود ہیں، دوسرا اہم بلکہ اپنی نوعیت کا منفرد اور پورے ملک کے لئے مایہ افتخار ادارہ ''دائرۃ المعارف العثمانیہ'' ہے، حدیث ورجال، فقہ وتاریخ، طب ولغت اور تفسیر کے بہت سے مخطوطات پہلی بار دائرہ سے شائع ہوئے، شیخ علی متقی کی ''کنز العمال''، علامہ سمعانی کی ''کتاب الأنساب''، امام محمد بن حسن الشیبانی کی ''کتاب الأصل''، علامہ ذہبی کی ''تذکرۃ الحفاظ'' اور نہ جانے کیسے کیسے علمی ذخیرے ہیں، جو دائرۃ المعارف کے واسطے سے اہل علم کی آنکھوں کا سرمہ بنے اور اس کے ذریعہ یہ علمی امانتیں مخطوطات کے دفینوں سے مطبوعات کے سفینوں تک پہنچیں، جب کہ اس وقت عربی کتابوں کی

طباعت آسان نہیں تھی۔

جب ذکر اداروں کا آیا ہے تو دو 'مرحوم' اداروں کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی، ایک دار الترجمہ کا جسے آصف جاہی حکومت نے قائم کیا، اور جس نے مشرق ومغرب کے لعل وگہر کو اردو کا جامہ پہنایا، نیز اُردو اصطلاحات کو وضع کرنے کا نہایت اہم کام انجام دیا، جس کا فائدہ اب بھی پڑوسی ملک کو پہنچ رہا ہے، دوسرا ''احیاء المعارف النعمانیہ'' ہے، ممتاز فقیہ اور صاحب نظر عالم مولانا ابو الوفاء افغانی نے جس کی بنیاد رکھی، یہیں سے امام ابو یوسف اور امام محمد کی ''کتاب الآثار'' شائع ہوئی، امام محمد کی ''جامع کبیر'' طبع ہوئی، سرخسی کی شرح السیر الکبیر اور شرح الزیادات طبع ہوئی، زیادات الزیادات کی طباعت عمل میں آئی، غرض کہ فقہ حنفی کی بنیادی کتابیں جو اہل علم کی نظر سے اب تک مخفی تھیں، اسی ادارہ کے ذریعہ اہل ذوق کے ہاتھوں تک پہنچیں۔

١٩٤٨ء میں ایک ایسا طوفان آیا کہ اگر آسمان اس پر خون کے آنسو برساتا تب بھی بجا ہوتا، لگتا تھا کہ اس خطہ سے ہر وہ علامت مٹادی جائے گی، جس کی نسبت اسلام اور مسلمانوں سے ہو؛ لیکن اسلام کا نشہ ایسا نشہ نہیں ہے، جسے ظلم وجور کی آندھیاں اُڑا لے جائیں؛ چنانچہ طوفان آیا اور گذر گیا، اس موقع سے شہداء حق نے جو اپنے لہو نچوڑ نچوڑ کر سرزمین دکن کو آبیار کیا، اسی کی آغوش سے ایک نیا سورج طلوع ہوا، دین پر استقامت کا سورج، علم کا سورج، حوصلہ وہمت کا سورج؛ چنانچہ آج یہ شہر دینی تعلیم، عصری تعلیم، دعوتِ دین اور خدمتِ خلق کے اداروں، اور ان اداروں کے تحت ہونے والی کوششوں، نیز مسلمانوں کی سیاسی قوت کے اعتبار سے ایک مثالی شہر بن چکا ہے، شاید یہ اس شہر کے بانی قلی قطب شاہ کی دعاء دردمندانہ کا اثر ہے، جنہوں نے کہا تھا :

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر

اس حقیقت کا عرض کرنا مناسب ہوگا کہ قرآن مجید کی خدمت میں بھی دکن اور حیدر آباد کا نمایاں حصہ رہا ہے، بابائے اردو مولوی عبد الحق صاحب کی تحقیق کے مطابق شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی سے بھی کافی پہلے دکنی اردو میں قرآن مجید کا ترجمہ ہوا ہے، ان کا اندازہ ہے کہ یہ ترجمہ دسویں صدی کے اوائل کا ہے، جب کہ شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبد القادر صاحب کے ترجمے تیرہویں صدی کے آغاز کے ہیں، ان ہی کے تحقیق کے مطابق ''تنزیل'' کے نام سے قرآن مجید کی ایک قدیم تفسیر ملتی ہے، جو ١١٤٧ھ کی تالیف ہے، اور مصنف کا نام سید بابا قادری ہے، یہ تفسیر اگرچہ خالص دکنی

زبان میں نہیں ہے؛لیکن اس میں دکنی الفاظ بھی موجود ہیں جس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مصنف دکن کے رہیں ہوں گے، اور تفسیر اردو میں لکھی ہوگی ؛لیکن اپنی مادری زبان کے الفاظ بے ساختہ قلم پر آگئے ہوں گے،''دائرۃ المعارف العثمانیہ'' نے قرآن سے متعلق متعدد کتابیں شائع کی ہیں،جن میں سرفہرست امام برہان الدین ابراہیم بن عمر بقاعی (متوفی:۸۸۵ھ) کی ''نظم الدرر'' ہے،جو بائیس جلدوں پر مشتمل ہے، یہ کتاب یوں تو قرآن مجید کی ایک مکمل تفسیر ہے؛لیکن ربط آیات وربط سور کے سلسلہ میں منفرد نوعیت کی حامل کتاب ہے،جس پر دائرہ کے فاضل مصحح مولانا محمد عمران اعظمی نے بڑی محنت سے تحقیق وتعلیق کا کام کیا ہے،''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کی شرح میں علامہ عبدالکریم ہروی کی ''الکہف والرقیم'' ایک فاضلانہ تالیف ہے،سورہ فاتحہ کی مبسوط تفسیر''اعجاز البیان فی تأویل الفرقان'' بھی پہلی بار یہیں سے شائع ہوئی،جو مشہور صوفی محی الدین ابن عربی کے شاگرد علامہ محمد بن اسحاق صدرالدین قونوی (متوفی:۶۷۲ھ) کی تالیف ہے،قرآن مجید کے مفردات اور وجوہ ونظائر پر علامہ جمال الدین ابوالفرج بن جوزی کی''**نزهة الأعين النواظر في علم الوجوه والنظائر**'' یہیں سے شائع ہوئی ہے،قرآن اور حدیث کے مفردات پر مشترک کتاب'' **الغريبين**'' (تالیف:علامہ ابوعمر ہروی،متوفی:۴۰۱ھ) پہلی بار یہیں سے شائع ہوئی ہے۔

جامعہ نظامیہ — جو جنوبی ہند کی ممتاز اور بافیض دینی درسگاہ ہے — سے تعلق رکھنے والے بزرگوں نے بھی قرآن مجید کی خدمت میں اپنا حصہ ادا کیا ہے،بانی جامعہ حضرت مولانا شاہ انوار اللہ فاروقیؒ کی گراں قدر تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو قرآنیات کا خاص ذوق تھا؛چنانچہ آپ کے قرآنی افادات کو جامعہ کے ایک فاضل نے''تفسیرات انوار'' کے نام سے شائع کیا ہے،جامعہ کی ایک قابل قدر ہستی مولانا محمد شطاری نے قرآن مجید کی قسموں پر،حروف مقطعات پر،قرآن مجید کی پیشین گوئیوں پر،اور سورہ عصر کی تفسیر پر مختلف مختصر ومبسوط کتابیں تصنیف فرمائی ہیں،اسی طرح مولانا محمد شاہ عمر حسینی اور ان کے صاحبزادہ گرامی معروف فاضل مولانا سید محمد بادشاہ حسینی قادری نے مل کر پورے قرآن مجید کی تفسیر فرمائی،جس کا نام''تفسیر قادری'' ہے،اور تاریخی نام''کشف القلوب'' ہے، حیدرآباد میں قرآن مجید کی قابل ذکر خدمات میں،ایک مولانا قاری محمد عبدالباری صاحب کا ترجمۂ قرآن مع مختصر حواشی ہے،جو عوام کے لئے نہایت سہل زبان میں کیا گیا ہے،ماضی قریب میں''قصص قرآن'' پر مولانا عبدالرحمٰن مظاہری کی دو جلدوں میں''ہدایت کے چراغ'' بھی ایک بہتر تالیف ہے۔

مغربی زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمہ کی خدمت میں بھی حیدرآباد کا نمایاں حصہ رہا ہے، مارماڈیوک پکتھال —— جن کا انگریزی ترجمہ مقبول خاص وعام ہے —— نے حیدرآباد ہی میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور یہیں کے تعاون سے مصر جاکر اس کی تصحیح کی، انگریزی زبان میں قرآن مجید کا ایک اور ترجمہ ڈاکٹر سید عبداللطیف کا ہے، ان کا بھی تعلق حیدرآباد ہی سے تھا، انگریزی کا ایک آسان ترجمہ ڈاکٹر انیس الدین صاحب مرحوم نے کچھ ہی عرصہ پہلے کیا ہے، جس میں سائنسی حقائق کو واضح کرنے پر خصوصی توجہ دی گئی ہے، انگریزی ترجموں کے سلسلہ میں عماد الملک سید حسین بلگرامی کا ذکر بھی مناسب ہوگا، جنھوں نے ابتداء سے سورۂ طٰہٰ کے ختم تک قرآن پاک کا ترجمہ کیا، مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کے ترجمہ پر خوب داددی ہے، یہ ترجمہ حیدرآباد میں ہوا، اور نظام ہفتم کے خصوصی تعاون سے ہوا، فرنچ زبان میں ترجمہ قرآن کی خدمت مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے کی اور عرصہ تک پیرس میں مقیم رہے، اور سیکڑوں لوگوں کو ان کے ذریعہ ہدایت حاصل ہوئی، اس کے علاوہ میر عثمان علی خان نظام ہفتم نے مرہٹی، گجراتی، تمل اور گورمکھی ترجموں کی تیاری اور اشاعت میں بھی تعاون کیا ہے، ڈاکٹر سید داؤد اشرف نے آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے حوالہ سے اس کی تفصیل نقل کی ہے۔

ترجمہ وتفسیر کے علاوہ تجوید کے سلسلہ میں یہ شہر طویل عرصہ سے اعلیٰ ذوق کا حامل رہا ہے، اس سلسلہ میں قاری محمد کلیم اللہ حسینی مرحوم کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس شہر سے تعلق رکھنے والے کئی قراء حضرات کو قرأت کے سلسلہ میں بین الاقوامی ایوارڈ مل چکا ہے، غرض کہ قرآن مجید کی خدمت میں حیدرآباد کا بھی قابل ذکر حصہ رہا ہے۔

''المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد'' جس کے زیر اہتمام یہ سیمینار منعقد ہو رہا ہے، ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۰۰۰ء میں اس کا قیام عمل میں آیا، ادارہ کے ایک صاحب ذوق مخلص نے اس کی تاریخ ''**وَلاَ نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ**'' کے فقرہ سے نکالی ہے، اس کے قیام کے بنیادی مقاصد ہیں: مختلف اسلامی علوم میں باصلاحیت افراد کار کی تیاری، علماء کو جدید تقاضوں سے واقف کرانا، اور عصری تعلیم یافتہ حضرات کو دین سے آشنا کرنا؛ تاکہ اہل علم کی ایک ایسی ٹیم تیار ہو سکے جو دینی وعصری علوم کی جامع ہو، جن موضوعات پر تحقیق کی ضرورت ہے، ان میں فضلاء سے جمع وتحقیق کا کام لیا جائے اور جو مخطوطات اب تک تشنۂ طبع ہیں ان پر بھی تحقیق وتعلیق کا کام ہو، نیز برادران وطن میں دعوت کے کام

کے لئے دینی مدارس اور عصری دانش گاہوں کے فضلاء کو تیار کیا جائے۔

ان مقاصد کے لئے یہاں علوم القرآن ،علوم الحدیث ،فقہ اسلامی ،دعوت اور مقارنۃ الأدیان میں اختصاص کے شعبے شروع سے قائم ہیں ،گذشتہ سال سے افتاء کئے ہوئے طلبہ کے لئے اسلامک فائنانس میں ڈپلوما کا بھی آغاز کیا گیا ہے ،ان تمام شعبوں میں انگریزی زبان ،کمپیوٹر ،جغرافیہ ،تاریخ ہند ،علم شہریت اور معاشیات کے مبادی ،نیز دستور ہند کے بعض ابواب لازمی طور پر داخل نصاب ہیں ، گذشتہ دس سال کے عرصہ میں فتاوی سراجیہ ،فوائد ظہیریہ ،تفسیرات احمدیہ ،احکام القرآن للجصاص ، شرح معانی الآثار للطحاوی ،الکافی للحاکم الشہید ،الأدلۃ الشریفۃ علی مذہب أبی حنیفۃؒ وغیرہ متعدد مخطوطات یا مطبوعات پر تحقیق وتعلیق کا کام ہوا ہے ،یا ابھی جاری ہے ،یوں تو معہد میں دعوتی تربیت کا ایک شعبہ بھی ہے ؛لیکن اس کے علاوہ معہد کے زیر نگرانی مستقل ایک دعوتی ادارہ بھی ’’سنٹر فار پیس اینڈ ٹرو میسج‘‘ کے نام سے قائم ہے ،جو برادران وطن میں دعوت کا اور مختلف اہل مذاہب کے درمیان مذہبی ہم آہنگی پیدا کرنے کا کام کرتا ہے ،بحمد اللہ آندھرا پردیش میں بحیثیت مجموعی ۶۰ مقامات پر اس کے تحت کام ہوتا ہے۔

عصری دانش گاہوں کے فضلاء کو دینی تعلیم دینے کے لئے معہد نے ایک مختصر مدتی عالم کورس ’’مدرسہ عبد اللہ بن مسعود ؓ‘‘ کے نام سے قائم کیا ہے ،جس کی تعلیم روزانہ مغرب کے بعد تین تا چار گھنٹے ہوتی ہے ،اس میں زیادہ تر عصری درسگاہوں میں زیر تعلیم طلبہ یا وہاں سے پڑھے ہوئے لوگ داخل ہوتے ہیں ،اور انہیں ابتدائی نحو وصرف سے لے کر صحاح ستہ کے منتخبات تک پڑھائے جاتے ہیں۔

حضرات ! آج جب کہ معہد کے قیام پر ۱۰ رسال کا عرصہ مکمل ہو چکا ہے ،ادارہ کے ٹرسٹ کی جانب سے اعلان کیا جاتا ہے کہ :

☆ انشاء اللہ جون ۲۰۱۱ء سے کامرس اور ایم بی اے کے طلبہ کے لئے ’’اسلامک فائنانس ‘‘ڈپلوما کورس شروع کیا جائے گا۔

☆ دوسرے معہد نے طے کیا ہے کہ ایک ایسی دینی درسگاہ کا آغاز کیا جائے ،جس کا ذریعۂ تعلیم عربی اور انگریزی ہو اور جس میں جلالین اور ہدایہ اولین تک تعلیم کے ساتھ ساتھ میٹرک تک کے نصاب کے اہم مضامین اس طرح شامل کئے جائیں کہ وہ دسویں

جماعت کا امتحان دے سکیں؛ تاکہ اگلے پانچ سال میں وہ چاہیں تو فضیلت اور آگے کا کورس کریں یا گریجویشن کریں، جیسا کہ اس وقت برطانیہ یا خلیجی ممالک کا تعلیمی نظام ہے، خدا کرے یہ تجربہ کامیابی سے ہمکنار ہو، انشاء اللہ جون ۲۰۱۱ء یا شوال ۱۴۳۲ھ سے اس کی ابتداء کی جائے گی۔

☆ تیسرا منصوبہ مستقل طور پر تحقیق مخطوطات کے شعبہ کا قیام ہے؛ کیوں کہ دائرۃ المعارف العثمانیہ کی زبوں حالی اور حکومت کی طرف سے سوتیلے سلوک کے پس منظر میں اب یہ بات ضروری ہوگئی ہے کہ جس طرح مسلمان اپنی مذہبی تعلیم کے سلسلہ میں حکومت کے تعاون سے آزاد ہوکر خدمت کررہے ہیں، اسی طرح وہ اپنے بزرگوں کے علمی ورثہ کی بھی خود حفاظت کریں اور حکومت یا کسی اور پر تکیہ نہ کریں۔

آپ حضرات کی دُعاؤں کی جلو میں اللہ کے فضل وکرم سے انشاء اللہ یہ تعلیمی اور تحقیقی منصوبے آگے بڑھیں گے اور یہ کارواں اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے گا۔

میں اخیر میں ایک بار پھر آپ حضرات کی تشریف آوری اور عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور خدا کے حضور دُعاء گو ہوں کہ وہ اخلاص اور عزم وحوصلہ کے ساتھ اپنی منزل کی طرف گامزن رہنے کی توفیق عطا فرمائے اور اسی ذات یکتا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ :

جو کچھ ہوا ہے ، ہوا ہے کرم سے تیرے
جو بھی ہوگا ، تیرے کرم سے ہوگا

●●●

حدیث — اُصول، تخریج، تدریس ☆

الحمد لله رب العالمین ، والصلاة والسلام علی سید المرسلین وعلی آله واصحابه اجمعین ومن تبعهم باحسان إلی یوم الدین۔

جناب صدر، مہمان معزز، علماء کرام اور طلبۂ عزیز! تمام اسلامی تعلیمات کا سرچشمہ کتاب اللہ اور سنت رسول ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''**ترکت فیکم شیئین لن تضلوا بعدهما کتاب الله وسنتي**'' (کنز العمال، الاعتصام بالکتاب والسنۃ، حدیث نمبر: ۸۷۶) ان دونوں مصادر شریعت میں سے جہاں کتاب اللہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ استناد کے اعلیٰ ترین مقام پر ہے اور اس کا ایک ایک حرف محفوظ ہے؛ بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے ''**إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ**'' (الحجر: ۹) اور جس کے شک وشبہ سے بالاتر ہونے کی خود قرآن مجید نے صراحت کی ہے ''**ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ**'' (البقرۃ: ۲) وہیں حدیث کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ وہ قرآن مجید کا بیان اور شریعت اسلامی کی توضیح وتفسیر ہے؛ اسی لئے امام اوزاعیؒ نے فرمایا: ''**الکتاب أحوج إلی السنة من السنة إلی الکتاب**'' حدیث کی اسی اہمیت کی وجہ سے اسے ہر عہد کے اصحابِ نظر علماء اور محققین کی خصوصی توجہ حاصل رہی ہے اور دوسری صدی ہجری سے لے کر موجودہ صدی تک کوئی عہد ایسا نہیں گذرا، جس میں حدیث کے مختلف پہلوؤں پر، اس عہد کی ضرورتوں کے مطابق بہت سی تصنیفات منظر عام پر نہیں آئی ہوں، روایت وتدریس اور تصنیف وتحقیق غرض ہر پہلو سے اس فن کی ایسی عظیم الشان خدمت کی گئی ہے کہ اس کو رسول اللہ ﷺ کے معجزہ کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

اصل میں اللہ تعالیٰ کا نظام یہ ہے کہ جس چیز سے انسانیت کا نفع متعلق ہوتا ہے، اسے باقی رکھتے ہیں اور جن چیزوں سے انسانیت کا نفع متعلق نہیں ہوتا، وہ بہ تدریج ختم ہوجاتی ہیں، جب بارش کا موسم آتا ہے تو کتنے ہی خودرو پودے زمین میں اُگ آتے ہیں؛ مگر برسات کے گذرتے ہی یہ

☆ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد میں تخریج حدیث کے موضوع پر ایک ورکشاپ کے لئے لکھا گیا خطبہ افتتاحیہ۔

پودے آہستہ آہستہ ختم ہوجاتے ہیں؛ لیکن جو پودے انسان کے لئے مفید ہوتے ہیں، ان کی عمر دراز ہوتی ہے؛ بلکہ بعض کی عمر تو سو سال سے بھی زیادہ ہوتی ہے، اسی طرح جن جانوروں سے انسان کی غذا اور دوسرے مفادات متعلق ہوتے ہیں، باوجودیکہ وہ کثیر مقدار میں ذبح کئے جاتے ہیں؛ لیکن ان کی نسلیں بڑھتی رہتی ہیں، جیسے گائیں اور بکرے، اور جن جانوروں سے انسان کا مفاد متعلق نہیں ہے، ان کی نسلیں گھٹتی اور ختم ہوتی جارہی ہیں، اگرچہ کہ وہ طاقتور ہیں اور آپ اپنی حفاظت کی صلاحیت رکھتے ہیں، جیسے: شیر، مذاہب اور مذہبی شخصیتوں کے سلسلے میں بھی قدرت کا یہی نظام کارفرما ہے، جن مذہبی کتابوں سے اب انسان کی ہدایت متعلق نہیں رہی، وہ محفوظ نہیں رہیں اور وہ انسانی آمیزشوں اور ملاوٹوں کا شکار بن گئیں، اسی طرح ان مذہبی پیشواؤں کی سیرت بھی اپنی حقیقی حالت میں آج موجود نہیں ہے، یہاں تک کہ جن پیغمبروں کا قرآن مجید میں ذکر آیا ہے اور جن پر ہمارا ایمان ہے، ان کی زندگی کے بھی محض چند واقعات آج روشنی میں ہیں؛ بلکہ اگر قرآن مجید میں ان کا ذکر نہ ہوتا، تو تاریخی طور پر ان کی تصدیق بھی دشوار ہوتی؛ لیکن جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر چوں کہ نبوت کا سلسلہ مکمل ہو چکا ہے اور قیامت تک انسانیت آپ ہی کے نبوت کے سایہ میں رہے گی، اس لئے من جانب اللہ آپ کی پوری زندگی تاریخ کی روشنی میں ہے اور آپ کے فرمودات ومعمولات اس طرح محفوظ ہیں کہ زندگی کا کوئی گوشہ اندھیرے میں نہیں ہے، اس لئے حدیث کی حفاظت دراصل قرآن کی حفاظت اور رسول اللہ ﷺ پر ختم نبوت کا لازمی تقاضہ ہے۔

حدیث کی نقل وروایت کی خدمت اس کے ابتدائی عہد میں جس طرح عربوں نے کی، اسی طرح اس کے جمع وتدوین اور اس فن کو اوجِ کمال تک پہنچانے کا سہرا زیادہ تر ایرانی نژاد علماء کے حصہ میں آیا، پھر مصر وشام اور فلسطین ویمن کے علاقوں سے اُٹھنے والے اہل علم نے اس فن کی آبیاری میں حصہ لیا ہے، اسی طرح ہندوستان گو جزیرۃ العرب سے دور دراز کا علاقہ ہے؛ لیکن اسے یہ شرف حاصل ہے کہ حضرت عمر کے ابتدائی عہد میں ہی یہاں سے اہل ایمان کا قافلہ حجاز مقدس پہنچ چکا تھا اور بعض تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہی ہندوستان کے ساحلی علاقہ پر اسلام کی روشنی پہنچ گئی تھی، اس دیار نے جہاں مختلف اسلامی اور عربی علوم کی خدمت کی ہے، وہیں حدیث نبوی کی خدمت میں بھی اس کا نمایاں حصہ رہا ہے۔

برصغیر کا علم حدیث سے قدیم رابطہ رہا ہے، یہاں حضرت عمر کے عہد سے ہی صحابہ اور تابعین کا ورود شروع ہو گیا تھا، عہد فاروقی میں پانچ صحابہ، عبداللہ بن عبداللہ بن عتیق انصاری، عاصم بن عمرو

تمیمی (جو فتح عراق میں حضرت خالد بن ولید کی فوج میں شامل تھے)، قبیلۂ بنو عبد القیس کے صحار بن عبدی، سہیل بن عدی اور حکم بن ابی العاص ثقفی کا ذکر ملتا ہے، اس طرح حضرت عثمان غنی کے عہد میں عبید اللہ بن معمر تمیمی مدنی، عبد الرحمن بن سمرہ (جو فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے) اور حضرت امیر معاویہ کے عہد میں سنان بن سلمہ ہذلی، جو سندھ تشریف لائے، ان میں بعض حضرات کے راویان حدیث میں شامل ہونے کی صراحت ملتی ہے، اور عمومی طور پر صحابہ کی تربیت اس طرح ہوئی تھی کہ وہ کہیں بھی اور کسی بھی نسبت سے پہنچتے، رسول اللہ ﷺ کے ارشادات لوگوں تک پہنچاتے۔

اس عہد کے بعد موسیٰ بن یعقوب ثقفی —— جو محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ آئے تھے —— یزید بن ابی کبشہ سکسکی دمشقی —— جن کو سلیمان بن عبد الملک نے محمد بن قاسم کی جگہ مقرر کیا —— تابعی تھے اور ماہرین رجال نے ان کو ثقہ راوی شمار کیا ہے، بخاری میں بھی ان کی روایت ہے، مفضل بن ابی صفراء، ابو موسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری —— جن کے تلامذہ میں سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ اور یحییٰ بن سعید القطان جیسے محدثین ہیں —— عمرو بن سفیان ثوری، ربیعہ بن صبیح بصری، جو حسن بصری کے شاگرد تھے اور جن کو اسلام میں پہلا مصنف قرار دیا گیا ہے، جیسے اہل علم اور علماء حدیث پہلی اور دوسری صدی ہجری میں وارد ہند ہوئے، پھر سندھ کے شہر دیبل اور سندھ ہی میں محمد بن قاسم کے قائم کئے ہوئے شہر منصورہ کو مشرق میں اشاعت علم حدیث کے مرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی اور اس وقت سے یہاں علم حدیث کی خدمت کا تسلسل قائم رہا۔

عام طور پر علماء ظاہر اور علماء باطن میں چشمکیں رہتی ہیں؛ لیکن ہندوستان میں صوفیاء کی خدمت کا ایک امتیازی پہلو یہ رہا ہے کہ دہلی اور اس کے مشرق و مغرب کے علاقوں میں علم حدیث کی نشر و اشاعت صوفیاء اور ان کی خانقاہوں سے ہوئی، شاہ نظام الدین اولیاء (جن کے فیض کا دائرہ دور دور تک وسیع تھا) نے اپنی شہرت و مقبولیت کے عروج کے زمانہ میں علم حدیث کی تحصیل کے لئے مولانا کمال الدین زاہد کا تلمذ اختیار کا اور ان سے ''مشارق الانوار'' پڑھی، جو تدریسی نقطۂ نظر سے ہندوستان میں مقبول ترین کتاب تھی، حدیث کی وجہ سے وہ صلاۃ جنازہ علی الغائب، قراءۃ فاتحہ خلف الامام اور سماع کے مسئلہ میں فقہاء احناف سے اختلاف رکھتے تھے، آپ کے شاگردوں میں شمس الدین اودھی ہیں، جنھوں نے مشارق الانوار کی شرح لکھی تھی، فخر الدین دہلوی ہیں، جن کی تالیف ''**كشف القناع عن وجوه السماع**'' کا مخطوطہ اب بھی موجود ہے، ''تاریخ فیروز شاہی'' کے

مصنف فیروز شاہ برنی، شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی اور سید محمد گیسودراز، جنھوں نے مشارق الانوار کی شرح بھی لکھی اور فارسی میں اس کا ترجمہ بھی کیا، نیز معروف فقیہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی بھی آپ کے تلامذہ میں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

شیخ نظام الدین اولیاء سے بھی بڑھ کر جنھیں علم حدیث میں شہرت حاصل ہوئی، وہ مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کی شخصیت ہے، انھوں نے سونار گاؤں میں اپنے استاذ اور خسر ابوتوامہؒ حنبلی کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی، ان کے مکتوبات اور تصوف سے متعلق تالیفات میں کثرت سے احادیث منقول ہیں اور کہا جاتا ہے کہ پورے ہندوستان میں سب سے پہلے انھوں نے ہی صحیحین کی تعلیم شروع کی، ان کے شاگردوں میں شیخ مظفر بلخی، حسین بن معز بہاری اور احمد لنگر دریا علم حدیث کی نشرو اشاعت اور تصنیف وتالیف میں امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔

تیسری شخصیت سید علی ہمدانی کی ہے، جن کے ذریعہ کشمیر میں اسلام کی اشاعت بھی ہوئی اور درس حدیث کا سلسلہ بھی شروع ہوا، انھوں نے ''**السبعین فی فضائل امیر المومنین**'' (جو اہل بیت کے فضائل میں ہے) اور ''اربعین فی الحدیث'' لکھی، ان کے شاگردوں میں سید جلال الدین اور قاضی حسین شیرازی قابل ذکر ہیں، قاضی شیرازی ہی نے بابا رتن ہندی سے متعلق احادیث جمع کیں، جو صحابی رسول ہونے کا مدعی تھا — چوتھی شخصیت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کی ہے، ان کے تلامذہ میں ان کے صاحبزادے محدث جمال الدین کے علاوہ سید جلال الدین بخاری خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ثانی الذکر بھی قراءۃ فاتحہ خلف الامام اور صلوٰۃ جنازہ علی الغائب کے سلسلے میں شاہ نظام الدین اولیاء کے نقطۂ نظر پر تھے، اس طرح ہندوستان میں اشاعت حدیث کے سلسلے میں صوفیاء کا بڑا اہم حصہ رہا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعض بڑے بڑے محدثین جو عالم عرب میں اپنے عہد میں مرجع کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے تلامذہ یا تلامذہ کے تلامذہ خود ہندوستان میں وارد ہوئے یا ہندوستان سے جا کر وہاں کسبِ فیض کر کے واپس آئے، حافظ ابن حجر عسقلانی سے براہ راست استفادہ کرنے والوں میں ہمیں یحییٰ بن عبد الرحمن ہاشمی شافعی کا نام ملتا ہے، جن کے علم کا فیض گلبرگہ سے جاری ہوا اور ایک واسطہ سے تلمذ حاصل کرنے والوں میں جنوبی ہند کے مشہور عادل حکمراں محمود گاواں ہیں، جنھوں نے ایک عظیم الشان مدرسہ کی بھی بنیاد رکھی، اسی طرح علامہ عبد الرحمن سخاوی کے شاگردوں

میں ابوالفتح بن رضی مکی، احمد بن صالح عمر بن محمد دمشقی، عبدالعزیز بن محمود طوسی شافعی، وجیہ الدین محمد مالکی، حسین بن عبداللہ کرمانی اور جمال الدین محمد جو بحرق کے نام سے معروف تھے، نیز رفیع الدین صفوی کا تذکرہ ملتا ہے، جن میں سے زیادہ تر شخصیتیں دکن کی مختلف مسلمان سلطنتوں میں فروکش تھیں، یہ سب براہ راست علامہ سخاوی کے شاگرد تھے — علامہ ابن حجر ہیثمی کے تلامذہ شیخ عبداللہ عیدروسی، ابوالسعادہ محمد فاکہی حنبلی، میر مرتضیٰ شریف شیرازی اور محمد میر کلاں محمد سعید بن مولانا خواجہ ہیں، جو محدث اکبرآبادی کے نام سے معروف تھے، اول الذکر دونوں بزرگوں کا علمی مرکز گجرات میں قائم ہوا اور ثانی الذکر دونوں شخصیتوں کا آگرہ میں، اس طرح مشہور دبستانِ حدیث جو عالم اسلام میں پائے جاتے تھے، ان کا فیض ہندوستان تک پہنچا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے، جس کے مختلف خطوں میں درس حدیث کی گونج رہی ہے، سندھ کو تو اس میں اولیت حاصل ہے ہی؛ لیکن دکن، گجرات، دہلی، جونپور، بہار، بنگال، لکھنؤ، لاہور اور مالدہ وغیرہ کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے اور ہندوستان کی خاک سے متعدد ایسی شخصیتیں اُٹھتی رہی ہیں، جن کے علم کی روشنی نے عالم اسلام کو بھی منور کیا ہے، ان میں شیخ علی متقیؒ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، شیخ علی متقی (متوفی: ۹۷۵ھ) نے احادیث پر متعدد کتابیں مرتب کی ہیں، جن میں ''کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال'' کو ایسی عالمگیر شہرت و پذیرائی حاصل ہوئی، جو کم کتابوں کے حصہ میں آئی، اس کے علاوہ انھوں نے فقہی ابواب کی ترتیب پر ''الجامع الصغیر'' اور زیادۃ الجامع الصغیر کا مجموعہ بھی ''منہاج العمال'' کے نام سے مرتب کیا تھا، جو اب تک مخطوطہ کی شکل میں ہے، اس دبستانِ درس کی شخصیتوں میں شیخ ابوالحسن سندھی (متوفی: ۱۱۳۸ھ) محشی صحاح ستہ ہیں، جنھوں نے پہلی بار مسند احمد کی شرح لکھی اور جو اب تک تشنۂ طبع ہے، ان کے صاحبزادے علامہ محمد حیات سندھی، علامہ ابوطیب سندھی جن کی شرح جامع ترمذی پر ہے، اور ''عقود الجواہر المنیفہ فی اصول ادلۃ مذہب ابی حنیفہ'' کے مصنف علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی (متوفی: ۱۲۰۵ھ) اور علامہ محمد عابد سندھی (متوفی: ۱۲۵۷ھ) جنھوں نے مسند امام ابی حنیفہ کی ''المواہب اللطیفہ'' کے نام سے شرح لکھی ہے، نیز بلوغ المرام کی شرح بھی تالیف فرمائی ہے، اسی درسگاہ کے کواکب وانجم ہیں۔

شیخ کے شاگرد علامہ طاہر پٹنی حنفی کو علم حدیث کی خدمت میں جو شہرت حاصل ہوئی، وہ محتاجِ اظہار نہیں، ان کی تالیفات ''المغنی فی ضبط الرجال، تذکرۃ الموضوعات، قانون الموضوعات والضعفاء،

مجمع بحار الانوار'' مطبوعہ ہیں اور'' اسماء الرجال'' مخطوطہ کی شکل میں خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے، ان ہی علماء میں شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی ہیں، جنھوں نے مختلف موضوع کی تیئیس کتابوں پر شرحیں اور حواشی لکھے ہیں، ہندوستان کے محدثین میں ایک زندہ و پائندہ نام علامہ حسن صنعانی لاہوری (متوفی: ۶۵۰ھ) کا ہے، جنھوں نے علوم اسلامی کی تحصیل کے لئے حجاز اور عراق کے بکثرت اسفار کئے، انھوں نے احادیث موضوعہ پر قلم اُٹھایا، جو رسالۃ الموضوعات کے نام سے چھپ چکا ہے، مشارق الانوار کے نام سے (۲۲۵۳) احادیث کا بخاری ومسلم سے انتخاب کیا، یہ کتاب ایک زمانے تک ہندوستان کے تدریسی اُفق پر چھائی رہی اور اس کو تشریح وترجمہ کے اعتبار سے بھی اہل علم کی بڑی توجہ حاصل ہوئی، ان کی فہرست تصانیف میں رجال پر'' کتاب الضعفاء والمتروکین'' کے نام سے بھی ایک کتاب کا نام ملتا ہے۔

ہندوستان میں علم حدیث کی تدریس وتالیف کو فروغ دینے والی ایک نہایت اہم شخصیت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ہے، جنھوں نے ہندوستان میں'' مشکوٰۃ المصابیح'' کے درس کو رواج دیا اور اس کی شرح عربی میں'' **لمعات التنقیح** '' اور فارسی میں'' **اشعة اللمعات** '' کے نام سے لکھی، آپ کی ایک اہم تالیف ایام ولیالی کے فضائل اور اعمال سے متعلق'' ما ثبت بالسنۃ'' کے نام سے مطبوعہ ہے، شاہ عبدالحق صاحب نہ صرف خود حدیث کا درس دیا اور تالیف وتصنیف کے ذریعہ علم حدیث کی خدمت کی ؛ بلکہ ایک ایسی درسگاہ کی بنیاد رکھی، جس سے بہت سے اہل علم نے استفادہ کیا اور بڑے بڑے محدثین وہاں سے فارغ التحصیل ہوئے، جن میں خود شیخ کی اولاد و احفاد میں شیخ نور الحق ہیں، جن کی بخاری پر'' تیسیر القاری'' کے نام سے پانچ جلدوں میں ایک جامع شرح چھپ چکی ہے، اور اسی خاندان کے ایک اور بڑے عالم سلام اللہ محدث رام پوری ہیں، مؤطا امام مالک پر عربی زبان میں ان کی شرح'' المحلی باسرار المؤطا'' کے نام سے مخطوطہ کی شکل میں موجود ہے، شیخ عبدالحق کی درسگاہ سے استفادہ کرنے والوں میں بابا داؤد مشکاتی کشمیری بھی ہیں، جن کو پوری مشکوٰۃ حفظ تھی، ان ہی میں میر غلام علی آزاد بلگرامی بھی ہیں، جو مشہور مصنف، مؤرخ اور فارسی کے ادیب تھے، جن کی تالیفات میں'' سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان'' (مطبوعہ: ۱۳۰۳ھ) اور ہندوستان سے متعلق احادیث پر'' **شمامة العنبر فی ماورد فی الهند عن سید البشر** '' کو خاص طور پر شہرت حاصل ہوئی۔

شاہ عبدالحق صاحب کے بعد جس شخصیت نے ہندوستان میں باضابطہ درسگاہ حدیث کی بنیاد رکھی اور حدیث کے فیض کو دور دور تک پہنچایا، وہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہیں، جنھوں نے حجاز کا سفر کیا اور وہاں سے حدیث کا تحفہ لے کر آئے، اس وقت ہندوستان کی علمی فضا پر معقولات کی گھٹا چھائی ہوئی تھی، انھوں نے ہندوستان واپس آکر موطا امام مالک، صحاح ستہ، مسند دارمی اور مشکوٰۃ کا درس شروع کیا، شاہ ولی اللہ صاحب کے شاگردوں میں شاہ عبدالعزیز صاحب، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مولانا محمد عاشق پھلتی، خواجہ امین ولی اللّٰہی، مولانا خیر الدین سواتی اور مولانا بشیر الدین مرادآبادی جیسے نابغۂ روزگار علماء شامل ہیں، جن کے ذریعے پورے ہندوستان میں حدیث کی نشر واشاعت ہوئی اور درس حدیث کی ایک نئی تحریک نے جنم لیا، شاہ عبدالعزیز صاحب سے استفادہ کرنے والوں میں شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادی اور شاہ محمد اسحق جیسے اہل علم ہوئے، دیوبند اور سہارنپور کا سلسلہ حدیث شاہ محمد اسحق صاحب اور شاہ عبدالغنی صاحب سے مربوط ہے، اور شاہ عبدالعزیز صاحب ہی کے ایک اور شاگرد میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی سے اہل حدیث مکتبہ فکر کا رشتہ جڑا ہوا ہے، اس طرح اس وقت برصغیر میں حدیث کے جو مدارس ہیں، ان سب کا سلسلۂ نسب شاہ عبدالعزیز صاحب سے ملتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کے بعد ہندوستان کے آسمان علم وتحقیق پر نیر تاباں بن کر طلوع ہونے والی شخصیات میں غالباً سب سے نمایاں نام مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی لکھنوی کا تھا، وہ علوم اسلامی کی جامعیت، حدیث وفقہ میں یکساں تبحر اور تقلید کے ساتھ ساتھ تحقیق اور فکر ونظر میں عدل واعتدال کا ایسا نمونہ ہیں، جن کو شاہ ولی اللہ صاحب کی فکر کا عکس جمیل قرار دیا جاسکتا ہے، وہ بنے بنائے راستہ پر قناعت کرنے کے بجائے نئے راستے بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے اور ابداعی فکر کے مالک تھے، انھوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا، اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی، حدیث کے رد وقبول کے سلسلے میں سند کے علاوہ دوسرے قرائن اور وجوہِ درایت کی اہمیت کو انھوں نے بڑی قوت کے ساتھ اور مدلل طور پر پیش کیا، اس سلسلے میں ''الرفع والتکمیل'' اور ''الاجوبۃ الفاضلۃ'' اُصولِ حدیث کے پورے کتب خانے میں امتیازی حیثیت کی حامل کتابیں ہیں، جو بعد کے اہل علم کے لئے سرمۂ چشم بنیں ؛ اسی لئے ممتاز محدث شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی جو توجہ مولانا لکھنوی کی تالیفات کو حاصل ہوئی، شاید ہی کسی اور عالم کے حصہ میں آئی ہو۔

اسی دور میں ہندوستان میں ایک دوسری شخصیت نواب صدیق حسن خاں کی ابھری، جو اس دیار میں مسلک اہل حدیث کے مؤسسین میں ہیں؛ البتہ ان کے یہاں اعتدال اور ائمہ متبوعین کا پورا احترام بھی ہمیں نظر آتا ہے، فقہ الحدیث پر ان کی تالیف ''نزل الابرار'' کے علاوہ ان کی اور بھی متعدد کتابیں ملتی ہیں اور خاص طور پر انھوں نے ہندوستان میں علامہ شوکانی کے علوم وافکار کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا ہے، اس موقعہ پر علامہ شوکانی کے ایک تلمیذ رشید محدث حسین بن محسن انصاری یمانی کا ذکر بھی مناسب ہوگا، جو اپنے عہد کے مشہور اساتذۂ حدیث میں تھے، بڑے بڑے اہل علم خاص کر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اکابر نے ان سے استفادہ کیا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی ان سے استفادہ کرنے والوں میں ہیں، ان کی تالیف ''**التحفة المرضية فی حل بعض المشكلات الحديثية**'' نقدِ حدیث کے موضوع پر بڑی اہم کتاب ہے، جس میں دوسری بحثوں کے بہ شمول حدیث کے ردوقبول میں ''تلقی بالقبول'' کی اہمیت پر بڑی چشم کشا گفتگو کی گئی ہے۔

مدارس حدیث کی جہدِ مسلسل ہی کا نتیجہ ہے کہ حدیث کے موضوع پر اُردو فارسی کے علاوہ عربی زبان میں بھی ہمیں علماء ہند کی تصنیفات کا ایک بڑا ذخیرہ نظر آتا ہے؛ چنانچہ متونِ حدیث کو جمع کرنے میں شیخ علی متقی ہندی کی ''کنز العمال'' ایسی شہرہ آفاق اور جامع تالیف ہے، جس کی شہرت ذکر وتعارف سے ماوراء ہے، پھر ماضیٔ قریب میں مولانا ظہیر احسن شوق نیموی کی ''آثار السنن'' مولانا ظفر احمد عثمانی کی ''اعلاء السنن'' اور مولانا عبداللہ شاہ محدثِ دکن کی ''زجاجۃ المصابیح'' حنفی نقطۂ نظر سے احکام حدیث کے ایسے جامع اور وقیع مجموعے ہیں، جن کی عالم اسلام کے علماء نے بھی داد دی ہے۔

شروح حدیث میں بخاری پر مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے حواشی، مولانا رشید احمد گنگوہی کی ''لامع الدراری'' مولانا انور شاہ کشمیری کی ''فیض الباری''، مسلم پر مولانا شبیر احمد عثمانی کی ''فتح الملہم، سنن ابی داؤد پر مولانا شمس الحق عظیم آبادی کی ''عون المعبود'' مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی ''بذل المجہود'' اور مولانا سید انور شاہ کشمیری کی ''انوار المحمود''، سنن ترمذی پر مولانا عبدالرحمن مبارکپوری کی ''تحفۃ الاحوذی'' مولانا انور شاہ کشمیری کی ''العرف الشذی'' مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی ''معارف السنن'' اور مولانا رشید احمد گنگوہی کی ''الکوکب الدری''، سنن نسائی پر مولانا رشید احمد گنگوہی کی ''الفیض السماوی'' اور مؤطا امام مالک پر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی ''المسویٰ''، نیز مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی کی مفصل شرح ''اوجز المسالک''، مؤطا امام محمد پر مولانا عبدالحیٔ فرنگی

محلی کی ''التعلیق الممجد''امام ابو یوسف کی کتاب الآثار پر مولانا ابوالوفاء افغانی کی ''تعلیقات''امام محمد کی کتاب الآثار پر مفتی مہدی حسن شاہجہاں پوری کی ''قلائد الازہار''نیز سنن دارقطنی پر مولانا شرف الدین عظیم آبادی کی التعلیق المغنی اور شرح معانی الآثار پر مولانا محمد یوسف کاندھلوی کی امانی الاحبار وغیرہ نہایت اہم تالیفات ہیں۔

اُصولِ حدیث کے موضوع پر مولانا عبدالحئ فرنگی محلی لکھنوی کی ''ظفر الامانی علی مختصر الجرجانی'' شاہ عبدالحق صاحب کا ''مقدمہ فی اصولِ الحدیث''از روئے درایت نقد حدیث کے سلسلے میں مولانا لکھنوی کی ''الرفع والتکمیل''اور ''الاجوبۃ الفاضلۃ''کے علاوہ اعلاء السنن پر مولانا ظفر احمد عثمانی کا، فتح الملہم پر مولانا شبیر احمد عثمانی کا، تحفۃ الاحوذی پر مولانا عبدالرحمن مبارکپوری کا، اوجز المسالک پر مولانا محمد زکریا کاندھلوی کا اور لامع الدراری پر مولانا محمد عاقل سہارنپوری کا مقدمہ بلند پایہ تحریریں ہیں، اسی طرح محدث یمانی کی التحفۃ المرضیہ اور نواب صدیق حسن خاں صاحب کی بعض تالیفات نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔

رجال کے سلسلے میں علامہ پٹنی کی ''المغنی فی ضبط الاسماء''کے علاوہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی ''الاکمال فی اسماء الرجال''اور طحاوی کے رجال پر مولانا محمد ایوب سہارنپوری کی ''تراجم الاحبار'' وغیرہ اہم تالیفات ہیں، اسی طرح تخریج حدیث میں مولانا حبیب اللہ مختار کی ترمذی کی احادیث الباب پر ''کشف النقاب''ایک مفید ترین کام ہے، جو افسوس کہ مکمل نہیں ہو پایا۔

یہ تو ان تالیفات میں سے کچھ اہم کتابوں کا ذکر ہے، جو عربی زبان میں لکھی گئی ہے؛ لیکن برصغیر میں اُردو زبان میں بھی حدیث کے موضوع پر ایک پورا کتب خانہ وجود میں آچکا ہے، جس میں متونِ حدیث کے ترجمے بھی ہیں، صحاحِ ستہ اور حدیث کی بعض اور کتابوں کی مختصر، متوسط اور تفصیلی شرحیں (جو زیادہ تر دروس کے مجموعے ہیں) بھی ہیں، اُصولِ حدیث پر بھی مختصر اور مفصل مستقل کتابیں اور عربی کی اہم کتابوں کے ترجمے موجود ہیں، حدیث کے انکار کے فتنے کی بیج یوں تو مستشرقین نے بوئی اور اس کا پہلا اثر مصر کی بعض مغرب زدہ شخصیتوں نے قبول کیا؛ لیکن یہ فتنہ تقریباً اسی دور میں ہندوستان میں بھی پہنچ گیا اور یہاں بعض معروف شخصیتیں اس گمراہی کا شکار ہوئیں، اس پس منظر میں حدیث کی حجیت، عہد نبوی اور عہد صحابہ میں حدیث کی کتابت اور حدیث کے استناد و اعتبار پر علماء نے پوری تحقیق، بصیرت، دینی حمیت اور سلف صالحین کے نقطۂ نظر پر استقامت کے

ساتھ نہ صرف قلم اٹھایا؛ بلکہ اس پر پورا کتب خانہ تیار کر دیا اور شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہو کہ اس جہت سے علماء ہند کی خدمات عالم عرب سے بھی زیادہ وقیع ہیں، اس سلسلے میں علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا حبیب الرحمن اعظمی، مولانا بدر عالم میرٹھی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ کی خدمات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

روایات کی سند ومتن اور نقد ودرایت کی جہتوں سے تنقیح وتحقیق کے سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی اور ان کے تلمیذ سعید علامہ سید سلیمان ندوی کی کوششیں ایک حد تک اس وقت تک کی ان تالیفات سیرت پر بھی بھاری ہیں، جو عربی زبان میں لکھی گئی ہیں۔

حدیث کی متعدد اہم تالیفات وہ ہیں، جن پر تحقیق وتعلیق کی خدمت علماء ہند نے انجام دی ہے، اس سلسلے میں ''مسند امام اعظم'' امام ابو یوسف اور امام محمد کی ''کتاب الآثار، مصنف عبدالرزاق، مسند ابویعلی اور سنن سعید بن منصور'' پر علماء ہند کی علمی کاوشیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور ہندوستان میں مولانا ابوالوفاء افغانی اور مولانا حبیب الرحمن اعظمی کی خدمات اس سلسلہ میں ناقابل فراموش ہیں، نیز عصر حاضر میں ڈاکٹر مصطفی اعظمی اور مولانا ابواللیث خیر آبادی وغیرہ خدمت حدیث کے سلسلہ میں عالمی سطح پر معروف ہیں اور ان کی تصنیفات کو عالم عرب میں بھی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

ان خدمات کے مختصر اور سرسری ذکر کا مقصد تفاخر اور محض تاریخ کے صفحات کو الٹانا نہیں ہے؛ بلکہ مقصد یہ ہے کہ نئی نسل کے سامنے اپنے بزرگوں کا کارنامہ رہے؛ کیوں کہ قومیں ماضی کے آئینہ میں اپنے مستقبل کو سنوارتی ہیں اور بزرگوں کے نقش قدم پر آئندہ کا سفر طے کرتی ہیں، پس اللہ تعالیٰ خادمین دین کے اس قافلہ کو بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے اور ہمیں اپنے دین اور علم دین کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرات ! اس وقت ہم جس خطہ میں آپ کا استقبال کر رہے ہیں یعنی سرزمین دکن، یہ علم حدیث کے اہم مراکز میں رہا ہے، برہان پور، گلبرگہ، بیجاپور، بیدر اور احمد نگر وغیرہ میں سنی مسلم حکومتوں نے محدثین کی بڑی پذیرائی کی، اور انھیں تدریس وتصنیف کے ذریعہ اس علم کی آبیاری کرنے کا پورا پورا موقع فراہم کیا ہے، جن میں سے بعض کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، ماضی قریب میں بھی دکن خاص کر حیدرآباد کا حدیث کی نشر واشاعت میں بڑا حصہ رہا ہے، یہیں دائرۃ المعارف العثمانیہ سے پہلی بار ''کنز العمال، سنن بیہقی، کتاب الانساب للسمعانی، کتاب الثقات لابن حبان، مشکل الآثار

للطحاوی''، وغیرہ جیسی عظیم کتابیں طبع ہوئیں، اور اہل علم کو ان سے استفادہ کا موقع ملا، اسی طرح مولانا ابوالوفاء افغانی کے قائم کردہ ادارہ ''لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ'' کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں، جس سے امام ابو یوسف اور امام محمد کی ''کتاب الآثار'' وغیرہ شائع ہوئیں، صحاح ستہ (سوائے سنن ترمذی) کے مترجم اور مفردات حدیث پر عربی اُردو لغت کے مؤلف نواب وحید الزماں حیدرآبادی کا قیام اسی شہر میں تھا اور وہ یہیں کی آغوش میں پروان چڑھے، مولانا شبیر احمد عثمانی کی فتح الملہم کی تالیف میں سابق حکومت حیدرآباد ہی نے مالی تعاون کا تحفہ پیش کیا اور بحمد اللہ اس وقت بھی اس دیار میں تدریس وتالیف اور تحقیق وتعلیق کی صورت میں علم حدیث کی خدمت جاری ہے اور متعدد ایسی درسگاہیں ہیں، جہاں صحاحِ ستہ کا درس ہوتا ہے اور لڑکیوں کے لئے تو دورۂ حدیث تک تعلیم کی درسگاہیں ایک درجن سے زیادہ ہیں۔

حضرات! المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد جہاں اس وقت آپ تشریف فرما ہیں، ایک نو قائم شدہ ادارہ ہے، جس کے قیام پر صرف دس سال پورے ہوئے ہیں، اس کا بنیادی مقصد مختلف اسلامی علوم اور دینی خدمتوں میں بہتر اور باصلاحیت افراد کی تیاری، نیز علماء کو انگریزی زبان اور عصر حاضر کے علوم سے اس حد تک آشنا کرنا کہ وہ زیادہ بہتر طور پر اسلام کی ترجمانی اور تشریح کرسکیں، تفسیر وحدیث، فقہ اور عصر حاضر میں اسلام کے بارے میں پیدا کی جانے والی غلط فہمیوں کے موضوعات پر تحقیق، غیر مسلم بھائیوں میں دعوتِ اسلام کی کوشش اور دعوت کی عملی جدوجہد اس کے مقاصد میں شامل ہیں، اور یہ ادارہ بتدریج اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔

اس کا ایک اہم شعبہ حدیث کا بھی ہے، یہاں فقہ حنفی کی معروف کتاب ''بدائع الصنائع'' کی احادیث کی تخریج کا کام پانچ جلدوں میں ہوا ہے، ایک اہم مخطوطہ ''الادلۃ الشریفہ علی مذہب ابی حنیفہ''، علامہ سیوطی کی ''**العرف الوردی فی احادیث المھدی**'' اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی تخریج بھی عمل میں آئی ہے، ایک فاضل نے اُردو زبان میں حدیث کے سرمایہ کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، اور سن دو ہزار تک کی کتابوں کا تعارف پیش کیا ہے، جن احادیث پر عقلی جہت سے اہل مغرب اعتراض کرتے ہیں، ان پر بھی کام کرایا گیا ہے، موضوع روایات پر اُردو زبان میں ایک تفصیلی مقالہ مرتب ہوا ہے، جس میں وضع حدیث کی تاریخ، علامات، موضوع روایات سے متعلق کتابیں اور زبان زد موضوع روایات کا ذکر کیا گیا ہے اور اُردو زبان میں اس موضوع پر یہ پہلی تفصیلی

کتاب ہے، اسی طرح ایک فاضل نے حدیث کی جمع وتدوین کے سلسلے میں مستشرقین اور مستغربین کے اعتراضات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، ایک اور فاضل نے ان مرویات کو جمع کیا ہے، جن میں عہد نبوی اور عہد صحابہ میں کتابت حدیث کا ذکر ہے، یہ مکررات کو حذف کرنے کے بعد حدیثیں ہیں، جو غالباً اس موضوع پر اب تک جمع کی گئی روایتوں میں سب سے زیادہ ہے، ایک فاضل نے ''علماء دیوبند کی خدمات حدیث'' اور ایک اور فاضل نے احناف کی کتب حدیث پر کام کیا ہے، اس وقت طحاوی کی ''**شرح معانی الآثار**'' پر احادیث کی تخریج اور رجال کی تحقیق کا کام بھی ہو رہا ہے اور علامہ ابن رشد قرطبی مالکی کی ''مختصر شرح معانی الآثار'' پر بھی — جو ابھی مخطوطہ کی شکل میں ہے — کوشش کی جارہی ہے کہ حدیث کی اس اہم کتاب کی شایانِ شان خدمت کی جائے، **وباللہ التوفیق وھو المستعان۔**

معہد میں مختلف موضوعات پر محاضرات وسیمینار اور ورکشاپ کا اہتمام ہوتا رہتا ہے، اس سال بھی تربیت قضاء، اسلامی فینانس، طریقۂ تعلیم، فلکیات، طب سے متعلق وہ مباحث جن سے احکام شرعیہ متعلق ہیں، وغیرہ پر ورکشاپ منعقد ہوئے ہیں، اتفاق سے حدیث کے موضوع پر کم پروگرام رکھے جاسکے ہیں، اس لئے اس وقت اُصولِ حدیث اور تخریج حدیث پر اس ورکشاپ کا انعقاد بڑی مسرت اور اس سے بڑھ کر سعادت کی بات ہے، جو علم وادب کی اس بستی کو حاصل ہو رہی ہے، ہم سب کے شکریہ وامتنان کے مستحق ہیں، ڈاکٹر محی الدین محمد عوامہ حفظہ اللہ، جو خود بڑے فاضل ہیں اور ان کے والد ماجد محدث العصر شیخ محمد محمد عوامہ حفظہ اللہ (تلمیذ رشید فقیہ ومحدث شیخ عبد الفتاح ابوغدہ نور اللہ مرقدہ) ہیں، جن کی محدثانہ کاوشیں محتاج اظہار نہیں اور شیخ عبد الفتاح تو علماء ہند کے لئے ہمیشہ آنکھوں کا نور اور دل کا سرور رہے ہیں، وہ خود اپنے عہد کے محدث کبیر علامہ زاہد الکوثری کے شاگرد تھے، اس طرح یہ علمی زنجیر سلسلۃ الذہب کی حیثیت رکھتی ہے، ہمارے مہمان معزز اسی زنجیر کی ایک کڑی ہیں اور انھیں براہ راست یا بالواسطہ ان بزرگوں سے استفادہ کا موقع ملا ہے، وہ ایمان وروحانیت اور علم وادب کی سرزمین شام کے رہنے والے ہیں اور اس وقت حرم مدنی میں قیام پذیر ہیں اور ہماری حقیر دعوت پر یہاں تشریف لائے ہیں، دُعاء ہے کہ اللہ ان کے علم وعمل اور صحت وحیات میں خوب خوب برکت عطا فرمائے اور انھیں اپنے والد محترم کا مکمل جانشین بنائے۔

حضرات ! ہم اس اہم موقع پر آپ حضرات کے بھی شکر گذار ہیں کہ تدریسی اعتبار سے ایسے اہم اور نازک وقت میں آپ نے ہماری حقیر دعوت پر لبیک کہا اور یہاں تشریف لائے اور ہم

اُمید رکھتے ہیں کہ انشاء اللہ یہ ورکشاپ اپنے مقصد میں کامیاب اور ثمر آور ہوگا اور ہمارے نوجوان فضلاء اور اساتذہ میں علم وتحقیق کا نیا حوصلہ پیدا کرنے کا باعث بنے گا، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضیات پر قائم رکھے اور اپنی منہیات سے بچائے۔

ربنا تقبل منا إنک أنت السمیع العلیم۔

● ● ●

اسلام کے اُصولِ قانون ☆

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله واصحابه اجمعين ومن تبعهم باحسان إلى يوم الدين ۔

صدر عالی قدر، مہمانان ذی احترام، دانشوران گرامی، ہندوستان بھر کی مختلف دینی درسگاہوں سے آئے ہوئے اساتذہ کرام اور طلبۂ عزیز!

اسلامی علوم میں فقہ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے، یہ ایک طرف قرآن وحدیث کا عطر ہے اور دوسری طرف ہر لمحہ رواں دواں زندگی سے مربوط ہے اور غور کیا جائے تو اس علم کا رشتہ تمام ہی اسلامی علوم سے ہے، قرآن وحدیث تو فقہ کے اصل مآخذ ہیں؛ اس لئے فقہ کا طالب علم تفسیر وحدیث سے مستغنی نہیں ہوسکتا، فقہ میں ارتداد اور الفاظ کفر کے تحت کلام وعقیدہ کے بھی بہت سے مسائل آجاتے ہیں، فقہاء نے اخلاقی احکام جیسے جھوٹ، غیبت، ریا اور کبر کو بھی اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے اور خاص کر حنفیہ کے یہاں حظر واباحہ کے باب میں اس سلسلہ کے بہت سے مسائل ملتے ہیں؛ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ تزکیہ واحسان اور علم الاخلاق کی روح بھی اس میں سمٹ گئی ہے، عربی زبان وادب، نحو وصرف کے قواعد اور بلاغت کے اُصول سے بھی ایک فقیہ کا واقف ہونا ضروری ہے؛ تاکہ کتاب وسنت کے الفاظ کا مصداق صحیح طور پر متعین کرسکے؛ اس لئے یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ بعض جہتوں سے فقہ تمام اسلامی علوم کا مغز اور اس کا نچوڑ ہے۔

علم فقہ کے معاون کئی علوم ہیں جن میں سرفہرست اُصولِ فقہ ہے؛ کیوں کہ فقہ دراصل معتبر علماء کے اجتہادات اور استنباطات کا مجموعہ ہے اور اجتہاد کا طریقہ اُصولِ فقہ ہی کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے؛ اس لئے یہ اہم بلکہ اہم ترین فن ہے اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ باضابطہ طریقہ پر اُصولِ قانون کو سب سے پہلے مسلمان علماء نے ہی مرتب کیا ہے، مستشرقین — جو مشکل ہی سے مسلمانوں کے علمی

☆ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے اشتراک سے حیدرآباد میں 'اسلام کے اُصولِ قانون' کے موضوع پر ایک تربیتی سیمینار منعقد کیا تھا، یہ اسی موقع کا کلیدی خطبہ ہے۔

وفکری کمالات کا اقرار کرتے ہیں — کو بھی اعتراف ہے کہ اس فن کو سب سے پہلے مسلمانوں نے وجود بخشا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان فقہاء نے نہایت دقتِ نظر، گہرائی اور گیرائی کے ساتھ اسلام کے اُصول و قانون کو مدون کیا ہے اور ان کو صرف ایک نظریہ کی حیثیت سے پیش نہیں کیا؛ بلکہ منطبق کر کے دکھایا ہے۔

حضرات گرامی! اس اہم علم سے متعدد فوائد متعلق ہیں :

۱- اسی فن کے ذریعہ اجتہاد اور اخذ و استنباط کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور احکام پر منصوص اور قیاسی دلائل قائم کئے جاسکتے ہیں؛ اسی لئے اس علم کا فائدہ صرف فقہ ہی میں نہیں ہے؛ بلکہ تمام شرعی علوم میں ہے، اُصولِ فقہ جہاں استنباط کی صلاحیت پیدا کرتا ہے، وہیں اجتہاد و استنباط میں ہونے والی فکری غلطی سے بھی بچاتا ہے اور اس علم کے حامل کے لئے زبان و بیان کے مختلف اسالیب کو سامنے رکھتے ہوئے احکام کے درجات کو متعین کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔

۲- یہ فن کتاب وسنت کی غلط تعبیر اور دین کی غلط تشریح کرنے والوں پر رد اور ان کے شبہات کے ازالہ کے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہے؛ کیوں کہ اُصولِ فقہ کے ذریعہ ہی استدلال واستنباط کی غلطی کو سمجھا اور آشکارا کیا جاتا ہے۔

۳- اُصولِ فقہ کے ذریعہ تمام ہی علوم شرعیہ — تفسیر، حدیث اور فقہ — میں بصیرت حاصل ہوتی ہے؛ بلکہ درایتی پہلو سے حدیث کی نقد و تحقیق کے قواعد عام طور پر اُصولِ فقہ ہی کے ذیل میں بیان کئے گئے ہیں، جن سے نہ صرف حدیث کے معانی اخذ کرنے میں فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے؛ بلکہ متن حدیث کی شہادت اور خارجی قرائن کی روشنی میں حدیث کے معتبر اور نامعتبر ہونے کا فیصلہ کرنے میں بھی ان کی بڑی اہمیت ہے۔

۴- ہر دور میں جو نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان پر احکام شرعیہ کی تطبیق اُصولِ فقہ میں درک و مہارت کے بغیر نہیں کی جاسکتی، خود اس دور میں پیدا ہونے والے بہت سے مسائل — عرف، مصالح مرسلہ، ضرورت و حاجت، سد ذریعہ اور قیاس وغیرہ — سے متعلق ہیں، جب تک اُصولِ فقہ پر نظر نہیں ہوگی، ان پیش آمدہ مسائل کے بارے میں درست رائے قائم کرنا بھی ممکن نہیں ہوگا۔

غرض کہ اُصولِ فقہ ایک عظیم الشان علم شرعی ہے، اگر ''ادلۂ شرعیہ'' (کتاب وسنت اور اجماع وقیاس) علم و معرفت کا خزانہ ہیں، تو اُصولِ فقہ اس کی کلید۔

حضرات ! اسلامک فقہ اکیڈمی نے اسی اہمیت کے پیش نظر یہ تربیتی کیمپ رکھا ہے؛ اگر

ہم اس علم کی روشن تاریخ پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ علوم اسلامی کی تدوین کے بالکل ابتدائی دور میں ہی یہ اہل علم کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا، اس فن کے مدون اول کی حیثیت سے اہل تشیع نے عام طور پر امام باقرؒ کا ذکر کیا ہے؛ مگر اس پر کوئی علمی شہادت موجود نہیں ہے، اہل سنت نے امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کا ذکر کیا ہے، امام شافعیؒ کی کتاب ''**الرسالة**'' اس موضوع کی پہلی کتاب کی شکل میں آج بھی موجود ہے؛ لیکن ابن قطلوبغا، علامہ موفق الدین، علامہ ابن ندیم اور علامہ ابن ہمام نے نقل کیا ہے کہ امام ابویوسفؒ کی تصنیف اس موضوع پر پہلی تصنیف ہے، موجودہ دور میں اس پر ایک واقعاتی شہادت بھی حاصل ہوگئی ہے، کہ علامہ ابوالحسین بصری معتزلی کی کتاب ''المعتمد فی أصول الفقہ'' جو طویل عرصہ سے مخطوطہ کی شکل میں تھی، زیورِ طبع سے آراستہ ہوگئی ہے اور اس میں کثرت سے امام ابویوسف کی کتاب سے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں۔

اس کے بعد یہ علم مسلسل ارتقا پذیر رہا اور تالیف کے اعتبار سے اس میں مختلف مناہج اختیار کئے گئے، جن میں ایک طریق ''**طريق الشافعية**'' یا ''**طريق المتكلمين**'' کہلاتا ہے، جس میں أصولِ قانون کو ان کی تطبیقات اور جزئیات سے قطع نظر کرتے ہوئے دلائل کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے، علامہ ابن حزم، علامہ ابوالولید باجی، علامہ ابواسحاق شیرازی، امام الحرمین جوینی، امام غزالی، امام رازی رحمہم اللہ وغیرہ جیسے اہل علم نے اس نہج پر اعلیٰ درجہ کی کتابیں تصنیف کی ہیں، دوسرا منہج وہ ہے جسے ''**طريقة الفقهاء**'' یا ''**طريقة الحنفية**'' کہتے ہیں، جس میں جزئیات کو بنیاد بنا کر أصول مقرر کئے جاتے ہیں اور اُصول اور ان کی جزئیات کے باہمی ربط کو واضح کیا جاتا ہے، امام ابوبکر جصاص رازی، قاضی ابوزید دبوسی، فخر الاسلام بزدوی اور شمس الائمہ سرخسی وغیرہ کی تالیفات اسی منہج پر ہیں —— اسی طرح ایک اور رجحان ان دونوں مناہج کی خوبیوں کو جمع کرتے ہوئے اُصولِ فقہ کی تالیف کا شروع ہوا، اس سلسلہ کی پہلی کاوش علامہ مظفر الدین ابن الساعاتی حنفی کی ہے، ان کے علاوہ علامہ تاج الدین عبدالوہاب سبکی، علامہ کمال الدین ابن ہمام وغیرہ کی تالیفات اس نہج پر اہم شمار کی گئی ہیں اور اسی طریقہ کو بعد کے ادوار میں زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

اس موقع پر ایک اور خدمت کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ آٹھویں صدی ہجری میں علم وتحقیق کے مطلع پر بدر منیر بن کر علامہ ابواسحاق شاطبی مالکی (م: ۷۹۰ھ) پیدا ہوئے اور انھوں نے اپنی مایۂ ناز تالیف ''الموافقات'' مرتب فرمائی، جس کا نام انھوں نے ابتداء ''**التعريف بأسرار**

التكليف'' رکھا تھا، انھوں نے اُصولِ فقہ کے مسائل کو بیان کرنے کے لئے ایک جدید اور نہایت منطقی اور دل پذیر اُسلوب اختیار کیا اور اپنی کتاب کے قابل لحاظ حصہ کا موضوع ''مقاصدِ شریعت'' کو بنایا اور اسے اس خوبی کے ساتھ پیش کیا کہ اس کتاب سے نہ صرف فقہ کے اُصول معلوم ہوتے ہیں؛ بلکہ احکام شریعت کی مصالح، اس کی عقل اور انسانی ضرورت سے ہم آہنگی اور زندگی کی فطری ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت بھی واضح ہوتی ہے۔

موجودہ دور میں اُصولِ فقہ کو اس انداز پر مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اہل سنت والجماعت کے تمام دبستانِ فقہ کا نقطۂ نظر سامنے آجائے، ایسی کوششوں میں شیخ ابوزہرہ، شیخ خضری بک، شیخ عبدالوہاب الخلاف اور ڈاکٹر وہبہ زحیلی کی کاوشیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ہندوستان کے علماء نے اُصولِ فقہ کے مقابلہ حدیث وفقہ کو زیادہ اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے؛ لیکن اُصولِ فقہ کے میدان میں بھی ان کی کاوشیں قابل لحاظ ہیں، اس سلسلہ میں خاص طور پر ملا عبدالحکیم سیالکوٹی (متوفی: ۱۰۶۶ھ) کی ''حاشیہ تلویح وتوضیح''، علامہ محب اللہ بہاری (متوفی: ۱۱۱۹ھ) کی ''**مسلم الثبوت**'' اور اس پر بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی (متوفی: ۱۲۲۵ھ) کی ''**فواتح الرحموت**''، نیز شاہ ولی اللہ دہلوی کی ''**اسباب الاختلاف**'' اور ''**عقد الجيد**'' مولانا عبدالحئ فرنگی محلی کے متعدد رسائل، شاہ اسماعیل شہید کی ''**اصول الفقه**'' نواب صدیق حسن خاں (متوفی: ۱۳۰۸ھ) کے قلم سے علامہ شوکانی کی ''**ارشاد الفحول**'' کی تلخیص ''**حصول المامول**'' اور ایک ہندوستانی مصنف کے قلم سے اُصول الشاشی کی شرح ''**فصول الحواشي**''، نیز محب گرامی مولانا عبیداللہ اسعدی کی ''**الموجز في أصول الفقه**'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اُردو زبان میں اُصولِ فقہ کے موضوع پر متعدد مختصر یا مفصل نیز نصابی اور مطالعاتی کتابیں موجود ہیں، جن میں اس حقیر کی تالیف ''آسان اُصولِ فقہ'' بھی شامل ہے۔

اس عہد میں اُصولِ فقہ کے موضوع پر جو گرانقدر خدمات انجام دی گئی ہیں، ان میں ایک قابل ذکر خدمت یہ ہے کہ اگرچہ کہ مقاصدِ شریعت کا موضوع بہت پہلے سے اُصولِ فقہ کا حصہ رہا ہے اور اس سلسلہ میں امام الحرمین، امام غزالی، علامہ عزالدین بن عبدالسلام وغیرہ کی تحریریں موجود ہیں، نیز بعد میں ـــــ اس کو جیسا کہ مذکور ہوا ـــــ علامہ ابواسحق شاطبی نے اوجِ کمال تک پہنچایا ہے؛ لیکن چوں کہ نئے مسائل کو حل کرنے میں مقاصدِ شریعت کی بڑی اہمیت ہے؛ کیوں کہ مقاصد کی حیثیت

دائمی اُصولوں کی ہے اور وہ شریعتِ اسلامی کے مزاج و مذاق کو ظاہر کرتے ہیں؛ اس لئے نئے مسائل کو حل کرنے میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے، اسی پس منظر میں موجودہ عہد کے بعض محقق علماء نے اس کو ایک مستقل فن کی حیثیت سے اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور نہایت گہرائی کے ساتھ اُصول وقواعد منقح کئے ہیں، اس سلسلے میں المعہد العالمی للفکر الاسلامی کی خدمات نمایاں اور قابل قدر ہیں؛ البتہ یہ کہنا مداہنت ہوگا کہ مقاصدِ شریعت کے حوالہ سے ماضی قریب میں جو اجتہادات سامنے آئے ہیں، وہ سب کے سب قابل قبول ہیں؛ کیوں کہ جو احکام نصوص میں مذکور ہوں اور ان کے بارے میں یہ صراحت نہیں ہو کہ وہ ایک مخصوص زمانہ کے لئے ہیں، تو ان کی حیثیت دین کی حدود اربعہ کی ہے اور وہ دائمی ہیں، مقاصدِ شریعت کے عنوان پر اس میں ترمیم نہیں ہوسکتی۔

حضرات! آج جس شہر میں آپ حضرات کا استقبال کیا جارہا ہے، وہ ہندوستان کا ایک علم خیز اور علم پرور خطہ رہا ہے، جسے ماضی میں ''بغدادِ ہند'' کہا جاتا تھا اور جس کے چپہ چپہ پر اسلامی ثقافت کی چھاپ اس طرح نمایاں تھی، جیسے کسی نیلگوں سمندر میں سورج کا عکس، محمد قلی قطب شاہ نے ۹۹۹ھ مطابق ۱۵۹۰ء میں اس شہر فرخندہ بنیاد کی خشت اول رکھی تھی اور دکنی اُردو میں اپنے خالق سے دُعاء کی تھی:

مرا شہر لوگوں سوں مامور کردے

شاید یہ قبولیتِ دُعاء کا وقت تھا، اسی لئے یہ دُعاء ایسی مقبول ہوئی کہ نہ صرف یہ بستی بسی اور یہ ویرانہ آباد ہوا؛ بلکہ یہاں سے علم وادب کے چشمے بھی پھوٹے اور ایک عالَم نے اس سے فیض حاصل کیا، قلی قطب شاہ کو خود اپنے اس انتخاب پر ایسا ناز تھا کہ بعد میں انھوں نے کہا:

لطیف و دل کشا آب و ہوائے
مبارک منزلے فرخندہ جائے

اس شہر نے صرف بانیٔ شہر ہی سے نہیں؛ بلکہ ہر دور میں مختلف اہل علم وادب سے خراج تحسین وصول کیا ہے، مشہور شاعر ذوق کے استاذ شاہ نصیر نے اس شہر کو بہشت قرار دیا، داغ کو یہ شہر یورپ کے حسن وآرائش میں مشہور شہر — پیرس — کا ہم پلہ نظر آتا ہے، کہتے ہیں:

نہیں حیدرآباد پیرس سے کچھ کم
یہاں بھی سجے ہیں مکاں کیسے کیسے

ہندوستان کے بڑے گرامی قدر علماء مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن خان

شیروانی، پروفیسر الیاس برنی، مولانا عبدالقدیر بدایونی، مولانا حافظ محمد احمد دیوبندی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا ابوالوفاء افغانی، مادحِ رسول ماہر القادری — رحمہم اللہ — اوران جیسی نہ جانے کتنی شخصیات ہیں جو یہاں خیمہ زن ہوئیں، اسی سرزمین میں علم وتحقیق اور شعروسخن کے چراغ جلائے اور دور دور تک اس کی روشنی پہنچی، اسی طرح فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ فاروقی بانی جامعہ نظامیہ، محدث دکن مولانا عبداللہ شاہ صاحب، تحریک اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، میدانِ تحقیق کے درِّ بے بہا ڈاکٹر حمید اللہ، مشہور واعظ مولانا حسام الدین فاضل اور سحر انگیز خطیب نواب بہادر یار جنگ — رحمہم اللہ — اسی سرزمین میں پیدا ہوئے اور یہیں سے ان کا چشمۂ فیض جاری ہوا۔

اس خطہ کو داعیانِ اسلام اور صوفیاءِ ذی احترام حضرت شاہ خاموش، شیخ مخدوم علاء الدین انصاری، شیخین یوسفین اور بابا شرف الدین — رحمہم اللہ — جیسے اہل دل کا مسکن بننے کا شرف بھی حاصل ہوا، یہیں سے اُردو زبان کے ابتدائی دو اصحاب دیوان شعراء — محمد علی قطب شاہ اور ولی دکنی — کا نغمۂ جاں فزا بلند ہوا اور اُردو شاعری کی بنیاد پڑی، امجد حیدرآبادی جیسے مصلح اور مخدوم محی الدین جیسے انقلابی، نیز منفرد لب ولہجہ کے شاعر شاذ تمکنت اسی ارض ادب کی پیداوار میں سے ہیں، خاص کر اُردو نظم وغزل اور مزاح میں اس شہر کی ہمیشہ سے ایک شناخت رہی ہے اور اس گئے گزرے دور میں بھی اس کی یہ شناخت باقی ہے۔

اسی شہر میں دائرۃ المعارف العثمانیہ کی ۱۹۲۳ء میں بنیاد پڑی، جس کے محرک فضیلت جنگ حضرت مولانا انوار اللہ فاروقی تھے، اس ادارہ نے ایک سو چھبیس سال کے عرصہ سے میں ایک سو ستر کتابوں کو آٹھ سو جلدوں میں شائع کیا ہے، ۲۲ رجلدوں میں ابوالحسن ابراہیم بقاعی کی نادر تفسیر "**نظم الدرر فی تناسب الآیات و السور**" اُصول حدیث پر لکھی گئی ابتدائی تالیفات "**الکفایة فی علم الروایه للخطیب البغدادی**" اور "**معرفة علوم الحدیث للحاکم النیشابوری**" حدیث میں علامہ متقی ہندی کی "کنز العمال" علامہ حاکم نیشاپوری کی "**المستدرک علی الصحیحین**" علامہ ابوبکر بیہقی کی "**السنن الکبریٰ مع الجوهر النقی لابن الترکمانی**" ابوالمؤید خوارزمی کی "**جامع مسانید الامام الأعظم أبی حنیفة**" امام ابوجعفر طحاوی کی "**مشکل الآثار**" رجال و اسانید میں "**الاستیعاب لابن عبد البر ، تذکرة الحفاظ للذهبی ، تهذیب**

التهذيب لابن حجر''امام بخاری کی''**التاريخ الكبير**''مولانا عبدالحئیؒ حسنی کی''**نزهة الخواطر**''سیرت نبوی میں علامہ جلال الدین سیوطی کی''**الخصائص الكبرى**''فقہ میں امام محمد کی ''**كتاب الأصل**''اور مختلف اسلامی وعربی علوم وفنون میں نہ جانے کتنی اہم کتابیں ہیں، جو پہلی بار اسی ادارے سے شائع ہوئیں اور اصحابِ علم وتحقیق کی آنکھوں کا سرمہ بنیں۔

یہیں دارالترجمہ قائم تھا، جس میں اسلامی وسائنسی علوم اور تاریخ وقانون وغیرہ کی سینکڑوں کتابوں — جو عربی اور یورپی زبانوں میں تھیں — کو اُردو کا جامہ پہنایا گیا، اب افسوس کہ یہ عظیم اُردو ذخیرہ آخر تعصب کی بھینٹ چڑھ گیا اور کچھ شرپسندوں نے اس عظیم علمی امانت کو نذرِ آتش کر کے تاتاریوں کی علم دشمنی کی تاریخ کو تازہ کر دیا، یہ شہر اپنے کتب خانوں کے لئے بھی مشہور رہا ہے اور یہاں کی مخطوطات کی لائبریری اسلامی اور عربی مخطوطات کی کثرت کے اعتبار سے خدا بخش لائبریری پٹنہ کی ہم پلہ ہے اور دنیا کی منتخب لائبریریوں میں اس کا شمار کیا جاتا ہے، آج بھی اس شہر میں متعدد بیش قیمت لائبریریاں موجود ہیں، یہیں اُردو کی پہلی یونیورسٹی عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا، افسوس کہ انڈین یونین کے انضمام کے بعد اس کا لسانی کردار ختم کر دیا گیا، اُردو کی دوسری یونیورسٹی مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی بھی آج اسی شہر میں قائم ہے، یونیورسٹیاں، ماڈرن ایجوکیشن کے اقلیتی اداروں اور دینی مدارس وجامعات کی کثرت، موجودہ حالات میں بھی اس شہر کی پہچان ہیں، الغرض کہ حیدرآباد کی عظمت رفتہ پر اگرچہ کہ عداوت وعناد کے گہرے زہر آلود تیر آزمائے گئے؛ لیکن اس شہر نے ایک نئی صبح اور نئی زندگی کے ساتھ کروٹ لی ہے اور آج نہ صرف ہندوستان؛ بلکہ دنیا کے نقشہ پر اس کی ایک پہچان ہے۔

حضرات! اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا جو اس پروگرام کی اصل داعی ہے، کا قیام فقیہ الامت حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے ہاتھوں بیس سال پہلے عمل میں آیا، عصر حاضر میں پیدا ہونے والے فقہی مسائل کا شریعت کی روشنی میں حل تلاش کرنا، اجتماعی غور وفکر کے ذریعہ ایسے مسائل کے بارے میں اُمت کی رہنمائی کرنا، نوجوان فضلاء کی فقہی وعلمی تربیت کرنا اور جدید فکری اور فقہی مسائل پر مستند اور معیاری لٹریچر فراہم کرنا، نیز ہندوستان اور عالم اسلام کے علماء اور علمی اداروں کی خدمات سے ایک دوسرے کو واقف کرانا اس ادارہ کے اہم مقاصد ہیں؛ چنانچہ نئے مسائل کے حل کے لئے اکیڈمی نے اب تک اٹھارہ عالمی سطح کے سیمینار کئے ہیں، جن میں ڈیڑھ سو سے زیادہ فقہی

فیصلے کئے گئے، ان فیصلوں کو نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام میں بھی قدر و وقعت کی نظر سے دیکھا گیا ہے، تربیتی نقطۂ نظر سے اس نے ملک کے مختلف علاقوں میں ۲۴ پروگرام رکھے ہیں، جن سے دینی مدارس اور عصری درسگاہوں کے سینکڑوں فضلاء نے استفادہ کیا ہے، اس نے اہم ترین علمی و فقہی موضوعات پر تقریباً سو کتابیں شائع کی ہیں اور کویت سے شائع ہونے والی عظیم الشان فقہی موسوعہ کی ۴۵ جلدوں کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے اور اکیڈمی کے مختلف سیمیناروں کے مقالات کے تیس سے زیادہ مجموعے طبع ہو چکے ہیں اور تقریباً اتنے ہی باقی ہیں، جو اُردو زبان میں عصر حاضر کے فقہی مسائل پر ایک انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتا ہے، اس کے سیمیناروں میں ہندوستان، عالم اسلام اور عالم عرب کے منتخب وممتاز علماء کی شرکت ہوتی رہی ہے اور اس کی انتظامیہ بھی ملک کے جید فقہاء و اصحابِ افتاء پر مشتمل ہے، اس وقت آپ جس پروگرام کا افتتاح کر رہے ہیں، وہ بھی ایسی ہی کاوشوں کا ایک حصہ ہے۔

حضرات ! المعہد العالی الاسلامی اکیڈمی کا شکر گذار ہے کہ اس نے اسے اس اہم پروگرام کی میزبانی کا موقع دیا اور حیدرآباد جیسے علمی، ادبی اور ثقافتی شہر —— جو شمال وجنوب کے سنگم کی حیثیت رکھتا ہے —— کا اس اہم پروگرام کے لئے انتخاب کیا، یہ ادارہ فضلاء مدارس کی تربیت اور افراد سازی کے جذبہ کے تحت قائم ہوا ہے، اس ادارہ کا بنیادی ہدف یہ ہے کہ علماء جس میدان میں کام کریں، اس میں بہتر کارکن ثابت ہوں، خواہ وہ تدریس و تعلیم کا میدان اختیار کریں، لوح و قلم کو اپنی خدمت کا وسیلہ بنائیں، دعوت دین کا فریضہ انجام دیں، صحافت کا راستہ اختیار کریں، منبر و محراب کو زینت بخشیں، تنظیمی کاموں کا حصہ بنیں، اسلام پر ہونے والی فکری یلغار کا جواب دیں، اسلامی مالیاتی اداروں میں رہنمائی کے منصب پر فائز ہوں، جہاں ہوں اور جس کام میں ہوں، وہاں امتیازی حیثیت کے حامل ہوں اور اس کام کو بصیرت، شعور، زمانہ شناسی، دردمندی اور سلیقہ شعاری کے ساتھ انجام دیں۔

بحمد اللہ معہد ان مقاصد کی طرف بتدریج بڑھ رہا ہے، اب تک یہاں سے ۴۳۹ فضلاء نے تربیت حاصل کی ہے، جن میں ایک بڑی تعداد دینی و عصری درسگاہوں میں مختلف مراحل کی تدریس سے وابستہ ہے، تقریباً تیس فضلاء افتاء اور قضاء کی خدمت انجام دے رہے ہیں، ایک درجن سے زیادہ فضلاء وہ ہیں جو اُردو اور انگریزی صحافت سے وابستہ ہیں، چند وہ بھی ہیں جو اسلامی طرز پر کام کرنے والے مالیاتی اداروں میں شرعی رہنمائی پر مامور ہیں اور ایک بڑی تعداد ماشاء اللہ ان فضلاء کی ہے، جو اپنے اپنے زیر اثر علاقوں میں برادرانِ وطن میں دعوتِ دین کا فریضہ انجام دے رہے

ہیں، اس دس سال کے عرصہ میں قرآنیات، حدیث، فقہ اور دعوت کے متعلق عصری مسائل پر زیر تربیت فضلاء نے جو کام کئے ہیں وہ ۱۱۶ موضوعات پر ہیں اور تقریباً پچاس ہزار صفحات پر مشتمل ہیں، یہ مقالات اُردو، عربی، انگریزی، ہندی، تلگو اور بنگلہ میں لکھے گئے ہیں اور بحمد اللہ نہ صرف ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے فضلاء مدارس یہاں رُجوع ہوتے ہیں؛ بلکہ امریکہ، برطانیہ اور ساؤتھ افریقہ تک اس ادارہ کا فیض پہنچ چکا ہے۔

اس وقت ایک ایسے مالیاتی نظام کی ضرورت ہے، جو سود و قمار اور شرعی و اخلاقی قباحتوں سے خالی ہو، یہ نہ صرف اسلامی نقطۂ نظر سے ضروری ہے؛ بلکہ اشتراکیت کی ناکامی، سرمادارانہ نظام کی زبوں حالی، دولت کی تقسیم کے بجائے اس کے ارتکاز کا بڑھتا ہوا رجحان اور محنت کاروں کے ساتھ ظلم و ناانصافی کے پس منظر میں انسانی نقطۂ نظر سے بھی اسلامی نظام معیشت کا قیام بہت بڑی ضرورت ہے، اس وقت ایسے علماء اور مسلمان معاشی ماہرین کی ضرورت ہے جو ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام کے نقصانات اور اسلامی نظامِ معیشت کی نافعیت کو واضح کریں اور دوسری طرف اسلامی طرز پر مالیاتی اداروں کی رہنمائی کرسکیں، اسی مقصد کے تحت المعہد العالی الاسلامی فارغین افتاء کے لئے اسلامک فائنانس کا کورس شروع کررہا ہے اور چاہتا ہے کہ جولائی ۲۰۱۰ء سے معاشیات پڑھے ہوئے عصری اداروں کے طلبہ کے لئے بھی اس کورس کا آغاز کرے، چنانچہ آج کے اس اجلاس سے فارغین افتاء کے لئے رسمی طور پر اسلامک فائنانس کا آغاز کیا جارہا ہے۔

اخیر میں صدر اجلاس کے ہم شکرگزار ہیں کہ جن کے ذریعہ اس پروگرام کو رونق حاصل ہورہی ہے، ہم اپنے عرب مہمانوں — ڈاکٹر صلاح سلطان، ڈاکٹر عبدالمجید سوسوا اور ڈاکٹر مسفر قحطانی — کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں، جنھوں نے اکیڈمی کی دعوت پر سفر کی زحمت گوارا کی اور ہندوستان کے نوجوان اساتذۂ فقہ اور منتہی طلبہ کو استفادہ کا موقع دیا، ہم مہمانانِ خصوصی کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ یہاں تشریف لائے اور آپ تمام شرکاء اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے اساتذہ و طلبہ کے بھی شکرگزار ہیں کہ آپ نے ہماری حقیر آواز پر لبیک کہا اور سب سے بڑھ کر حمد و ستائش اور شکر و سپاس اللہ کے لئے ہے کہ :

جو کچھ ہوا ہے ، ہوا ہے کرم سے تیرے
جو بھی ہوگا ، تیرے کرم سے ہوگا

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين ۔

عصر حاضر کے شرعی مسائل کے حل کا طریقۂ کار☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين وعلى آله واصحابه أجمعين ، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أما بعد ۔

صدر عالی قدر، بزرگانِ محترم، علماء کرام اور دانشوران ذی احترام! یہ ایک تاریخی دن ہے، جب ہم دوآبہ کی علم خیز اور گل ہائے معرفت سے عطر بیز خطہ کے ایک تاریخی شہر امروہہ میں خیمہ زن ہیں اور ہم لوگوں کا یہاں جمع ہونا احکام شریعت کی تحقیق اور ملتِ اسلامیہ کی رہنمائی کے لئے ہے؛ اس لئے انشاء اللہ آپ حضرات کا یہ سفر کرنا اور دور دراز علاقوں سے یہاں تک پہنچنا ایک مبارک عمل اور ایک مسعود کوشش ہے اور اجر وثواب کا باعث ہے؛ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

حضرات ! ہم سب کا اس بات پر ایمان ہے کہ ہمارے آقا ومولیٰ جناب محمد رسول اللہ ﷺ سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہیں، نبوت بھی آپ پر ختم ہو چکی اور کمالات نبوت بھی آپ پر تمام ہو چکے، آپ کے بعد اگر کوئی شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے یا ایسے مدعی کا ذب کی تصدیق کرتا ہے تو وہ دائرہ ایمان سے باہر ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نبوت کے ختم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وحی کے اُترنے کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اب کوئی آسمانی کتاب یا نئی شریعت نہیں آسکتی؛ لیکن کارہائے نبوت اب بھی باقی ہیں اور ان کا سلسلہ قیامت تک باقی رہے گا۔

یہ کارہائے نبوت جو اَب اُمت سے متعلق ہیں، بنیادی طور پر تین قسم کے ہیں، اول: دعوت یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر — یہ فریضہ پوری اُمت سے متعلق ہے: ''**كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ**'' (آل عمران: ۱۱۰) یہ فریضہ اُمت کے ہر فرد کو اپنے علم اور اپنی صلاحیت کے اعتبار سے ادا کرنا واجب ہے ''**بلغوا عني ولو آية**'' (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳۴۶۱) نیز ہر فرد پر اس کی قوت وطاقت کے لحاظ سے اس کی ادائیگی

☆ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے تحت جامعہ اسلامیہ امروہہ میں منعقدہ: ۲۲ رویں فقہی سیمینار میں یہ کلیدی خطبہ پیش کیا گیا۔

ضروری ہے: ''**من رأى منكم منكرا فليغيره بيده و إن لم يستطع فبلسانه و إن لم يستطع فبقلبه**''۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۵۲)

دوسری ذمہ داری دین میں پیدا ہونے والے فکری انحراف کی کوششوں کا مقابلہ کرنا اور اسلامی تعلیمات کو بے آمیز طریقے پر باقی رکھنا ہے، حدیث نبوی میں اس کو ''تجدید'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے :

إن الله عزوجل يبعث لهذه الأمة على رأس كل مائة من يجدد لها دينا۔ (سنن ابی داود، کتاب الملاحم، حدیث نمبر: ۴۲۹۱)

''من'' کے لفظ کے عموم کو ملحوظ رکھتے ہوئے اہل علم نے لکھا ہے کہ مجدد ایک فرد بھی ہوسکتا ہے اور ایک جماعت بھی ہوسکتی ہے، نیز کار تجدید میں جو باتیں شامل ہیں وہ ایک اور حدیث سے واضح ہوتی ہیں، جو رسول اللہ ﷺ سے ارسالاً نقل کی گئی ہے :

يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين و انتحال المبطلين و تأويل الجاهلين۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی: ۱۰/ ۲۰۹)

چنانچہ یہ رسول اللہ ﷺ کا معجزہ ہے اور آپ ﷺ پر سلسلۂ نبوت کے ختم ہونے اور قیامت تک انسانیت نبوت محمدی کے زیر سایہ باقی رہنے کی دلیل ہے کہ اس اُمت میں ہمیشہ مجددین و مصلحین پیدا ہوتے رہے اور انھوں نے دین متین کو ہر طرح کی لفظی و معنوی تحریف سے محفوظ رکھا، قراء و محدثین نے تحریف لفظی سے شریعت کی حفاظت کی اور فقہاء و متکلمین نے تحریف معنوی سے شریعت کی پاسبانی کی۔

تیسرا کام ہر دور میں پیدا ہونے والے مسائل سے متعلق حکم شرعی کی وضاحت ہے، جس کو حدیث میں ''اجتہاد'' سے تعبیر کیا گیا ہے :

إذا حكم الحاكم فاجتهد ثم أصاب فله أجران و إذا حكم فاجتهد ثم أخطأ فله أجر۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۷۳۵۲)

پھر آپ نے اس اجتہاد کی بنیادیں بھی واضح فرمادیں جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی اس سے متعلق معروف روایت ہے، جس میں کتاب اللہ، سنت رسول اور اجتہاد کا ذکر آیا ہے، اگر کسی اجتہاد پر اتفاق ہوجائے تو وہ اجماع ہے اور اگر اتفاق نہیں ہوسکا تو یہ قیاس ہے، استحسان مصالح مرسلہ، سد ذریعہ،

عرف اور استصحاب وغیرہ اگرچہ الگ الگ مصادر شمار کئے گئے ہیں؛ لیکن سب کی بنیاد دراصل احکام کی علتوں اور مصلحتوں پر ہے، اس لحاظ سے گویا یہ قیاس ہی کی مختلف شکلیں ہیں، جن کو اپنی خصوصی نوعیت کے لحاظ سے الگ الگ نام دیا گیا ہے، ان مصادر میں فرق یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول کی حیثیت ''مُثبِت حکم'' ہونے کی ہے اور قیاس کی حیثیت ''مُظہِرِ حکم'' ہونے کی ہے؛ اسی لئے اہل علم لکھتے ہیں کہ ''**القیاس مظهر لا مثبت**''یعنی اسلامی قانون کا اصل سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے ''**إِنِ الْحُكْمُ إِلاَّ لِلّٰهِ**'' (یوسف: ۴۰) قیاس کسی حکم کو وجود میں نہیں لاتا؛ بلکہ شارع کا منشاء —— جو لوگوں کی نظر سے مخفی ہے —— اسے ظاہر کر دیتا ہے۔

قیاس و اجتہاد کی ضرورت اس لئے ہے کہ نصوص محدود ہیں، جن میں سے بعض میں کسی عمل کی شکل اور اس کے مقصد دونوں کو واضح کر دیا گیا اور بعض میں اُصول و مقاصد کی رہنمائی پر اکتفاء کیا گیا ہے؛ لیکن ہر دور میں پیش آنے والے حوادث و نوازل بے شمار ہیں، فقہاء کے الفاظ میں: ''**الاصول محدودة والحوادث ممدودة**'' (اصول السرخسی: ۱/۱۰) نیز یہ قول علامہ ابن خلدون: ''**الوقائع المتجددة لا توفی بها النصوص**'' (مقدمہ: ۴۴۵)؛ لیکن اجتہاد کے بھی مختلف درجات ہیں، جو اپنے اپنے عہد کی ضرورت کے لحاظ سے اختیار کئے گئے ہیں۔

چوتھی صدی ہجری کے بعد اجتہادِ مطلق کا سلسلہ بند ہو گیا؛ اس لئے نہیں کہ کسی خاص فقیہ نے یا کچھ فقہاء نے مل کر اس دروازہ کو بند کر دیا ہے؛ کیوں کہ جس دروازے کو رسول اللہ ﷺ نے کھولا ہو، اسے اُمت کا کوئی فرد یا کچھ افراد مل کر کیسے بند کر سکتے ہیں؛ بلکہ اس لئے کہ اجتہادِ مطلق کی ضرورت باقی نہیں رہی اور جب کوئی کام مکمل ہو جاتا ہے تو پھر اس کام کو کرنا عبث ہوتا ہے، سلف صالحین کے یہاں اس سلسلے میں بہت سی صراحتیں موجود ہیں؛ چنانچہ علامہ زرکشی مشہور شافعی فقیہ علامہ رافعی سے نقل کرتے ہیں:

الخلق كالمتفقين على أن لا مجتهد اليوم ـ (۱)

اسی طرح نجم الدین ابن حمدان حنبلی (متوفی: ۶۹۵ھ) فرماتے ہیں:

إن المجتهد المطلق قد عدم من زمن طويل الخ ـ (۲)

(۱) دیکھئے: **البحر المحيط**: ۶/۲۰۷، **ارشاد الفحول**: ۲۵۳۔

(۲) **صفة الفتویٰ والمفتی والمستفتی**: ۱۷۔

اور امام نوویؒ کا بیان ہے :

ومن دهر طويل عدم الفتى المستقل وصارت الفتوى الى المنتسبين إلى أئمة المذاهب المتبوعة ۔(۱)

علامہ سیوطیؒ جو ابتداءً خود اجتہاد کے مدعی تھے، انھیں بھی اعتراف ہے کہ :

إن المفتى المجتهد المستقل الذى استقل بقواعد لنفسه يبنى عليها الفقه خارجا عن قواعد المذاهب المقررة قد فقد من دهر ؛ بل لو أراده الإنسان اليوم لا متنع عليه ، ولم يجز له ، نص عليه غير واحد ۔ (۲)

اسی لئے چوتھی صدی ہجری کے بعد اُمت کے سوادِ اعظم نے ائمہ اربعہ کی تقلید کی راہ اختیار کی اور دین کو نفس پرستی سے بچانے کے لئے اسی کو مؤثر ذریعہ قرار دیا، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ جن کی وسیع الفکری اور فراخ مشربی معروف ہے، رقمطراز ہیں :

منها أن هذه المذاهب الأربعة أو من يعتد منها على جواز تقليدها إلى يومنا هذا وفى ذٰلک من المصالح مالا يخفى ، بما فى هذه الأيام التى قصرت فيها الهمم جدا أو أشربت النفوس الهوىٰ وأعجب كل ذى رأى برأيه ۔(۳)

خود علامہ اقبالؒ جیسے روشن خیال اور دیدہ ور صاحبِ نظر کو کہنا پڑا :

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط — قوم را برہم ہمی پیچد بساط
زاجتہاد عالمانِ کم نظر — اقتداء بر رفتگاں محفوظ تر

علامہ اقبالؒ ایک اور موقع پر تقلید کو اُمت کی جمعیت کے قائم رہنے کا رمز قرار دیتے ہیں :

مضمحل گردد چوں تقویم حیات — ملت از تقلید می گیرد ثبات
راہِ آباء رو کہ ایں جمعیت است — معنیٔ تقلید ضبط ملت است

(۱) آداب الفتوى والمفتى والمستفتى: ۲۵۔

(۲) الرد على من اخلد الى الارض: ۱۳۰-۱۱۲۔

(۳) حجة الله البالغة مترجم: ۱/ ۳۷۶۔

البتہ اجتہاد کی ایک قسم باقی ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ مجتہد کو بنیادی طور پر چار کام کرنے پڑتے ہیں :

(۱) اگر نص میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال ہو تو شارع کے مقصد و منشاء کی تعیین۔

(۲) اگر نصوص میں بظاہر تعارض محسوس ہو تو تعارض کو دور کرنا، خواہ دونوں میں تطبیق پیدا کی جائے، یا ایک کو ناسخ دوسرے کو منسوخ سمجھا جائے، یا ایک کو راجح دوسرے کو مرجوح قرار دیا جائے۔

(۳) جو نصوص تعبدی ہیں، ان میں حکم کی علت متعین کرنا۔

(۴) جو واقعات پیش آئیں، ان پر اس علت کو منطبق کرنا۔

مجتہد مطلق بنیادی طور پر ان میں سے پہلے تین اُمور کو انجام دیتا ہے اور یہ تین اُمور وہ ہیں کہ سلفِ صالحین ان سے فارغ ہو چکے ہیں، نصوص کے مفہوم کی تعیین، ان کی تحقیق اور ان سے علت کے استنباط و استخراج کی خدمت اتنے بڑے پیمانے پر انجام پا چکی ہے کہ اب اس میں اضافہ کی بہت کم گنجائش باقی رہ گئی ہے؛ البتہ چوتھا کام یعنی ہر عہد میں پائے جانے والے مسائل پر نصوص میں مصرح یا مستنبط علت کی تطبیق وہ عمل ہے، جو قیامت تک جاری رہے گا، اسی کو فقہاء نے تخریج مسائل یا ''تحقیق مناط'' سے تعبیر کیا ہے ؛ کیوں کہ قیاس و اجتہاد کا عمل تین مرحلوں سے گذرتا ہے : تخریج مناط، تنقیح مناط اور تحقیق مناط، ان میں تخریج و تنقیح کا تعلق علت کے استخراج و استنباط سے ہے اور تحقیق مناط کا تعلق علت کی تطبیق سے ہے؛ چنانچہ علامہ آمدیؒ فرماتے ہیں :

اما تحقيق المناط فهو النظر فى معرفة وجود العلة فى آحاد الصورة بعد معرفتها فى نصها سواء كانت معروفة بنص أو إجماع أو إستنباط ۔ (الإحكام فى اصول الأحكام للآمدى: ۳/۳۳۵)

پس ''تحقیق مناط'' اجتہاد کی ایک ایسی قسم ہے، جو قیامت تک باقی رہے گی ؛ کیوں کہ یہ رسول اللہ ﷺ پر ختم نبوت اور شریعت کی ابدیت و دوام کا لازمی تقاضا ہے۔

البتہ اس کام کو انفرادی طور پر انجام دینے سے بہتر ہے کہ اجتماعی طور پر انجام دیا جائے ؛ کیوں کہ افراد میں پائی جانے والی کمیاں ایک دوسرے سے پوری ہوتی ہیں ؛ کیوں کہ حکم صحیح تک پہنچنے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں، ایک : علم، دوسرے : تقویٰ، علم نہ ہو تو انسان نادانستہ غلطی کرتا ہے اور تقویٰ نہ ہو تو انسان دانستہ غلطیوں کا مرتکب ہوتا ہے، جب کسی حکم کی تحقیق میں متعدد افراد کی شمولیت

ہوتو یہ کمیاں پوری ہوجاتی ہیں ؛اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ایسے مسائل میں فقہاء اور عابدین سے مشورہ کرنے کا حکم فرمایا: ''**تشاوروا الفقهاء والعابدين**''۔(مجمع البحرین:۲۲۵)

محترم حضرات ! اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے عصر حاضر میں نئے شرعی مسائل پر اجتماعی غور وفکر کے سلسلہ میں بڑی اہم کاوشیں انجام پا رہی ہیں ، عالم عرب میں مجمع الفقہ الاسلامی الدولی جدہ ، مجمع الفقہ الاسلامی ، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ ، مجمع الفقہ الاسلامی سوڈان ، مجمع الفقہ الاسلامی الجزائر ، نیز مغربی ملکوں میں اسلامی یورپی کونسل برائے افتاء اور مجمع الفقہاء امریکہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ، اگرچہ آخر الذکر دونوں مجامع فقہیہ کا منہج فکر کہیں کہیں جمہور کے موقف سے ہٹا ہوا ہوتا ہے۔

اگر ہندوستان میں فقہی مسائل پر اجتماعی غور وفکر کا جائزہ لیا جائے تو اس کا نقطۂ آغاز فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کو قرار دیا جاسکتا ہے ، جس کام کو حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ نے پورے ملک سے منتخب علماء کی ایک کمیٹی بنا کر کرایا تھا ، اس طرح فقہ حنفی کا ایک ایسا انسائیکلو پیڈیا وجود میں آیا کہ جامعیت ، جزئیات کی کثرت اور وسعت کے اعتبار سے اس کی نظیریں کم ہی مل پائیں گی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کا سورج غروب ہونے کے بعد اس طرح کی پہلی کوشش حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمائی اور اسی کوشش کے نتیجہ میں ''الحیلۃ الناجزۃ'' مرتب ہوئی ، اسی طرح حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ کی مساعی سے ''انفساخ نکاح مسلم ایکٹ'' کی ترتیب عمل میں آئی ، جس میں ملک کے مختلف اہل علم کی آراء سے استفادہ کیا گیا۔

ہندوستان میں غالباً اس سلسلے کی پہلی باضابطہ اور منظم کوشش حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تحریک پر ندوۃ العلماء کے زیر اہتمام شروع ہوئی اور ۱۹۶۳ء میں ''مجلس تحقیقات شرعیہ'' کا قیام عمل میں آیا ، اس مجلس کے پہلے ذمہ دار حضرت مولانا محمد اسحاق سندیلویؒ تھے ، ان کے پڑوسی ملک منتقل ہوجانے کے بعد نامور عالم دین حضرت مولانا محمد برہان الدین سنبھلی مدظلہٗ اس کے ذمہ دار مقرر ہوئے ، اس مجلس نے انشورنس ، رؤیت ہلال اور نس بندی جیسے موضوعات پر اجلاس منعقد کئے اور ہندوستان کے موجودہ حالات کے تناظر میں نہایت اہم فیصلے کئے گئے ، اس سلسلے کی دوسری کوشش جمعیۃ علماء ہند کے تحت اور مشہور فقیہ وصاحب نظر مصنف حضرت مولانا محمد میاں صاحب دیوبندیؒ کے

زیر نگرانی ہوئی، جب ۱۹۷۰ء میں ''ادارہ المباحث الفقھیہ'' کا قیام عمل میں آیا اور تاحیات آپ اس کے ذمہ دار رہے، آپ نے رؤیت ہلال، حق تالیف کی بیع اور کوآپریٹو اداروں وغیرہ موضوعات پر غور وخوض کے لئے علماء وارباب افتاء کو جمع کیا اور ان مسائل پر اہم فیصلے کئے گئے، حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ کی وفات کے بعد ملت اسلامیہ کے بلند نگاہ قائد حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ نے ۱۹۹۰ء میں اس کی نشأۃ ثانیہ فرمائی، اس کے بعد سے غالباً چار یا اس سے زیادہ فقہی اجتماعات منعقد ہو چکے ہیں اور انشاء اللہ جون میں اس سلسلے کا اگلا اجتماع منعقد ہوگا، یقیناً جدید مسائل کے حل میں اس ادارہ کی خدمات بھی نمایاں اور قابل تحسین ہیں۔

سامعین کرام! ممتاز فقیہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کا احساس تھا کہ نئے مسائل کے پیدا ہونے کی رفتار بہت تیز ہے؛ اس لئے اس کام کے لئے کوئی ایسا ادارہ ہونا چاہئے، جس کا مقصد ہی نئے فقہی مسائل کو حل کرنا ہو، یہ کام ضمنی طور پر انجام نہ دیا جائے؛ بلکہ یہی اس کا اصل ہدف ہو؛ چنانچہ انھوں نے ہندوستان کے ممتاز اہل علم کو ساتھ لے کر ۱۹۸۹ء میں مجمع الفقہ الاسلامی ہند (اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا) کی بنیاد رکھی، جو ہر سال سالانہ فقہی سیمینار منعقد کرتی ہے اور آج اس کے بائیسویں اجلاس میں آپ حضرات شریک ہیں۔

محترمانِ ما! اس سیمینار میں تین نہایت اہم موضوعات زیر بحث ہیں، ایک الیکشن سے مربوط مسائل ہیں، الیکشن جمہوری نظام کے لوازم میں ہے، اس سے پُرامن انقلاب اور صالح تبدیلی کے لئے راستہ فراہم ہوتا ہے، ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، الیکشن میں شرکت کی غیر معمولی اہمیت ہے، اس طرح ہم اپنی آواز ایوانِ قانون میں پہنچا سکتے ہیں، ملک کی داخلہ اور خارجہ پالیسی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، نیز اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لئے کوششیں کر سکتے ہیں، ایک طرف الیکشن میں حصہ لینے سے بہت سی مصلحتیں متعلق ہیں، دوسری طرف بعض مفاسد ہیں، جو اس کا جزو بن چکے ہیں اور وہ یقینا اسلامی تعلیمات کے مغائر ہیں، ہمیں ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے فقہاء کے اُصول کے مطابق ''**اھون البلیتین**'' کا انتخاب کرنا ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ چوں کہ اسلام کا آئیڈیل نظام حکومت ''خلافتِ راشدہ'' کا عرصہ رسول اللہ ﷺ کے بعد تیس سال ہی رہا، اموی، عباسی اور اس کے بعد عجمی نژاد حکومتوں نے اسلام کے نظام سیاست کو اختیار نہیں کیا اور فطری بات ہے کہ جو چیز عمل میں نہیں ہوتی ہے، اس کی تفصیلات وجزئیات پر بحث بھی کم ہوتی ہے؛ اسی لئے

فقہاء کے یہاں عبادات، مناکحات اور معاملات پر تو بے شمار کتابیں بھی ملتی ہیں اور جزوی تفصیلات بھی، اسی طرح نظامِ قضاء پر اتنی کتابیں لکھی گئیں کہ اگر وہ سب مخطوطات کے ذخیروں سے مطبوعات کے سفینوں تک کا سفر طے کرلیں اور وہ ساری کتابیں یکجا کردی جائیں تو ایک اچھا خاصا کتب خانہ بن سکتا ہے؛ لیکن احکام سلطانیہ پر یا بین قومی تعلقات جو — ''سِیَر'' کے تحت آتا ہے — کی کتابوں کو شمار کیا جائے، تو انھیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے، ضرورت ہے کہ موجودہ دور میں جب کہ عالم اسلام ایک زبردست سیاسی تموج سے گزر رہا ہے اور جب دنیا میں تقریباً پچاس فیصد مسلمان ''غیر مسلم اکثریت جمہوری ممالک'' میں اقلیت کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں، علماء اس موضوع پر خصوصی توجہ فرمائیں اور احکام شرعیہ کی وضاحت کریں؛ کیوں کہ شریعت کے بہت سے احکام یہاں تک عبادات کے مسائل بھی اسلام کے نظامِ سیاست سے مربوط ہیں اور یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ مسلمان اس شعبہ کو شریعت سے آزاد نہ سمجھ لیں۔

دوسرا موضوع بیع بالوفاء کا ہے، اگرچہ اس پر متاخرین فقہاء گفتگو کرتے رہے ہیں اور اہل علم بھی اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ فقہاء حنفیہ میں علماء بلخ اور خوارزم کا نقطۂ نظر عام اہل علم سے مختلف رہا ہے؛ لیکن یہ تعامل بڑے اور متوسط شہروں میں اس وقت اتنا زیادہ ہے کہ شاید اس سے پہلے نہیں رہا ہو، اس پر غور کرتے ہوئے اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ عقود و معاملات میں ایک طرف ظاہری شکل کی بھی اہمیت ہوتی ہے اور زیادہ تر اسی بنیاد پر حکم لگتا ہے، یہاں تک کہ نکاح تحلیل وغیرہ میں بھی فقہاء نے اس پہلو کو ملحوظ رکھا ہے، دوسری طرف مقاصد کو بھی عقود میں خاص اہمیت حاصل ہے، بیع عینہ اور بعض اہل علم نے تورق کو جو منع کیا ہے، یا ایسی چیزوں کی بیع کو منع فرمایا ہے جن کی اصل سے معصیت متعلق نہ ہو؛ لیکن خریدار کی نیت معصیت کی ہو، ان سب کی بنیاد مقاصد پر ہے، بیع بالوفاء اپنی شکل کے اعتبار سے ایک مشروع عقد کے تقاضے کو پورا کرتی ہے؛ لیکن مقصد کے اعتبار سے رباء کا شبہ بھی پیدا ہوتا ہے، ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔

سیمینار کا تیسرا موضوع ''صکوک'' یعنی اسلامی باؤنڈز کا ہے، جس کا استعمال موجودہ دور میں اسلامی بینک کیا کرتے ہیں، باؤنڈز کی مروجہ شکل میں روپے کا روپے سے تبادلہ ہوتا ہے، جس پر بیع صرف کے احکام جاری ہوتے ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس میں ربوا نساء بھی ہے اور ربوا تفاضل بھی؛ لیکن اسلامک بینک جو صکوک جاری کرتے ہیں، ان میں روپے کا تبادلہ اشیاء سے ہوتا ہے

اوران کے پیچھے کوئی عین یا عین سے مربوط منفعت ہوتی ہے، تاہم عملاً جو تجربات اسلامی بینکوں کے سامنے آرہے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ صکوک کی خرید وفروخت میں بے احتیاطی بھی پائی جاتی ہے، اور بعض اوقات اس کا استعمال اس طریقہ پر ہوتا ہے، جس کو فقہاء نے ''بیع عینہ'' قرار دیا ہے اور جس کو سد ذریعہ کے طور پر مالکیہ اور حنفیہ نے منع کیا ہے۔

یہ تو وہ موضوعات ہیں، جن سے متعلق سوال نامے آپ کی خدمت میں بھیجے گئے تھے؛ لیکن اس کے علاوہ ایک اور مسئلہ پر اس وقت غور کرنے کی ضرورت ہے، گذشتہ دنوں ہندوستان کی راجدھانی دہلی میں ایک لڑکی کے ساتھ آبروریزی کا جو واقعہ پیش آیا، اس نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا اور ذرائع ابلاغ سے لے کر ایوان قانون تک ہر جگہ اس واقعہ کی گونج رہی ہے، جہاں ملک کی یہ زندہ ضمیری قابل تحسین ہے، وہیں یہ دیکھ کر افسوس بھی ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں مسائل کو اہمیت دینے کے اعتبار سے دو الگ الگ پیمانے ہیں، اس موقع پر اخبارات میں جو اعداد وشمار شائع ہوئے، ان سے معلوم ہوا کہ آزادی کے بعد سے ایک کروڑ دلت عورتیں اور بیس ہزار مسلم خواتین کی آبروریزی ہوچکی ہے، کشمیری اور شمال مشرقی علاقہ کی قبائلی خواتین کے ساتھ فوجیوں کی زیادتی کے واقعات دن رات سامنے آتے رہتے ہیں؛ لیکن ان جرائم کے خلاف کوئی آواز نہیں اُٹھتی اور ذرائع ابلاغ کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی؛ لیکن بہر حال بحیثیت مسلمان ہمارا فریضہ ہے کہ ہم انسانیت کے سامنے اس بات کو واضح کریں کہ اسلام ایسے جرائم کو روکنے کے لئے کن تدابیر کو اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے، اس نے کس طرح جاہلیت کے حیا سوز معاشرہ کو عفت وحیا کی چادر اُڑھائی اور اسے تاریخ انسانی کے لئے ایک نمونہ بنادیا؛ اس لئے یہ بات بہتر ہوگی کہ ہم علماء اور اربابِ افتاء کی اس اجتماع کے وساطت سے پورے ملک اور پوری انسانی برادری تک شریعت اسلامی کے ان آفاقی اُصولوں کو پہنچائیں، جن کے ذریعہ انصاف وامن قائم ہوسکتا ہے، سماج کے تمام طبقات کے عزت وآبرو کی حفاظت ہوسکتی ہے اور ایسا ماحول قائم ہوسکتا ہے، جس میں کوئی شخص اپنے آپ کے لٹ جانے کا خطرہ محسوس نہ کرے۔

حضرات ! مقامِ مسرت ہے کہ اکیڈمی کا یہ سیمینار ہندوستان کے ایک ایسے تاریخی شہر میں منعقد ہورہا ہے جو اپنی علمی خدمات اور ادبی فتوحات کے لحاظ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر بھی معروف ہے، بعض اہل علم کے بیان کے مطابق ۲۷۴ ق م میں اس شہر کی بنیاد رکھی گئی، اسلامی

تاریخ کے مشہور سیاح ابن بطوطہ کا بھی یہاں سے گزر ہوا ہے اور انھوں نے اپنے سفرنامہ میں اس کا ذکر کیا ہے، جناب مصباح احمد صدیقی نے شعراء امروہہ کے تذکرے میں ۲۰۹ شعراء کے حالات اوران کے کلام کا نمونہ ذکر کیا ہے؛ لیکن خود ان کے بیان کے مطابق شعراء امروہہ کی ایک نامکمل فہرست انھوں نے بنائی، جو تقریباً ایک ہزار شعراء پر مشتمل تھی، شعروسخن کے استاذ الاساتذہ غلام ہمدانی مصحفی یہیں پیدا ہوئے اور یہیں ان کے مذاق شعروسخن کی آبیاری ہوئی، نیز اسی دیار سے تعلق رکھنے والے ایک شاعر خواجہ عطاء اللہ عطاء کو مرزا عبد القادر بے دل جیسے نامور شاعر بلکہ اقلیم شعر وادب کے تاجور نے انھیں اپنا قلمدان عطا کیا تھا، جو اُس زمانہ میں بڑا اعزاز خیال کیا جاتا تھا۔

یہ شہر بڑے بڑے علماء و مشائخ کا گہوارہ رہ چکا ہے، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے جلیل القدر شاگرد حضرت مولانا احمد حسن محدث امروہوی (۱۸۵۰-۱۹۱۲ء) اسی شہر کی خاک سے اُٹھے، دور دور تک آپ کے علم کا فیض پہنچا اور طویل عرصہ تک جامع مسجد امروہہ میں تدریس کی خدمت انجام دی، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ (سابق مہتمم دار العلوم دیوبند) اور اپنے عہد کے کئی معروف علماء نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا، یہیں کے بزرگوں میں مولانا حافظ عبد الرحمٰن صدیقی، حضرت نانوتویؒ، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ اور شیخ الہندؒ سے تلمذ حاصل تھا اور جو بیضاوی کے محشی ہونے اور علوم قرآن سے خصوصی مناسبت رکھنے کی وجہ سے مفسر قرآن کے لقب سے جانے جاتے تھے، ان کا تدریسی فیض علاقہ کے مدارس کے علاوہ ڈابھیل اور دیوبند سے بھی جاری ہوا، دار العلوم دیوبند کی ممتاز ہستی، شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ کا تعلق بھی اسی دیار سے تھا، جو مختلف اہم کتابوں کے محشی ہونے کے علاوہ عربی شاعری کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور جنھیں افراد سازی اور مردم گری میں ید طولیٰ حاصل تھا، حضرت مولانا حکیم مختار احمد صدیقیؒ تلمیذ حضرت محدث امروہوی علوم ظاہری و باطنی کے ساتھ فن طب میں بھی طاق تھے، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری اور مولانا آزاد سبحانی جیسے نامی گرامی علماء آپ کے تلامذہ میں تھے، ماضی قریب میں ایک ایسی نابغہ روزگار ہستی امروہہ میں پیدا ہوئی، جن کے تذکرہ کے بغیر ہندوستان کی علمی تاریخ نامکمل رہے گی، میری مراد حضرت مولانا مفتی نسیم احمد فریدی سے ہے، جن کے بارے مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کا بیان ہے کہ علم سے ان کو وہی تعلق تھا جو مچھلی کو پانی سے ہوتا ہے، تاریخ اور تصوف کے موضوع پر ان کی تالیفات پر ہر حلقہ نے آفریں کہا، مشہور استاذ حدیث مولانا طاہر حسین صاحبؒ اور دنیائے

تحقیق کے در آبدار پروفیسر نثار احمد فاروقی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے، حقیقت یہ ہے کہ دوآبہ کا علاقہ اور غالباً اس کے قلب میں واقع امروہہ ہر دور میں اپنی علمی وجاہت، ادبی خدمات اور علوم اسلامی کی اشاعت ایسی امتیازی حیثیت کا حامل رہا ہے کہ شاید برصغیر میں اس کی مثال نہ ملے۔

امروہہ جہاں اپنے عہد کی عظیم ہستیوں کا گہوارہ رہا ہے، وہیں وہ دینی درسگاہوں کے لحاظ سے بھی نمایاں حیثیت رکھتا ہے، ۱۸۵۷ء کے بعد جب حضرت نانوتویؒ نے اپنے رفقاء کے ساتھ تحریک مدارس کی بنیاد رکھی تو اولین مرحلہ میں جن علاقوں تک اس کی کرنیں پہنچیں، ان میں ایک یہ شہر بھی ہے، 'جامعہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ' — جس کے احاطہ میں اس وقت آپ حضرات مقیم ہیں — ۱۲۷۳ھ کے بعد خود حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تحریک پر اس کی بنیاد پڑی، حضرت نانوتویؒ کے تلمیذ ارشد حضرت مولانا احمد حسن محدث امروہویؒ کی تشریف آوری کے بعد غالباً ۱۳۰۲ھ میں یہاں دورۂ حدیث شریف کا آغاز ہوا، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا نسیم احمد فریدیؒ، مولانا سید طاہر حسنؒ، حضرت مولانا اعجاز حسنین صاحب اور حضرت تھانویؒ کے معتمد خلیفہ حضرت مولانا سراج احمد خان جیسے اہل علم اور اہل دل یہاں کے فرزندوں میں ہیں، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ اور مفسر قرآن حضرت مولانا عبدالرحمٰن صدیقیؒ، نیز قرأت و تجوید کے مشہور استاذ قاری ضیاء الدین اِلہ آبادیؒ جیسی ممتاز ہستیوں نے یہاں فریضۂ تدریس انجام دیا ہے، اکیڈمی کے لئے نہایت خوشی کی بات ہے کہ علماء و اہل دل سے تعلق رکھنے والی ایسی تاریخی درسگاہ میں اس کا یہ سیمینار منعقد ہو رہا ہے۔

اخیر میں ہم جامعہ ہذا کے ذمہ داران اور ملک کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے علماء و ارباب افتاء کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ذمہ داران جامعہ نے اس قافلہ فکر و نظر کی میزبانی کو قبول فرمایا اور آپ حضرات نے اکیڈمی کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے سفر کی زحمت گوارا فرمائی، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اس اجتماع کو قبول فرمائے، ہمیں صواب و سداد کی راہ چلائے اور اس پر قائم رکھے۔ آمین

اللهم ارنا الحق حقاً و ارزقنا اتباعه و ارنا الباطل باطلا و ارزقنا اجتنابه۔

● ● ●

اختلاف کے آداب ☆

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام علیٰ سيد المرسلين وعلیٰ اله وأصحابه أجمعين و من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أما بعد !

صدر عالی قدر، بزرگان محترم، برادران عزیز! نہایت مسرت انگیز موقع ہے کہ ایک بار پھر ہم سب ایک بلند مقصد اور ایک نیک کام کے لئے یہاں جمع ہیں اور اس اجتماع میں ملک کے تمام علاقوں اور بیشتر اہم دینی درسگاہوں کے نمائندے موجود ہیں، مقصد ہے اس عہد میں پیش آنے والے واقعات ونوازل پر شریعت اسلامی کے احکام ومصالح کی تطبیق اور یہ یقیناً بڑا بلند کام ہے، حضرت ابودرداءؓ کا قول ہے کہ دین وشریعت یا مسائل اُمت کے بارے میں ایک ساعت کا غور وفکر رات بھر کی نفل نماز سے بڑھ کر ہے: ''**تفكر ساعته خير من قيام ليلة**'' (حلیۃ الأولیاء وطبقات الأصفیاء: ۱/ ۲۰۸)

مشہور تابعی وہب بن منبہؒ، جن کو متعدد صحابہ سے استفادہ کا شرف حاصل ہے، فرماتے ہیں کہ جس مجلس میں علم سے متعلق مباحثہ ہوتا ہو اور غور وفکر میں ردوقدح کی نوبت آجاتی ہو، وہ مجھے اتنی دیر نماز پڑھنے سے زیادہ عزیز ہے؛ کیوں کہ نماز کا نفع اس کی ذات تک محدود ہے اور اس بحث وتمحیص کا نفع پوری اُمت کے لئے ہے:

مجلس يتنازع فيه العلما أحب الى من قدره صلاة ؛ لعل أحدهم يسمع الكلمة فينتفع بها سنة أو مابقى من عمره۔ (سنن الدارمی: باب فی فضل العلم والعالم: حدیث نمبر: ۳۳۴)

خود رسول اللہ ﷺ سے بنی اسرائیل کے دو ایسے افراد کے بارے میں دریافت کیا گیا، جن میں سے ایک عالم تھے، وہ فرض نماز ادا کرتے تھے اور پھر لوگوں کو اچھی باتوں کی رہنمائی فرماتے تھے اور دوسرے وہ تھے، جو دن میں روزہ رکھتے تھے اور رات بھر عبادت کرتے تھے؛ کہ ان دونوں میں سے

☆ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے ۲۳ ویں فقہی سیمینار، منعقدہ: جامعہ علوم القرآن جمبوسر میں یہ کلیدی خطبہ پیش کیا گیا۔

کون افضل ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اُس عالم کی فضیلت اِس عابد پر ایسے ہی ہے، جیسے میری فضیلت تم میں سے کسی ادنیٰ شخص پر :

فضل هذا العالم الذي يصلي المكتوبة ثم يجلس فيعلم الناس الخير ، على العابد الذي يصوم النهار ويقوم الليل ، كفضلي على أدناكم رجلاً۔(۱)

اللہ تعالیٰ کی ذات سے اُمید ہے کہ ہم لوگوں کا یہ اجتماع ایسا ہی عمل شمار کیا جائے گا، واللہ المستعان۔

حضرات ! چشم تصور سے دیکھئے، ایسا لگتا ہے کہ ابھی کل کی بات ہے کہ دل والوں کی بستی دلی کے جامعہ ہمدرد کے کیمپس میں ہم لوگ جمع ہوئے تھے، کیسے کیسے اکابر علماء شہ نشیں پر تشریف فرما تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ، حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ ، حضرت مولانا ابوالسعود احمد باقویؒ ، جو لوگ ان کے سامنے سامعین کی صف میں تھے وہ خود آج کسی بھی اہم مجلس میں زیب محفل اور جانِ کارواں کہلانے کے لائق ہیں، ان میں سے بہت سے وہ ہیں جو اللہ کو پیارے ہو چکے اور بہت سے وہ ہیں جن کا سایۂ عاطفت ہم پر قائم ہے، ہم جیسے کوتاہ علم اور کوتاہ عمل لوگ تو گرد کارواں کہلانے کے بھی مستحق نہیں تھے، اس قافلۂ فکر ونظر کو حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے ترتیب دیا، استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ حضرت مولانا مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوریؒ اور استاذ گرامی حضرت مولانا مفتی نظام الدین اعظمیؒ کی دُعائیں اور نیک تمنائیں اس قافلہ کا اثاثہ تھیں، دیکھتے ہی دیکھتے پچیس سال گزر گئے ، یہ بانیٔ اکیڈمی کے اخلاص اور سوزِ دروں کی برکت تھی کہ یہ ننھا سا پودا جس سے غنچوں کا نکلنا بھی دشوار محسوس ہوتا تھا، غنچہ سے گل اور گل سے گلشن بن گیا اور آج نہ صرف پورا ہندوستان اس سے عطر بار ہے ؛ بلکہ پوری دنیا میں اس کی خوشبو محسوس کی جارہی ہے :

''أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ''۔(ابراہیم: ۲۴)

اداروں، جماعتوں اور تنظیموں کی زندگی میں پچیس سال کی مدت کوئی بڑی مدت نہیں ہوتی؛ لیکن یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ اس مختصر عرصہ میں اکیڈمی کا یہ تیئسواں فقہی سیمینار منعقد ہو رہا ہے، ان سیمیناروں میں اب تک ۹۲ رمرکزی موضوعات زیر بحث آچکے ہیں اور بہ حیثیت مجموعی تقریباً

(۱) سنن الدارمی: باب فی فضل العلم والعالم، حدیث نمبر: ۳۵۲۔

ساڑھے پانچ سو جزوی مسائل پر فیصلے کئے گئے ہیں، اس لحاظ سے آپ حضرات کے تعاون پر مبنی یہ ادارہ دنیا کی بیشتر مجامع فقہیہ پر سبقت حاصل کر چکا ہے، اکیڈمی نے مختلف فکری موضوعات پر جو مذاکرات منعقد کئے ہیں، ان کی تعداد ۲۲ / رہے، عام طور پر ان پروگراموں میں عصر حاضر کے اہم ترین فکری مسائل کو اُٹھایا گیا ہے اور اہل علم کو دعوت فکر وتحقیق دی گئی ہے، ان میں متعدد موضوعات وہ ہیں، جن پر کم سے کم برصغیر میں پہلی بار اکیڈمی نے بحث کرائی ہے، اکیڈمی کی خصوصی توجہ نوجوان فضلاء کی تربیت پر بھی ہے اور اس نقطۂ نظر سے ۲۶ تربیتی پروگرام منعقد کر چکی ہے، اکیڈمی کی طرف سے دینی مدارس اور عصری درسگاہوں میں توسیعی خطبات کا جو نظم کیا جاتا ہے، وہ اس کے علاوہ ہے، اکیڈمی نے اُردو، عربی، انگریزی اور بعض دوسری زبان میں مجموعی طور پر ۱۴۵ / کتابیں شائع کی ہیں، صرف سیمیناروں کے مجلّات ہی تقریباً پچاس کے عدد کو پہنچ گئے ہیں، عربی سے اُردو اور اُردو سے عربی، انگریزی، ہندی میں ۱۱۰ / کتابوں کے ترجمے ہوئے ہیں، جن میں ۴۵ / جلدوں پر مشتمل ''موسوعہ فقہیہ'' کا ترجمہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے، اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے، کہ اہم عالمی اور قومی مسائل پر کچھ باصلاحیت فضلاء سے تحقیق کا کام کرایا جائے اور ان کو منظر عام پر لایا جائے، یہ جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ کی توفیق، سرپرستانِ اکیڈمی حضرت مولانا محمد سالم قاسمی، حضرت مولانا سید محمد رابع ندوی اور حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب کی دُعاؤں کا ثمرہ ہے، اکیڈمی کی مجلس انتظامی ملک کے منتخب ومؤقر علماء واصحاب افتاء پر مشتمل ہے، ان کی اور اکیڈمی کے کارکنان کی مشترکہ کاوشیں اس میں شامل ہیں، نیز یہ آپ سب حضرات کے مخلصانہ تعاون کا نتیجہ ہے، مگر اکیڈمی کے وسیع تر مقاصد کے لحاظ سے ابھی بہت سارے کام باقی ہیں، جن کی منصوبہ بندی کے لئے اکیڈمی فکرمند ہے، دُعاء ہے کہ اکیڈمی کا یہ سفر شوق کبھی تمام نہ ہو، کہ حقیقی مسافر علم وہی ہے جس کے لئے ہر منزل راستہ بنتی چلی جائے۔

آج جب کہ ہم ایک تاریخی موڑ پر ہیں، کچھ ایسے نکات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے، جن کی طرف اکیڈمی اپنے طریقۂ کار کے ذریعہ خاموش دعوت دیتی رہی ہے اور حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ وقت کی آواز ہے، اگر اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی تو اندیشہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کا حال ماضی سے بڑھ کر اور مستقبل حال سے بڑھ کر یاس انگیز ہو اور اُمت اِس وقت جس رسوائی اور تنہائی کے دور سے گذر رہی ہے، اس میں اضافہ ہوتا چلا جائے، ان میں ایک اہم اور قابل توجہ امر اعتدال ومیانہ روی کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ کی کتنی ہی قیمتی نعمت ہو؛ لیکن اگر وہ حد اعتدال سے گذر جائے تو

انسان کے لئے مصیبت بن جاتی ہے، ہوا کے بغیر انسان دو گھڑی نہیں رہ سکتا؛ لیکن یہی ہوا اگر طوفان کی شکل اختیار کر لے تو آبادیوں کو ویران کر کے رکھ دیتا ہے، پانی انسان کے لئے بقائے حیات کا ذریعہ ہے: ''**وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ**''(الانبیاء:۳۰) لیکن یہی پانی اگر سیلاب بلاخیز بن کر شہروں اور بستیوں میں گھس آئے تو ہنستی کھیلتی بستیوں کو قبرستان اور ماتم کدہ میں تبدیل کر دیتا ہے، آگ کی مدد لئے بغیر ایک وقت کا کھانا نہیں پکایا جاسکتا؛ لیکن یہی آگ اگر آتش فشاں کی صورت اختیار کر لے تو قیامت برپا ہو جاتی ہے، بے اعتدالی جیسے مظاہر قدرت کے لئے تباہی وبربادی کا پیغام بن جاتی ہے، اسی طرح فکر ونظر اور زبان وقلم کی بے اعتدالی قوموں کے لئے بھی ہلاکت وبربادی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

قرآن مجید نے غالباً اسی عدل وانصاف کے راستے کو صراط مستقیم (الفاتحہ:۵) سے اور اس پر قائم رہنے والوں کو'' اُمت وسط'' سے تعبیر کیا ہے، (البقرۃ:۱۴۳) رسول اللہ ﷺ نے عام معاملات ہی نہیں؛ بلکہ عبادات میں بھی اعتدال اور میانہ روی کا سبق دیا ہے، علمائے اُمت نے جادۂ حق سے انحراف کرنے والے گروہوں میں خوارج کو سب سے زیادہ قابل مذمت قرار دیا ہے؛ یہاں تک کہ امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا:''**الخوارج قوم سوء ، لا أعلم فی الأرض قوماً شراً منهم**''۔(السنۃ لأبی بکر الخلال، حدیث نمبر:۱۱۰)

خوارج عبادت وریاضت اور شریعت کے ظاہری احکام پر عمل کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں تھے؛ بلکہ آگے ہی تھے، آپ ﷺ نے ان کی علامت بتائی کہ تم کو اپنی تلاوت اور عبادت ان کے مقابلہ حقیر محسوس ہوگی:

> **يقرؤن القرآن ليس قرأتكم إلى قراءتهم بشئ ، ولا صلاتكم إلىٰ صلاتهم بشئ ولا صيامكم الىٰ صيامهم بشئ يقرؤن القرآن يحسبون أنه لهم وهو عليهم ، لا تجاوز صلاتهم تراقيهم ، يمرقون من الاسلام ؛ كما يمرق السهم من الرمية ۔** (صحیح مسلم، حدیث نمبر:۱۰۶۶)

ان کی بیماری بے عملی نہیں تھی؛ بلکہ غلو اور بے اعتدالی، دوسرے مسلمانوں کے بارے میں بدگمانی، ان کی نیتوں کے بارے میں سوءظن اور پھر جو ذمہ داریاں ولی امر سے متعلق ہیں، ان کو اپنے ہاتھ میں لے لینا، یہ ان کی اصل بیماری تھی اور اسی لئے صحابہ کو ان سے باضابطہ جہاد کرنا پڑا۔

عام لوگوں میں تو اس کا نقصان محدود ہوتا ہے؛ لیکن اگر علماء اور مقتدایان قوم اس کا شکار ہو جائیں تو اس کے نقصانات بہت دور رس ہوتے ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ گذشتہ ایک دو دہائیوں میں یہ کیفیت علماء میں بڑھ گئی ہے اور بڑھتی جارہی ہے، خواہ ان کا تعلق خلیج اور عالم عرب سے ہو یا ہمارے پڑوسی ملک سے، اور اب یہی کیفیت نہایت تیزی اور پوری قوت کے ساتھ ہمارے ملک میں درآمد کی جارہی ہے، کسی مسلمان کو کافر کہنے، مشرک کہنے، فاسق وفاجر کہنے اور مبتدع کہنے میں ایسی بے احتیاطی سے کام لیا جاتا ہے کہ گویا یہ کوئی خاص بات ہی نہ ہو، ہم حدیث کی جو بھی کتابیں پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، ان کے اہم ترین حصہ ''کتاب الایمان'' میں زیادہ تر معتزلہ اور خوارج پر رد کیا جاتا ہے؛ لیکن معتزلہ اور خوارج کے بارے میں جمہور فقہاء کی رائے یہی ہے کہ ان کو دائرۂ ایمان سے خارج نہیں کہا جاسکتا؛ چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں :

وحكم الخوارج عند جمهور الفقها والمحدثين حكم البغاة ، وذهب بعض المحدثين إلى كفرهم ، قال ابن المنذر : ولا أعلم أحداً وافق أهل الحديث علىٰ تكفير هم ، وهذا يقتضي نقل إجماع الفقهاء ۔

مطلب في عدم تكفير الخوارج وأهل البدع وقد ذكر في المحيط أن بعض الفقهاء لا يكفر أحدا من أهل البدع ، وبعضهم يكفر من خالف منهم ببدعته دليلا قطعياً ونسبه إلى أكثر أهل السنة والنقل الأول أثبت ، نعم يقع في كلام أهل مذهب تكفير كثير ، لكن ليس من كلام الفقهاء الذين هم المجتهدون ؛ بل من غيرهم ۔

لاعبرة بغير والمنقول عن المجتهدين ما ذكرنا ، وابن المنذر أعرف بنقل مذاهب المجتهدين ۔ (شامی: ۶/ ۴۱۳)

جمہور تابعین اور علماء اہل حدیث کے نزدیک خوارج کا حکم باغیوں کا سا ہے......اور بعض علماء حدیث ان کو کافر قرار دیتے ہیں......علامہ ابن منذر کا بیان ہے کہ میں کسی فقیہ کو نہیں جانتا جس نے اُن کو کافر قرار دینے

کے سلسلہ میں علماء حدیث کی موافقت کی ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ خوارج کے کافر نہ ہونے پر فقہاء کا اجماع ہے اور ''محیط'' نامی کتاب میں ذکر کیا گیا ہے کہ بعض فقہاء اہل بدعت میں سے کسی کو کافر قرار نہیں دیتے اور بعض ان لوگوں کو کافر قرار دیتے ہیں جو اپنی بدعت میں کسی دلیل قطعی کی مخالفت کے مرتکب ہو، اس رائے کو مصنف نے اکثر اہل سنت کی طرف منسوب کیا ہے؛ لیکن پہلی روایت زیادہ صحیح ہے، (یعنی کافر نہ قرار دئے جانے کی) یہ فقہاء مجتہدین کا کلام نہیں، دوسروں کا کلام ہے، اور اُن کے کلام کا اعتبار نہیں، مجتہدین سے وہی بات منقول ہے، جو ہم نے ذکر کی اور علامہ ابن منذر مجتہد کی آراء سے زیادہ واقف ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

تفرقت اليهود على إحدى وسبعين فرقة وتفرقت النصارى على إحدىٰ أوثنتين وسبعين فرقة وتفترق أمتي على ثلاث وسبعين فرقة۔ (١)

بعض روایتوں میں اضافہ ہے: ''**كلها في النار إلا واحدة وهي الجماعة**'' (٢) آج کل اس حدیث کو ایک گروہ دوسرے گروہ کو گمراہ اور خارج ایمان قرار دینے کے لئے ذکر کرتا ہے؛ حالاں کہ غور کیا جائے تو یہ اُمت کے لئے اتحاد اور تقارب کی بنیاد بن سکتی ہے؛ کیوں کہ اس حدیث سے ظاہر ہے کہ یہ تمام گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت اجابت میں شامل ہیں اور دائرہ ایمان سے باہر نہیں ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''**أمتي**'' کا لفظ عام طور پر اُمت اجابت یعنی مسلمانوں کے لئے استعمال کیا ہے، اُمت دعوت کے لئے صرف اُمت کا لفظ کہا ہے جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

والذي نفس محمد بيده! لايسمع بي من هذه اللأمته يهودي ولانصراني، ثم يوت ولم يؤمن بالذي أرسلت به إلا كان من أصحاب النار۔ (مسلم عن أبي هريرة، حديث نمبر: ١٥٣)

---

(١) مسند احمد عن أبي هريرة: ٢/٣٣٢، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ٤٥٩٦، سنن ترمذی، حدیث نمبر: ٢٦٤٢، سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ٣٩٩١۔

(٢) مسند أحمد: ٤/١٠٢، عن معاویہ، ابوداؤد، حدیث نمبر: ٤٥٩٧۔

اسی لئے علامہ خطابیؒ نے فِرَق والی حدیث کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے :

فيه دلالة على أن هذه الفرق كلها غير خارجته من الدين ؛ اذقد جعلهم النبي صلى الله عليه وسلم كلهم من أمته ۔ (معالم السنن: ۷/۴)

اسی طرح علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں :

والنبي صلى الله عليه وسلم لم يخرجهم من الاسلام ؛ بل جعلهم من أمته ۔ (منہاج السنۃ: ۵/۲۴۱)

یہی بات امام عبدالوہاب شعرانی نے اپنی معروف کتاب ''الیواقیت والجواہر'' میں فرق ضالہ پر گفتگو کرتے ہوئے کہی ہے،(۱) نیز مشہور محقق علامہ ابواسحٰق شاطبیؒ نے اپنی شہرہ آفاق اور نادرۂ روزگار تالیف ''الموافقات'' میں بیان فرمایا ہے، (دیکھئے: الموافقات: ۴/۱۹۳، ۱۴۹) چنانچہ بعض اہل علم نے صراحت کی ہے کہ تمام فرقوں کے دوزخی ہونے اور ایک کے جنتی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک فرقہ کو دخول اولین کی سعادت حاصل ہوگی اور بقیہ کو فاسقین مذنبین کی طرح دخول اولین تو حاصل نہ ہوگا؛ لیکن مآل کار وہ بھی جنت میں داخل کئے جائیں گے: ''**ولعل وجه التوفيق أن المراد بأهل الجنة في الرواية الثانية ولومآلاً**'' ۔ (کشف الخفاء: ۱/۱۷۲، حدیث نمبر: ۴۴۶)

اس لئے ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے کسی طبقہ کو کافر یا مسلم ممالک کے بعض انتہاپسندوں کی طرح مباح الدم قرار دینے میں احتیاط کا دامن نہ چھوڑا جائے ،اسی طرح کسی گروہ کو مشرک کہنے کا معاملہ ہے، کسی عالم کو رسول اللہ کی طرح معصوم سمجھنا یا اس کی بات کو حجت سمجھنا ایک الگ بات ہے اور اس کی تحقیق یا اجتہاد پر اعتماد کرنا بالکل دوسری بات ہے، پہلی شکل شرک کی ہے اور دوسری صورت اہل علم وصلاح کی اتباع واقتداء ہے، جو دین میں مطلوب ہے: ''**أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ**'' (الانعام: ۹۰) اسی طرح اگر کوئی شخص مشرکانہ عمل کرتا ہو؛ لیکن وہ اس کی تاویل کرتا ہو تو یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ فلاں شخص مشرکانہ عمل کا مرتکب ہے؛ لیکن اس کی وجہ سے اس کے مشرک ہونے کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا، اسی طرح فقہا کا مشہور قاعدہ ہے کہ کسی بھی مسلمان کے عمل کو حتی المقدور صواب وسداد پر محمول کیا جائے گا؛ اسی لئے جن مسائل میں معتبر علماء وارباب افتاء کے اقوال مختلف ہیں،

---

(۱) الیواقیت والجواہر: ۲/۱۲۸، مبحث: ۵۸۔

اس کو اس عمل کی وجہ سے فاسق کہنے میں احتیاط کرنی چاہئے، اسی طرح جن کاموں کی اصل قرون خیر میں نہ ہو؛ لیکن کوئی شخص اسے دینی عمل سمجھ کر انجام نہ دیتا ہو، اگر چہ مجموعی نفع ونقصان کے اعتبار سے اس سے منع کیا جاسکتا ہے؛ لیکن اسے بدعت کہنا درست نہیں ہوگا؛ کیوں کہ ہر احداث بدعت نہیں ہے؛ بلکہ احداث فی الدین بدعت ہے، اسی طرح کوئی ایسا عمل جو مختلف قوموں میں مروجہ ہو، اس کا مذہب سے تعلق نہ ہو اور نہ کسی خاص غیر مسلم گروہ کی شناخت اس سے متعلق ہو، اس کو ''تشبہ بالکفار'' نہیں کہا جاسکتا، جیسا کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے بعض فتاویٰ سے ظاہر ہے اور اس کی وجہ سے اس کے مرتکب کو فاسق کہنا درست نہ ہوگا، تکفیر، تشریک، تبدیع اور تفسیق کے سلسلہ میں احتیاط کی ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں بے احتیاطی اُمت میں انتشار وافتراق کا ذریعہ بن رہی ہے۔

بے اعتدالی کا ہی ایک پہلو انکار اور تاویل کے درمیان فرق نہیں کرنا ہے، انکار کا مطلب کسی بات کو حجت نہیں ماننا ہے اور تاویل سے مراد اس کے متبادر معنی کو چھوڑ کر کوئی اور معنی مراد لینا ہے جس کی کلام کے اندر گنجائش ہو، جیسے رسول اللہ ﷺ نے نماز کے بارے میں فرمایا: ''**تحریمها التکبیر**'' اب بعض فقہاء نے اس سے ''اللہ اکبر'' کہنا مراد لیا ہے اور بعض نے معنوی پہلو کی رعایت کرتے ہوئے کوئی بھی کلمہ تعظیم کہنے کو کافی سمجھا، یہ دوسری صورت تاویل کی ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں، اسی دائرے میں صفات باری تعالیٰ کا مسئلہ ہے کہ بعض سلف صالحین نے اللہ تعالیٰ کے لئے اعضاء وکیفیات کو تسلیم کیا، مگر اس طور پر کہ اللہ تعالیٰ کے لئے ان کا ثبوت اللہ ہی کی شان کے موافق ہے، ہم اس کا ادراک نہیں کر سکتے، جس کو ''تفویض'' کہتے ہیں اور بعض نے تاویل کا راستہ اختیار کیا کہ مثلاً عین سے مراد آنکھ نہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کا بصیر ہونا ہے اور ''اُذُن'' سے مراد کان نہیں، اللہ تعالیٰ کا سمیع ہونا ہے، یہ دونوں طریقے — تفویض وتاویل — سلف صالحین کے زمانے سے آرہے ہیں، علم کلام کے مسائل میں دونوں طریقہ اختیار کیا جاتا رہا ہے، ان میں سے کسی کو نص کا منکر نہیں کہا جاسکتا، اگر تاویل کو انکار سمجھا جائے تو سلف صالحین اور فقہاء ومحدثین میں شاید کوئی ایسا نہ رہ جائے جو انکار کی تہمت سے بچ جائے، معروف روایت ہے: ''**البیعان بالخیار مالم یتفرقا**'' امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ نے اس میں تفرقِ اقوال مراد لیا ہے؛ جب کہ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے تفریق ابدان اور یہی رائے ابن ابی ذئب کی ہے، ابن ابی ذئب نے اس مسئلہ میں امام مالکؒ کے بارے میں کوئی سخت کلمہ کہہ دیا تو حالاں کہ امام احمدؒ کو امام مالکؒ سے اس مسئلہ میں اختلاف تھا؛ لیکن انھوں نے ابن ابی ذئب کے اس لہجہ پر

ٹوکتے ہوئے فرمایا کہ امام مالکؒ نے حدیث کو رد نہیں کیا ہے؛ بلکہ اس کی تاویل کی ہے: ''**مالک لم یرد الحدیث ؛ ولکن تأوله علی غیر ذلک**''۔(أدب الاختلاف فی مسائل العلم والدین: ۴۷)

بے اعتدالی کا ایک سبب مدارج احکام پر توجہ نہ دینا ہے، یہ بات ظاہر ہے کہ شریعت کے تمام احکام ایک درجہ کے نہیں ہیں، بعض فرض وواجب ہیں، بعض سنن ومستحبات ہیں اور بعض مباح ہیں، بعض احکام نصوص پر مبنی ہیں اور بعض قیاس واجتہاد پر اور جو احکام نصوص پر مبنی ہیں، ان میں بھی بعض اپنے ذریعہ ثبوت کے اعتبار سے قطعی اور یقینی ہیں اور بعض ظنی، پھر جو احکام نص قطعی الثبوت سے ثابت ہیں، ان میں کچھ وہ ہیں، جن کی دلالت اپنے معنی ومفہوم پر بالکل واضح ہے اور بعض کی دلالت اس طور پر ہے کہ اس میں اس سے مختلف معنی کا بھی احتمال ہے، اسی طرح بعض احکام پر فقہاء کا اجماع واتفاق ہے اور بعض میں اختلاف ہے، یہ سب ایک درجہ میں نہیں ہیں، غرض کہ اہمیت کے اعتبار سے بھی احکام کے مختلف مدارج ہیں، ذریعۂ ثبوت کے اعتبار سے بھی اور مصادر شریعت کے ان احکام پر دلالت کرنے کے اعتبار سے بھی؛ لہٰذا اہمیت اور ثبوت کے اعتبار سے ان مختلف مدارج کے احکام میں فرق کرنا ضروری ہے۔

کسی حکم کو اس کے درجے سے بڑھا دینا غلو اور احداث فی الدین ہے؛ اسی لئے اہل علم نے '**ایجاب مالا یجب**' کو بدعت شمار کیا ہے، جیسے سنت یا مستحب کو فرض کا درجہ دے دینا یا کسی تارک سنت کے ساتھ تارک فرض کا سا رویہ اختیار کرنا اور کسی حکم کو اس کے درجے سے گرا دینا بددینی اور انحراف ہے، مدارج احکام کی رعایت نہ کرنے میں ہی یہ بات بھی شامل ہے کہ جو مسائل فقہاء کے درمیان مختلف فیہ ہیں اور سلف صالحین کے یہاں ان کے بارے میں ایک سے زیادہ رائیں پائی جاتی ہیں، ان میں کسی ایک پہلو پر عمل کو بالکل غلط ٹھہرا دیا جائے اور اس کو خاطی وگمراہ سمجھا جائے؛ اسی لئے امام شافعیؒ نے ''نہی عن المنکر'' پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جو مسائل اختلافی ہیں، ان میں کسی شخص کا عمل آپ کی رائے کے برخلاف ہے تو اس کے عمل کو منکر شمار کرنا اور اس پر نکیر کرنا درست نہیں ہے، امام سفیان ثوریؒ سے منقول ہے: ''**إذا رأیت الرجل یعمل الذی قد اختلف فیه و أنت تری غیرہ فلا تنهه**'' (**الفقیه والمتفقه**: ۲/۶۹) مثلاً: اس کے عمل کی وجہ سے یہ کہا جائے کہ تمہاری نماز درست نہیں ہوئی یا یہ کہ تمہاری اب تک کی نمازیں ضائع ہوگئیں، مگر آج کل صورت یہ ہوگئی ہے کہ اگر کسی شخص نے ایسے طریقے پر نماز پڑھی، جو اس کے نزدیک مرجوح ہے تو بے تامل کہہ دیا جاتا ہے کہ تمہاری نماز درست نہیں ہوئی یا یہ کہ تمہاری اب تک کی ساری نمازیں ضائع ہوگئیں۔

مجھے ہندوستان سے دور دراز کے ایک ملک کا سفر کرنے کا موقع ملا، جو عیسائی اکثریت ملک ہے اور مسلمان وہاں ایک حد تک اپنی بقا کی لڑائی لڑ رہے ہیں، تو یہ جان کر افسوس ہوا کہ وہاں علماء کے درمیان اس بات میں اختلاف ہے کہ ٹوپی کس ڈائزائن کی پہنی جائے گی؟ اور اس پر باضابطہ مضامین بھی لکھے گئے ہیں، اس بات میں بھی نزاع ہے کہ کرتے کی کیا وضع ہونی چاہئے، وہ جبہ کی طرح ہو، یا اس طرح کا جیسے برصغیر میں پہنا جاتا ہے، دامن کھلے ہوئے ہوں یا نہیں اور کھلے ہوے ہوں تو کلی دار ہوں یا بغیر کلی کے ہوں؟ سوچئے کیا یہ ایسی باتیں ہیں جن میں اپنی صلاحیتیں صرف کی جائیں، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ نے جن باتوں کو فرض قرار دیا ہے، ان کو ضائع نہ کرو، کچھ باتوں کو حرام قرار دیا ہے، ان کی خلاف ورزی نہ کرو اور کچھ باتوں سے اللہ تعالیٰ نے — بغیر بھولے ہوئے — خاموشی اختیار کی ہے تو ان کی کھوج میں نہ پڑو: ''**فلا تبحثوا عنها**'' (کتاب الرضاع، حدیث نمبر: ۴۲۰) ایک اور روایت میں ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے عافیت ہے، اس کو قبول کرو: ''**فهو عافية فأقبلوا من الله عافيته**'' (سنن بیہقی، باب من لم یذکر تحریم، حدیث نمبر: ۱۹۵۰۸) نیز حضرت ابو درداءؓ کی روایت میں آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے: ''**وما سكت عنه فهو مما عفي عنه**'' (ابن عدی فی الکامل: ۷/۱۵) غرض کہ جن امور میں اللہ تعالیٰ نے کوئی تحدید نہیں رکھی ہے، ان کے بارے میں شریعت کا منشاء ہی یہی ہے کہ اس میں دونوں طرح کے عمل کی آزادی ہو، کسی خاص جہت کی پابندی نہ ہو؛ لیکن بعض دفعہ غلو پسند طبیعتیں ایسے مسائل میں تحدید وتقیید کے لئے کوشاں ہوتی ہیں، جو دین کے مزاج کے خلاف ہے۔

دوسرے: جس بات کی طرف توجہ کی ضرورت ہے، وہ ہے آداب اختلاف کو ملحوظ رکھنا، کتاب وسنت میں بعض احکام اس طور پر بیان کئے گئے ہیں کہ ان کا مفہوم بالکل واضح ہے؛ اسی لئے ان سے مستنبط ہونے والے اعتقادی وعملی احکام پر اُمت کا اجماع پایا جاتا ہے، اس سے وہی شخص اختلاف کرسکتا ہے، جس کی طبیعت میں زیغ وکجی ہو اور جو اسلام کے خلاف کھل کر بولنے کی ہمت نہ پاتا ہو، اس لئے دور از کار احتمالات پیدا کر کے اپنی بات کہتا ہو؛ لیکن دوسری ایسی نصوص بھی بے شمار ہیں، جن میں بجا طور پر ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال ہے اور متکلمین ہوں یا فقہاء انھوں نے پورے اخلاص کے ساتھ اس کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی ہے، ان میں سے کوئی بھی رائے زیغ وضلال نہیں؛ بلکہ بعض اہل علم کے نزدیک دونوں صائب ہیں اور بعضوں کے نزدیک زیادہ سے زیادہ خطا

وصواب کا احتمال ہے اور صائب وخاطی دونوں ہی ماجور ہیں اور جب اس رائے کو پیش کرنے والے مستحق اجر ہیں تو ان پر عمل کرنے والے کیوں نہ مستحق اجر ہوں گے، اسی طرح بعض ایسے مسائل بھی ہیں، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سے زیادہ طریقے نقل کئے گئے ہیں، اگر ان دونوں میں تطبیق ممکن نہ ہو تو فقہاء ایک کو ناسخ یا راجح اور دوسرے کو منسوخ یا مرجوح قرار دیتے ہیں اور اگر دونوں میں کوئی تضاد نہ ہو تو یہ اختلاف نہیں؛ بلکہ تنوع ہے اور زیادہ تر اختلاف کی یہی نوعیت پائی جاتی ہے۔

اختلاف رائے عہد صحابہ سے رہا ہے اور فروعی مسائل ہی میں نہیں اعتقادی مسائل میں بھی رہا ہے، اہل سنت والجماعت میں اشاعرہ بھی ہیں، ماتریدیہ بھی ہیں اور محدثین بھی، ان کے درمیان کبھی نوک جھونک بھی ہوتی رہی ہے، ماہرین اسماء رجال کی جرح وتعدیل پر بھی اس کے اثرات پڑے ہیں؛ لیکن ہمیشہ سے ہی بحیثیت مجموعی ان سب کو اہل سنت والجماعت کا حصہ سمجھا گیا اور انھیں حق پر باور کیا گیا، کبھی ایک نے دوسرے کو ضال ومضل نہیں ٹھہرایا؛ لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ اس اختلاف کی بناء پر مخالفین کو گمراہ قرار دیا جارہا ہے؛ یہاں تک کہ جو اساطین اُمت گزر چکے ہیں، ان پر بھی فرد جرم قائم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اسی طرح فقہی اختلاف میں بھی ایسے جوش وجذبہ کا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ گویا یہ مسائل مدارنجات ہیں، دین کی بجائے مسلک کی طرف اور ''اقامت صلوٰۃ'' کی بجائے ''کیفیت صلوٰۃ'' کی طرف دعوت دی جارہی ہے، اس کا رنگ ہماری درسگاہوں پر بھی چڑھ رہا ہے اور نوجوان فضلاء میں یہ خیال پروان چڑھ رہا ہے کہ جب تک اختلاف رکھنے والوں کو کفر وضلال تک نہ پہنچادیں، بحث کا کیا لطف ہے؟ اور مسائل فقہیہ میں بھی جب تک یہ ثابت نہ کردکھائیں کہ دوسرے فریق کا ہاتھ بالکل خالی ہے اور اس کا موقف بلا دلیل ہے، کیا علمی وزن قائم ہوگا؟

یہ سوچ اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ تمام لوگ ان کی رائے پر جمع ہوجائیں؛ حالاں کہ سلف صالحین نے قرآن وسنت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اختلاف رائے کو کبھی برا نہیں سمجھا، اس سلسلہ میں تاریخ اسلام کی دو ایسی شخصیتیں جو علم وفضل اور ورع وتقویٰ کے اعتبار سے اُمت میں مسلم حیثیت رکھتی تھیں کا اسوہ قابل تقلید ہے — ایک: حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور دوسرے حضرت امام مالکؒ، حُمید طویل نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے عرض کیا کہ کیا ہی بہتر ہوتا کہ آپ تمام لوگوں کو ایک رائے پر جمع کردیتے: ''**لو جمعت الناس علی شیٔ**'' حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے

فرمایا مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ اختلاف رائے کو ختم کردیا جائے: ''**مایسرنی أنهم لم یختلفوا**'' پھر آپ نے تمام شہروں کو ہدایات بھیجیں کہ ہر جگہ وہاں کے فقہاء کی آراء پر عمل کیا جائے ، (سنن دارمی، باب اختلاف الفقہاء:١/١٥١) دوسری مثال امام مالکؒ کی ہے، جن سے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ لوگوں میں اختلاف باقی نہ رہے؛ اس لئے میں آپ کی کتاب ''مؤطاامام مالک'' کے نسخے تیار کر کے ہر شہر کو بھیج دوں اور حکم جاری کردوں کہ تمام لوگ اسی کتاب کے مطابق عمل کریں اور اس کے علاوہ جو دوسری رائیں ہیں انھیں چھوڑ دیا جائے: ''**آمرهم أن يعملوا بما فيها ويدعواماسوى ذلك**'' (سیر اعلام النبلاء:٨/٧٨) لیکن امام مالکؒ نے اس سے منع فرمایا کہ مختلف جگہ مختلف حدیثیں پہنچی ہیں، اور مختلف فقہاء کی مختلف آراء ہیں، لوگوں کو ان آراء کو چھوڑنے پر مجبور نہ کیا جائے، بعض کتابوں میں مہدی اور بعض میں ہارون رشید کا بھی ذکر آیا ہے؛ اس لئے خیال ہوتا ہے کہ غالباً تین تین عباسی خلفاء نے امام مالکؒ سے اس کی درخواست کی اور امام مالکؒ نے اس سے انکار کیا، اس سے جہاں امام مالکؒ کے ورع وخشیت کا اظہار ہوتا ہے، وہیں یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اختلاف رائے کے باقی رہنے کو اُمت کے لئے بہتر سمجھتے تھے: چنانچہ بعض ناقلین نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے: ''**إن اختلاف العلماء رحمة الله على هذه الأمة**''۔(**كشف الخفاء للعجلونی:١/٦٥**)

اسی لئے متعدد اہل علم سے یہ بات منقول ہے کہ انھیں صحابہ کے درمیان اختلاف رائے سے خوشی ہوتی تھی نہ کہ رنج، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حفید سعید یکے از فقہاء سبعہ، امام قاسم بن محمدؒ کہتے تھے: ''**لقد نفع الله باختلاف أصحاب النبی صلی الله علیه وسلم فی أعمالهم ، لایعمل العامل بعمل رجل منهم إلا رأیٰ أنه فی سعة ، ورأی أن خیرا منه قد عمله**'' (جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبدالبر:٢/٨٠) اسی طرح کی بات خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے منقول ہے، (جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبدالبر:٢/٨٠) علامہ ابن تیمیہؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک صاحب نے فقہاء کے اختلاف کو جمع کیا اور اس کا نام ''کتاب الاختلاف'' رکھا تو امام احمدؒ نے فرمایا کہ اس کا نام ''کتاب الاختلاف'' نہ رکھو؛ بلکہ ''کتاب السّعہ'' (فتاوی ابن تیمیہ:٣٠/٧٩) اس لئے علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ کا یہ فقرہ ''**اتفاقهم حجة قاطعة واختلافهم رحمة واسعة**'' (المغنی:١/٩٢) سلف صالحین کے یہاں گویا ضرب المثل بن گیا، اختلاف صحابہ کی اہمیت صرف اسی بنیاد پر نہیں ہے کہ

اس سے اختلاف رائے کا جواز معلوم ہوتا ہے؛ بلکہ اس کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اہل سنت والجماعت میں جتنے فقہاء ومجتہدین گزرے ہیں، ان سب کے اقوال کسی نہ کسی صحابی کے فتوے پر مبنی ہوتے ہیں، شاید وباید کوئی قول ایسا ہو جو اقوال صحابہ سے باہر ہو؛ اس لئے اختلاف صحابہ اختلاف ائمہ کو شامل ہے، غرض کہ اختلاف رائے کو برا نہیں سمجھنا چاہئے، دوسری رائے رکھنے والوں کی نیت پر حملہ نہیں کرنا چاہئے، نیز لوگوں کو دین کی طرف دعوت دی جانی چاہئے، اپنے مسلک ومشرب کو دلائل وبراہین کے ساتھ بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں دعوت مسلک کی نہ ہونی چاہئے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ اختلاف رائے باہمی تنافر کا سبب نہ بن جائے اور ایک دوسرے کے احترام میں رکاوٹ نہ بن جائے، سلف صالحین کا یہی طریقہ کار رہا ہے، علامہ بن عبد البرؒ نے خود اپنے استاذ عبد الملک بن ہاشمؒ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ نماز میں ''عند کل خفض ورفع'' رفع یدین کے قائل تھے، جیسا کہ مؤطا امام مالک میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے منقول ہے؛ لیکن اس پر عمل نہیں کرتے تھے، علامہ ابن عبد البرؒ نے جب اپنے استاذ سے اس کے بارے میں پوچھا کہ آپ خود اس پر عمل کیوں نہیں کرتے تو فرمایا کہ یہاں کے مسلمانوں کا اس پر عمل نہیں ہے اور مسلمانوں کے اجتماعی عمل کی مخالفت سلف کا طریقہ نہیں رہا ہے: **''مخالفة الجماعة فيما ابيح لنا ليست من شيم الأئمة''** (الاستذکار: ۲/۱۲۴) گویا ایسا عمل نہیں کرنا چاہئے جو عام مسلمانوں کے لئے وحشت وانتشار کا سبب ہے، سوائے اس کے کہ کوئی بات خلافِ شریعت ہو؛ یہاں تک کہ علامہ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ اگر کہیں مسلمانوں کا کسی بات پر عمل نہ ہو؛ کیوں کہ وہ اس کے قائل نہیں ہوں، اور دوسرا شخص اس کو مستحب سمجھتا ہو تو اس دوسرے شخص کے لئے وہاں اس کا ترک کردینا بہتر ہے؛ کیوں کہ ایک مسلمان کی تالیف قلب اس طرح کے مستحبات پر عمل کرنے سے بڑھ کر ہے: **''لأن مصلحة التأليف في الدين أعظم من مصلحته فعل مثل هذا''**۔ (مجموعۃ الفتاویٰ: ۲۲/۴۰۶، ۴۰۷)

ابن عبد البرؒ ہی نے نقل کیا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ اور علی بن المدینیؒ کے درمیان ایک مسئلہ پر بحث ہوئی اور بحث ایسی ہوئی کہ دونوں طرف سے آوازیں بلند ہونے لگیں، مجھے اندیشہ ہونے لگا کہ آپس میں بدمزگی پیدا ہوجائے گی؛ لیکن علی بن المدینیؒ واپس جانے لگے تو امام احمد بن حنبلؒ نے اس درجہ احترام کا معاملہ کیا کہ ان کی رکاب تھام لی، (جامع بیان العلم الخ: ۲/۱۰۷) یعنی اختلاف رائے نے باہمی احترام اور قدردانی میں کوئی کمی پیدا نہیں کی، یُونس صدفی امام شافعیؒ کے ممتاز شاگردوں میں سے

ہیں، ایک دن ایک مسئلہ میں استاذ سے خوب بحث ہوئی، پھر جب اگلی ملاقات ہوئی تو امام شافعیؒ نے ان کا ہاتھ تھام لیا اور فرمایا کیا یہ بات بہتر نہ ہوگی کہ ہم بھائی بھائی بن کر رہیں، چاہے ایک مسئلہ میں بھی ہمارے درمیان اتفاق پیدا نہ ہوسکے: ''**الا يستقيم أن نكون إخواناً و إن لم نتفق في مسألة**''۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۰/۱۶)

اختلاف کے باوجود باہمی احترام وتوقیر کا معاملہ صرف ان ہی گروہوں کے درمیان نہیں رہا ہے، جن سے فروعی احکام میں اختلاف ہے؛ بلکہ ان لوگوں کے درمیان بھی رہا ہے، جن سے اعتقادی مسائل میں اختلاف ہے؛ بلکہ ان لوگوں کے درمیان بھی رہا ہے، جن سے اعتقادی مسائل میں اختلاف تھا، مثلاً: سب جانتے ہیں کہ علامہ راغب اصفہانی معتزلی تھے، جاراللہ زمخشری نہ صرف معتزلی تھے؛ بلکہ انھوں نے اپنی تفسیر ''کشاف'' میں اہل سنت پر تنقید کرنے میں کوئی رعایت روا نہیں رکھی ہے؛ لیکن ان سب کے باوجود علماء اہل سنت نے ہمیشہ قرآن کے مفردات اور قرآن کی بلاغت کے سلسلے میں ان اہل علم سے استفادہ بھی کیا ہے اور بہت بلند الفاظ میں ان کی تعریف وتحسین بھی کی ہے؛ یہاں تک کہ ''جاراللہ'' جو کثرت عبادت اور مسجد میں کثرت حاضری کی وجہ سے علامہ زمخشریؒ کا لقب پڑ گیا تھا، اسی لقب کے ساتھ علمائے اہل سنت نے بھی ان کا تذکرہ کیا ہے اہل علم کی یہی شان ہے اور اس کو تو قرآن مجید نے دشمنان اسلام کے ساتھ بھی برتنے کا حکم دیا ہے کہ: ''**لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا**''۔ (المائدۃ: ۸)

اعداءِ اسلام اس وقت چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم کردیں، عام مسلمانوں میں لسانی وعلاقائی اختلاف کو اُبھارا جائے اور مسلمانوں کے مذہبی طبقہ میں مسلکی اختلاف کو ہوا دی جائے؛ اس لئے ہمارا طریقۂ کار یہ ہونا چاہئے کہ ہم دین کے مفاد کو مسلک کے مفاد پر مقدم رکھیں، اختلافی مسائل میں ہم جس رائے کو درست سمجھتے ہیں اس پر قائم رہیں؛ لیکن دوسری آراء کے بارے میں مناظرانہ رنگ اختیار کرنے کے بجائے ہمارا لب ولہجہ نرم ہو، نصح وخیر خواہی کا ہو، اعتدال وانصاف پر مبنی ہو، بے احترامی وبے توقیری نہ ہو اور کسی کی نیت پر حملہ نہ ہو، جیسے ہم اپنا یہ حق سمجھتے ہیں کہ جو نقطۂ نظر ہمارے خیال میں بہتر ہے، ہمیں اس پر عمل کرنے کا حق ہے، یا ہم جس شخصیت کی رائے کو زیادہ قابل قبول سمجھتے ہیں ان کی رائے پر عمل کریں، اسی طرح دوسروں کی آراء کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا جائے اور ان کو بھی اس کا حق دیا جائے، اس طرح ہم اختلاف کی شدت کو کم کرسکتے ہیں

اور اسلامی اُخوت کے جذبہ کو پروان چڑھا سکتے ہیں، اس صورت حال کی اصلاح کے لئے مدارس کو خصوصی قدم اُٹھانا چاہئے اور اسبابِ اختلاف اور آدابِ اختلاف پر کتابیں داخل نصاب کی جانی چاہئیں؛ تا کہ ناپختہ ذہن طلبہ اس حقیقت کو سمجھ سکیں کہ حدیث وفقہ کی کتابوں میں علماء وسلف کے درمیان جن اختلافات کا تذکرہ ہے، ان کا مقصد صرف تحقیق ہے نہ کہ کسی کو افضل ومفضول ثابت کرنا، اس میں تمام رائیں معتبر دلائل پر مبنی ہیں اور پورے خلوص کے ساتھ یہ رائیں قائم کی گئی ہیں، اختلاف رائے کے باوجود کسی کی بے توقیری اور بے احترامی درست نہیں ہے اور ان کے ذہن میں یہ بات مستحضر ہو کہ خود انھوں نے جو رائے قائم کی ہے، اس میں بھی خطا کا احتمال موجود ہے، شاید اس مقصد کے لئے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ''الانصاف'' اور ممتاز محدث شیخ محمد محمد عوامہ حفظہ اللہ کی ''أدب الاختلاف فی العلوم والدین'' موزوں ثابت ہو۔

حضرات! اُمت کے باہمی اختلافی مسائل میں غلو کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ ہماری توجہ اس محاذ سے ہٹ جاتی ہے، جو بیرونی دشمنوں نے کھول رکھا ہے، آج مغرب سے مشرق تک آیاتِ جہاد پر، سیرت نبوی پر، صحابہ پر، اسلامی تاریخ پر، مسلمانوں کے معتقدات پر، اسلام کے عائلی قوانین پر، سیاسی ومعاشی نظام پر، تعزیری قوانین پر، غرض کہ شریعت اسلامی کے تمام پہلوؤں پر اعتراضات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے، جو اسلام کی دعوت واشاعت میں رُکاوٹ ہے، جس کے ذریعہ مسلمانوں کی نئی نسل کے دلوں میں شکوک وشبہات کے کانٹے بوئے جارہے ہیں، عالم اسلام میں ایک ایسی نسل پیدا کی جارہی ہے جو نفاق کی پروردہ ہے اور جو کھلے دشمنوں سے بڑھ کر اسلام اور مسلمانوں کی دشمن ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء اس محاذ پر توجہ دیں اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو اس راہ میں صرف کریں۔

ہندوستان میں دو اہم تاریخی درسگاہیں وجود میں آئیں، ایک: دارالعلوم دیوبند، جس کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ہیں، دوسرے: ندوۃ العلماء، جس کے مؤسس حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ ہیں، مزاج ومذاق اور مشرب ومنہج کے اعتبار سے ہندوستان کے مدارس وعلماء ان ہی دونوں درسگاہوں سے وابستہ ہیں، غور کرنے کی بات ہے کہ حضرت نانوتویؒ کی زندگی بھر کی کاوشوں کا اصل میدان آریہ سماجی اور عیسائی فتنہ کا تعاقب تھا، اہل قبلہ میں انھوں نے صرف روافض کے خلاف قلم اُٹھایا اور وہ بھی کمال نصح وخیر خواہی کے ساتھ اور حضرت مونگیریؒ نے اپنی تمام جد وجہد کا ہدف رد

عیسائیت اور قادیانیت کو بنایا، یعنی ان دونوں بزرگوں نے خارجی فتنوں کو اپنے سامنے رکھا؛ لیکن افسوس کہ آج اسلام کے خلاف اُٹھنے والے فتنے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں اور داخلی اختلافات ہماری کوششوں کا محور ہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے دشمنوں نے ہمیں ایک منصوبہ کے ساتھ اُلجھا کر رکھ دیا ہو، بقول شاد عظیم آبادی :

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلا دیا گیا ہوں

علماءکرام ! ہندوستان میں یہ وقت ہمارے لئے امتحان وآزمائش ہے، مدارس پر، دینی اداروں پر، علماء اور مذہبی شخصیتوں پر اور دین دار نوجوانوں پر گھیرے تنگ کئے جارہے ہیں، ان پر بے ثبوت دہشت گردی کے الزامات لگائے جاتے ہیں، انھیں ملک کی سالمیت کے لئے خطرہ قرار دیا جاتا ہے اور مختلف پہلوؤں سے خوف زدہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، دوسری طرف تحریص وترغیب کے دام بچھائے جاتے ہیں، کبھی مدارس کے اساتذہ کو تنخواہوں کی پیشکش کی جاتی ہے، کبھی مساجد کے ائمہ کو تنخواہوں کی لالچ دی جاتی ہے، یہ دوسری آمازمائش پہلی آزمائش سے بڑھ کر ہے، مقصد دونوں کا ایک ہی ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کے مذہبی رہنما ہیں اور جن اداروں کی حیثیت دین حق کے سرچشموں کی ہے، انھیں یا تو خوف زدہ کر دیا جائے یا انھیں خرید لیا جائے، جو لوگ ترغیب وتحریص کے ذریعہ غلام بنائے جاسکتے ہوں، ان کو سونے کی زنجیر پہنا کر اپنا غلام بنالیا جائے اور جن پر تحریص کا اثر نہیں ہوتا، ان کے قدموں میں لوہے کی زنجیر ڈال دی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے اور اہل مغرب کے درمیان ایک دور صلیبی جنگوں کا رہا، جو روایتی ہتھیاروں کی جنگ تھی، جو مسلمانوں کی فتح پر اختتام پذیر ہوئی، پھر ایک دور مغربی استعماریت کا آیا، جس میں عالم عرب کا ایک بڑا حصہ مغرب کے زیر اقتدار چلا گیا اور مغربی طاقتوں نے زر وزمین کو فتح کرنے پر اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ پورے عالم اسلام میں ایک ایسے نظام تعلیم کو رواج دیا، جو مسلمانوں کو اسلام کے تئیں شکوک وشبہات میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہو جائے اور پوری دنیا میں مغربی ثقافت کو ایک عالمی تہذیب کی حیثیت سے اُبھارنے کی بھرپور کوشش کی گئی اور بڑی حد تک وہ ان مقاصد میں کامیاب بھی رہے؛ لیکن ایک قوم کا دوسری قوم پر مالک اور فرمانروا کی حیثیت سے مسلط رہنا غیر فطری بات ہے؛ اس لئے سیاسی غلامی کی زنجیریں کٹتی گئیں؛ مگر مغرب نے اپنے فکری وثقافتی

غلامی کی جو تخم بوئی تھی ، وہ پروان چڑھتی گئی ، دنیا میں کسی اور مذہب کے اندر اس فکری اور ثقافتی استعماریت کے خلاف نبرد آزما ہونے کی صلاحیت نہیں ہے ، اگر یہ صلاحیت ہے تو صرف اسلام اور مسلمانوں کے اندر ہے ، جسے اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق قیامت تک باقی رہنا ہے۔

غور کیا جائے تو مسلم معاشرہ میں اسلام کے بنیادی طور پر تین سرچشمے تھے : اسلامی حکومتیں ، علماء اور ان کی درسگاہیں اور مسجدیں ، مسلم حکومتیں اب پوری طرح مغرب کے سامنے سربسجود ہو چکی ہیں ، وہ اپنے عوام کے بادشاہ ہیں اور مغرب کے غلام ؛ لہٰذا اب مساجد اور مدارس باقی رہ گئے ، اسلام کے دشمنوں نے اس رمز کو پالیا ہے کہ یہ مسلمانوں کی شہ رگ ہیں ، اگر ہم نے اس کو قابو میں کر لیا تو پھر ہماری کوششوں میں کوئی رُکاوٹ باقی نہیں رہ جائے گی ؛ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اہل علم اس دُوررس سازش کو محسوس کریں اور نقش دیوار کو پڑھیں کہ جس حکومت کو ہزاروں مسلمانوں کا قتل ذرا بھی بے چین نہیں کرتا ، جن کو مسلمانوں کی معاشی پستی ، تعلیمی پسماندگی اور سیاسی محرومی کا ذرا بھی احساس نہیں ، یہاں تک کہ اقلیت کے لئے جو فنڈ منظور کیا جاتا ہے ، وہ پورا کا پورا یا اس کا غالب حصہ واپس ہو جاتا ہے ، اسے ہمارے مساجد و مدارس کی فکر کیوں بے قرار کرتی ہے؟ ہم میں سے بہتوں نے حلب کے محدث شیخ سعید حلیمی کا واقعہ پڑھا ہے کہ انھوں نے حاکم وقت ابراہیم پاشا بن محمد علی کے آنے پر اپنے پاؤں نہیں سمیٹے ، پھر اسی حاکم کی طرف سے دینار کی تھیلی آئی تو قبول کرنے سے معذرت کی اور فرمایا : ''**یمد رجلیه من لا یمد یدیه**'' یہ فقرہ اس لائق ہے کہ موجودہ حالات میں علماء اس کو آبِ زر سے لکھ کر زینت دیوار بنائیں اور طمع وحرص کی راہ سے جو ابتلاء آرہی ہے اس میں اپنے آپ کو ثابت قدم رکھیں۔

محترم حاضرین ! اکیڈمی کا یہ تاریخی تیئسواں فقہی سیمینار گجرات کی سرزمین پر منعقد ہورہا ہے ، ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں گجرات کو نمایاں حیثیت حاصل ہے ، اس سرزمین پر خود کاروان حجاز اُترا ہے اور یہاں انھوں نے اپنے خیمے نصب کئے ہیں ، یہیں ربیع بن صبیح جیسی شخصیت پیوند خاک ہوئی ، جن کو ابن ندیم نے پہلا اسلامی منصف قرار دیا ہے ، کتنے ہی محدثین ، فقہاء و مفسرین ، اہل دل صوفیاء اور نیک طینت سلاطین ہیں ، جنھوں نے اپنے وجود سے اس سرزمین کو زینت بخشی ہے اور یہیں آسودۂ خواب ہیں ، گجرات میں عظیم الشان دینی جامعات اور جاذب قلب ونظر مساجد شاید انھیں پاکیزہ روحوں کا فیض ہے ، جن کے نالۂ نیم شبی اور آہِ سحر گاہی نے یہاں کی فضا کو حرارت بخشی تھی ،

یہ تپش ایمانی اب تک اس کے وجود میں پنہاں ہے اور انشاء اللہ ہزار آزمائشوں اور ابتلاؤں کے باوجود باقی رہے گی، اگر برق گرانے والوں کو ضد ہے تو نشیمن بنانے والوں کا حوصلہ بھی انشاء اللہ شکست نا آشنا ہے اور: ''وَ اللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ''۔(الصّف:۸)

حضرات! اکیڈمی کا یہ سیمینار بھی نہایت اہم موضوعات پر ہے، استصناع کا معاملہ زیر بحث ہے، اس عقد کو اس اعتبار سے خصوصی اہمیت حاصل ہے کہ اصل میں اس کی بنیاد عرف پر ہے اور اس کو عقود کے متعلق بعض عمومی احکام سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے، معدوم کی بیع جائز نہیں ہے؛ لیکن سلم کی طرح استصناع میں معدوم کی بیع ہوتی ہے، یہ درست نہیں ہے کہ عقد معاوضہ میں عوضین مؤجل ہوں؛ لیکن استصناع میں اس کی گنجائش رکھی گئی ہے اور اسلامی مالیاتی اداروں میں تمویل کے ایک اہم وسیلہ کے طور پر اس کا استعمال کیا جاتا ہے، اُمید ہے کہ ہندوستان میں مستقبل قریب میں اسلامی اُصولوں پر استثمار کی اجازت مل جائے گی، اس موضوع پر بحث سے یہ فائدہ ہوگا کہ اس وقت ملک کے شریعہ ماہرین کے سامنے معاملہ کی پوری تصویر رہے گی۔

وصیت، ہبہ اور میراث سے متعلق چند ایسے مسائل کو خاص طور پر شامل کیا گیا ہے، جو کثیر الوقوع ہیں اور ہندوستان کے بدلتے ہوئے سماجی حالات میں ان کی بڑی اہمیت ہے، ان پر شریعت کے مقاصد، اُصول ومبادی اور فقہاء کے اجتہادات کی روشنی میں غور کرنے کی ضرورت ہے، آج دنیا ایک گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے؛ اس لئے ہم عالمی مسائل سے بے تعلق نہیں رہ سکتے، اکیڈمی پہلے بھی ایسے مسائل کو زیر بحث لاتی رہی ہے اور اس سیمینار میں بھی ایک اہم مسئلہ شہریت کا زیر غور ہے، مختلف اسباب کے تحت موجودہ زمانے میں نقلِ مکانی اور ترکِ وطن کے واقعات کی کثرت ہو رہی ہے، اس لحاظ سے یہ مسئلہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، ان کے علاوہ کچھ اور مسائل بھی ہیں جو آپ کے سامنے آئیں گے، جن کی سماجی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت ہے اور ان کے بارے میں آپ کے فیصلہ سے اُمت کو روشنی حاصل ہوگی۔

اللہ تعالیٰ گذشتہ سیمیناروں کی طرح اس کو بھی کامیابی اور قبولیت سے نوازے، اکیڈمی آپ حضرات کی بے حد شکر گزار ہے کہ گذشتہ سیمیناروں کی طرح اس بار بھی اپنی تشریف آوری کے ذریعہ اکیڈمی کے خدّام کا حوصلہ بڑھایا ہے، اُمید ہے کہ مستقبل میں بھی اسی طرح اکیڈمی کو آپ کا تعاون حاصل رہے گا۔

اس وقت اجلاس کی میزبانی جامعہ علوم القرآن جمبوسر کررہا ہے، جس نے نہایت قلیل عرصہ میں اتنی تیز رفتار ترقی کی ہے، جو اس کے بانی و ذمہ دار محب محترم حضرت مولانا مفتی محمد احمد دیولوی دامت برکاتہم کی گویا زندہ کرامت ہے، ہم لوگ ۱۴۱۵ھ میں ساتویں سیمینار کی مناسبت سے بھروچ آئے تھے، اس وقت یہاں بھی حاضری ہوئی تھی، جب یہ افتادہ زمین تھی اور غالباً ایک دو نامکمل کمرے بنے ہوئے تھے؛ لیکن آج یہ اسلامی طرز کی خوبصورت عمارتوں کا ایک شاہکار اور دینی وعصری تعلیم کے اداروں کا گلشن سدابہار ہے، جو آنکھوں کو لذتِ دید اور دل و دماغ کو فرحت عید فراہم کررہا ہے اور حسن اتفاق ہے کہ مہمان اور میزبان دونوں اپنی عمر کے پچیسویں سال میں ہیں، اکیڈمی کے بھی پچیس سال پورے ہونے کو ہیں اور جامع علوم القرآن کے بھی، اللہ تعالیٰ ان دونوں اداروں کو کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار فرمائے اور ہر طرح کے شرور سے ان کی حفاظت فرمائے۔ آمین

ربنا تقبل منا إنک أنت السمیع العلیم ، والصلاۃ والسلام علی خیر خلقه محمد وعلیٰ آله وصحبه أجمعین ۔

● ● ●

فقہ شافعی — تعارف اور خدمات ☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله واصحبه أجمعين ، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أما بعد۔

صدر عالی قدر، علماء کرام، بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! اللہ کی زمین پر ہمیں جنگلات بھی نظر آتے ہیں اور پُر بہار و جاذب نظر باغات بھی، درختوں کے بَن بھی اور سجے سجائے گلشن بھی، دونوں جگہ سبز دوپٹوں میں ملبوس ٹہنیاں، آسمان کی طرف نظر اُٹھائے ہوئے دراز قامت درخت، کہیں خوش رنگ وخوشبودار پھول اور کہیں خوش ذائقہ پھل پائے جاتے ہیں، اگر ان کے درمیان کوئی فرق ہے تو وہ فرق ہے تہذیب وآرائش کا، جنگل کے درخت اور پودے کیف ما اتفق بڑھتے چلے جاتے ہیں اور یہی درخت جب کسی پارک کا حصہ ہوتے ہیں تو مالی ان کی تہذیب اور کاٹ چھانٹ کرتا ہے، درختوں کو سجاتا ہے، کیاریوں کو آراستہ کرتا ہے اور اس طرح یہ سجا سجایا گلستاں ایک فرحت بخش اور جاں نواز تفریح کی جگہ بن جاتی ہے، لوگ یہاں اپنی آنکھیں بھی ٹھنڈی کرتے ہیں، اس کی پُر کیف ہواؤں سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں اور اس کے عطر بار پھولوں سے مشام جان کو معطر بھی کرتے ہیں۔

جنگل کو منگل اور ایک کوچۂ ویران کو گلستان بنانے میں جو کردار مالی ادا کرتا ہے، انسانی سماج کو سنوارنے میں وہی کردار 'قانون' کا ہوتا ہے، قانون انسان کی نہ ختم ہونے والی خواہشات اور ناپیدا کنار آرزوؤں اور تمناؤں کی تہذیب کرتا ہے، اس کے لئے اخلاقی حدود قائم کرتا ہے، سماج کو تصادم سے بچاتا ہے، ظالم کو ظلم سے روکتا ہے، مظلوم کو اس کا حق دلاتا ہے اور سماج میں رہنے والے تمام لوگوں کے حقوق وفرائض متعین کرتا ہے، جس سماج میں قانون کی حکمرانی نہ ہو وہ انسانوں کی آبادی نہیں؛ بلکہ وہ انسانوں کا جنگل ہے اور جو سماج قانون کی بندش کو قبول کرتا ہو، وہ انسانیت کا گلشن ہے،

☆ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے تحت جامعہ حسینیہ شری وردھن میں منعقدہ سیمینار میں یہ کلیدی خطبہ پیش کیا گیا۔

جس میں محبت کے پھول کھلتے ہیں اور امن وآشتی کے پھل پروان چڑھتے ہیں۔

اسی لئے تاریخ کے ہر دور میں کوئی مہذب سماج ایسا نہیں جو قانون کی حکمرانی سے خالی رہا ہو، یہ قوانین بنیادی طور پر دو طرح کے رہے ہیں، ایک: انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین، خواہ اس کو ایک فرد نے بنایا ہو، یا کچھ افراد نے، یا جمہور نے، دوسرے: الہامی قوانین، جو اللہ کی طرف سے اپنے بندوں کے لئے بھیجے جاتے رہے ہیں، جس دن سے انسانوں کی یہ بستی بسائی گئی ہے، اسی دن سے خدا کی طرف سے اسے زندگی بسر کرنے کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے، اسی الٰہی قانون کا نام ''شریعت'' ہے: ''**لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجاً**'' (المائدۃ:۴۸) اسی الہامی قانون کی آخری اور مکمل شکل شریعت محمدی ﷺ ہے، جو انسانی زندگی کے لئے سب سے زیادہ موزوں، اس کی فطرت سے ہم آہنگ اور اس کی ضروریات کو پورا کرنے والا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ کسی انسان کے لئے اسی ذات کا بنایا ہوا نظام حیات مفید اور موزوں ہوسکتا ہے، جو اس کی خوبیوں اور خامیوں سے، جذبات وخواہشات سے اور اس کی ضروریات سے پوری طرح واقف ہو، وہ اس کا ہمدرد و بہی خواہ بھی ہو اور اس کے ساتھ پورا پورا انصاف بھی کرسکتا ہو، اللہ تعالیٰ کی ذات سے بڑھ کر علیم وخبیر کونسی ذات ہوسکتی ہے؟ خالق سے بڑھ کر کون انسان کے لئے رؤف ورحیم ہوسکتا ہے؟ اور رب کریم سے بڑھ کر کون اپنی مخلوق کے لئے انصاف کرسکتا ہے؟ اس لئے یہ بات پوری طرح عقل وحکمت کے مطابق ہے کہ خالق کا بھیجا ہوا قانون مخلوق کے لئے سب سے زیادہ مناسب ہو۔

حضرات ! قانونِ شریعت کے بنیادی طور پر چار مصادر ہیں: کتاب اللہ، سنت رسول، اجماع اور قیاس، اور ان سے احکام کے اخذ واستنباط کا نام ''اجتہاد'' ہے، اجتہاد معمولی کام نہیں، اس کے لئے گہرے علم، آخری درجہ کی محنت، خشیتِ الٰہی اور مقاصدِ شریعت سے آگہی کی ضرورت ہے؛ کیوں کہ کتاب وسنت کی جن نصوص سے احکام شرعیہ مستنبط کئے جاتے ہیں، بحیثیت مجموعی ان کی درج ذیل صورتیں بنتی ہیں :

(۱) نص اپنے ذریعۂ ثبوت کے اعتبار سے قطعی ویقینی ہو اور جو مراد اس سے واضح ہوتی ہو، اس کے علاوہ کسی اور معنی کا احتمال نہ ہو، —— جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ**'' (البقرۃ:۱۷۳) یعنی اللہ نے تم پر مردار، خون اور سور کو حرام کردیا ہے، یا جیسے رسول اللہ ﷺ نے آپ کی طرف غلط بات منسوب کرنے کو منع فرمایا: ''**من كذب على متعمداً**

فلیتبوأ مقعدہ من النار ''(بخاری، کتاب العلم، باب إثم من کذب الخ،حدیث نمبر:۱۰۷) کہ یہ حدیث، رسول کی طرف کسی بات کی جھوٹی نسبت کوواضح طور پرحرام قراردیتی ہے۔

(۲) وہ احکام جو ثابت تو ہوں یقینی دلیل سے؛لیکن جو کلمات استعمال کئے گئے ہیں، ان میں ایک سے زائد معنوں کا احتمال ہو،—— جیسے:''**لاَ تَنكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ**'' (النساء:۲۲) نکاح کے معنی عقد نکاح کے بھی ہیں اور مطلقاً عورت سے صنفی تعلق قائم کرنے کے بھی، پہلی صورت میں معنی ہوگا کہ باپ کی جائز منکوحہ سے نکاح حرام ہواور دوسری صورت میں یہ معنی بنے گا کہ اگر کسی عورت سے باپ نے بدکاری کرلی ہوتو وہ بھی بیٹے کے لئے حرام ہوگی۔

(۳) نص اپنے ذریعۂ ثبوت کے اعتبار سے بھی یقینی ہواور اس کا لغوی معنی بھی معلوم ہو؛ لیکن اصطلاحی اعتبار سے اس کا دائرہ کیا ہوگا؟ یہ بات معلوم نہیں ہو—— جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**أَحَلَّ اللهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا**'' (البقرة:۲۷۵) ''ربا'' کے لغوی معنی زیادتی کے ہیں؛لیکن ہر زیادتی حرام نہیں ہے، قرآن مجید نے اس لفظ کو ایک اصطلاح کے طور پر ذکر کیا ہے، اب کن دوطرح کی اشیاء کے باہمی تبادلہ میں کمی بیشی یا نقد واُدھار پر ربا کا اطلاق ہوگا؟ یہ اس کے لغوی معنی سے واضح نہیں ہوتا؛اسی لئے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اللہ نے ربا کو حرام قرار دیا ہے؛لیکن اس کا واضح بیان ہمارے سامنے نہیں آیا؛لہٰذا سود سے بھی بچواور شبہ سود سے بھی ''**دعوا الربوا والريبة**''۔(۱)

(۴) نصوص میں کچھ احکام تعبدی ہوتے ہیں،یعنی ان کی مصلحت ہمیں معلوم نہیں ہوتی —— جیسے نماز میں قرأت قرآن کا حکم قیام کی حالت میں، اور تسبیحات کا رکوع وسجود کی حالت میں، اور کچھ احکام کی مصلحت سمجھ میں آجاتی ہے، ایسی نصوص کو ''معلل'' کہتے ہیں، اب بعض نصوص کے بارے میں یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ یہ تعبدی ہے اور لفظی معنی تک ہی اس کا دائرہ محدود ہے، یا یہ حکم کسی خاص علت کے تحت ہے اور اس علت کے لحاظ سے اس حکم کا دائرہ وسیع ہوجائے گا؟ جیسے اللہ تعالیٰ نے مضطر شخص کے لئے جان بچانے کی غرض سے حرام غذا کے استعمال کی اجازت دی ہے، (البقرة:۱۷۳) اگر یہ حکم تعبدی ہوتو صرف حرام غذا تک یہ اجازت محدود ہوگی، اور اگر یہ حکم علت پر مبنی ہواور علت جان کا بچانا ہوتو بطور علاج حرام دوا کے استعمال کی بھی اجازت ہوگی؛ کیوں کہ دونوں کا مقصد جان کا بچانا ہے، اسی طرح آپ ﷺ نے خفین پر مسح کی اجازت دی ہے، ''خف'' اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے

---

(۱) ابن ماجہ، کتاب التجارات، باب التغليظ في الربا، حدیث نمبر:۲۲۷۶۔

چرمی موزے کو کہتے ہیں، اب ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ یہ حکم تعبدی ہو اور صرف چمڑوں کے موزوں ہی پر مسح درست ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ مسح کے جائز ہونے کی علت کسی دبیز چیز سے پاؤں کو چھپائے رکھنا ہو، تو ایسی صورت میں 'جوربین' بھی اس حکم میں شامل ہوگا۔

(۵) بعض دفعہ نص ایسے یقینی ذریعہ سے ثابت نہیں ہوتی، جس میں مستند و معتبر ہونے کے اعتبار سے کوئی شبہ باقی نہیں رہے — جیسے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب امام ''**ولاالضآلین**'' کہے تو تم آمین کہو ''**إذا قال الإمام ولا الضآلین فقولوا آمین**'' (**ابوداود، کتاب الصلاۃ، باب التأمین**، حدیث نمبر: ۹۳۶) یہ ایک معتبر حدیث ہے اور محدثین کی اصطلاح میں ''خبر واحد'' ہے؛ لیکن قرآن اور متواتر حدیث کے درجہ کی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی اس کا انکار کردے تو اس کو کافر نہیں کہا جاسکتا۔

(۶) بعض نصوص ذریعۂ ثبوت کے اعتبار سے بھی کم درجہ کی ہوتی ہیں اور ان کے اندر ایک سے زائد معنوں کا احتمال بھی ہوتا ہے، — جیسے رسول اللہ ﷺ نے کسی چیز کو قبضہ میں لینے سے پہلے فروخت کرنے سے منع کیا ہے؛ لیکن قبضہ سے کون سی کیفیت مراد ہے؟ یہ متعین نہیں ہے۔

(۷) جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، بعض نصوص میں ظاہری اعتبار سے تعارض ہوتا ہے، — جیسے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب**'' (ابوداود، کتاب الصلاۃ، باب من ترک القراءۃ، حدیث نمبر: ۸۲۲) اور دوسری حدیث میں ہے: ''**انما جعل الإمام لیئوتم به إذا کبر فکبروا وإذا قرأ فانصتوا**'' (ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلوٰۃ، باب إذا قرأ الامام الخ، حدیث نمبر: ۸۴۶) پہلی حدیث سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ امام، مقتدی اور منفرد سب کو سورۂ فاتحہ پڑھنی ہے اور دوسری حدیث سے معلوم ہوا کہ مقتدی کو سورۂ فاتحہ نہیں پڑھنی چاہئے۔

(۸) بعض مسائل میں قرآن و حدیث کی ہدایت موجود نہیں ہوتی، صحابہ کے آثار ہوتے ہیں؛ لیکن ان کے درمیان اختلاف رائے ہوتا ہے — جیسے مفقود الخبر شخص کی بیوی کے لئے حضرت عمر ﷺ نے چار سال انتظار کرنے کا فیصلہ کیا اور حضرت علی ﷺ نے شوہر کے ہم زمانہ لوگوں کی موت تک انتظار کرنے کا۔

(۹) بعض دفعہ ایک مسئلہ میں صراحتاً کوئی آیت، حدیث یا صحابہ کی رائے موجود نہیں ہوتی، اس میں قیاس کی ضرورت ہوتی ہے اور قیاس کی دو الگ الگ جہتیں پائی جاتی ہیں، مثلاً ایک انسان کے

جسم میں دوسرے انسان کے خون چڑھانے کا مسئلہ ہے، ایک طرف وہ حدیث ہے، جس میں ایک عورت کے لئے دوسرے انسان کے بال کے استعمال کو منع کیا گیا ہے، دوسری طرف شریعت کا یہ حکم ہے کہ بچہ مدتِ رضاعت میں عورت کا دودھ پی سکتا ہے، پہلے حکم کا تقاضا یہ ہے کہ ایک انسان کے جسم میں دوسرے انسان کا خون چڑھانا جائز نہ ہو؛ کیوں کہ یہ جزوِ انسانی سے فائدہ اُٹھانا ہے، دوسرے حکم کا تقاضا ہے کہ جائز ہو؛ کیوں کہ جب غذا کے طور پر جزوِ انسانی کا استعمال جائز ہے تو دوا کے طور پر بھی اسے جائز ہونا چاہئے، اب مجتہد کو متعین کرنا ہے کہ اس مسئلے میں کونسی جہت پیش نظر رہنی چاہئے؟

(۱۰) بعض دفعہ نصوص کا لغوی معنی تو واضح ہوتا ہے؛ لیکن اس کی مراد عرف سے متعین ہوتی ہے اور عرف کی تبدیلی کے لحاظ سے احکام بدلتے ہیں، — جیسے نفقہ کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: ''**وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ**'' (البقرۃ: ۲۳۳)؛ لیکن نفقہ میں ''معروف'' مقدار کیا ہے؟ اس کے لئے کوئی ایک پیمانہ نہیں ہے، احوالِ زمانہ کے لحاظ سے اس کو متعین کیا جاتا ہے۔

اس طرح یہ دس صورتیں بنتی ہیں، **تلک عشرۃ کاملہ** — ان میں سے پہلی صورت وہ ہے، جس میں نہ اجتہاد کی ضرورت ہے اور نہ تقلید کی، بقیہ نو قسم کے احکام وہ ہیں، جن میں اجتہاد کی صلاحیت رکھنے والوں کو اجتہاد کی اور نہ رکھنے والوں کو تقلید کی ضرورت پیش آتی ہے، جن مسائل میں اجتہاد کی ضرورت نہیں ہوتی، عام طور پر وہ اجماعی اور متفق علیہ ہیں، اور جن میں اجتہاد کی ضرورت ہوتی ہے، بالعموم ان میں اختلافِ رائے بھی پایا جاتا ہے۔

ان مسائل کو حل کرنے میں مجتہد کو جو آبلہ پائی کرنی پڑتی ہے، اس کو سمجھنے کے لئے جاننا چاہئے کہ مجتہد کو کم سے کم یہ کام کرنے پڑتے ہیں:

(الف) اس بات کی تحقیق کہ یہ نصوص مستند طور پر ثابت ہیں یا نہیں؟ — اور یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے؛ کیوں کہ احکام سے متعلق مختلف درجات کی احادیث کی تعداد کم وبیش چار ہزار سے زیادہ ہے، اتنی ساری احادیث کی سند کی تحقیق، راویوں کے احوال کی تلاش اور پھر درایت اور واقعاتی پہلو سے اس کے معتبر اور نامعتبر ہونے کا فیصلہ کرنا، یہ سب نص کی تحقیق میں داخل ہے۔

(ب) مجتہد کا دوسرا کام متعارض روایات میں تطبیق وترجیح، نیز یہ معلوم کرنا ہے کہ اس میں سے کوئی نص منسوخ تو نہیں ہے؟ — اس کے لئے نصوص کے وسیع ذخیرہ پر عمیق نظر اور شریعت کے مزاج ومذاق سے آگہی ضروری ہے۔

(ج) مجتہد کا تیسرا کام یہ ہے کہ نصوص میں جو کلمات وارد ہوئے ہیں، وہ اس کا مفہوم متعین کرے، اس میں دونوں باتیں شامل ہیں: یہ بھی کہ الفاظ کا لغوی معنی متعین کیا جائے اور دیکھا جائے کہ اس سے ظاہری معنی ہی مراد ہے یا ظاہر اور متبادر معنی سے الگ کوئی اور معنی مراد ہے؟ کیوں کہ بعض دفعہ کوئی بات بطور تشبیہ کے کہی جاتی ہے، بعض اوقات لفظ عام ہوتا ہے، مراد خاص ہوتی ہے، بعض دفعہ ایک لفظ کے کئی معانی ہوتے ہیں اور قرائن سے معلوم کرنا پڑتا ہے کہ یہاں لفظ مشترک کا کونسا معنی مراد ہے؟ —— دوسرے: تعبیر کے لب ولہجہ سے یہ بات متعین کرنی ہوتی ہے کہ شارع کا مقصود کیا ہے؟ مثلاً: امر وجوب کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، اباحت کے لئے بھی اور استحباب کے لئے بھی، اس کے علاوہ ایک صورت ''امر ارشاد'' کی بھی ہوتی ہے، نص کے لب ولہجہ اور قرائن کی روشنی میں یہ بات متعین کی جاتی ہے کہ یہاں کونسا معنی مراد ہے؟ —— ظاہر ہے کہ اس کے لئے عربی لغت، عربی زبان کے قواعد اور اُصولِ فقہ پر وسیع نظر ضروری ہے۔

(د) جن مسائل میں کوئی نص موجود نہ ہو، ان میں مجتہد کو دوسرے نظائر کو سامنے رکھتے ہوئے قیاس سے کام لینا ہوتا ہے اور قیاس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے کتاب وسنت میں آنے والے حکم کی علت دریافت کی جائے، اور پھر جو مسائل درپیش ہیں، ان پر اس علت کو منطبق کیا جائے، اس کے لئے گہری بصیرت اور خداداد ذہانت مطلوب ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ کام عوام تو کیا عام علماء بھی نہیں کر سکتے؛ بلکہ اس کے لئے غیر معمولی علم بھی مطلوب ہے اور خشیتِ الٰہی بھی، علم اس لئے کہ نادانستہ غلطیوں سے بچا جا سکے اور خشیت اس لئے کہ دانستہ غلطیوں سے بچا جا سکے؛ کیوں کہ اگر انسان خشیت الٰہی سے خالی ہو تو احکام شریعت کی رہنمائی میں اجتہاد کے نام پر اپنی خواہش کو بھی شامل کر سکتا ہے اور بعض دفعہ حکومت یا کسی اور طبقہ کے جبر ودباؤ اور تحریص سے بھی متاثر ہو سکتا ہے۔

اس مختصر وضاحت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اجتہاد کتنا دشوار کام ہے اور اس کے لئے کتنی غیر معمولی صلاحیت درکار ہے؟ —— اسی بنا پر تاریخ میں بہت کم لوگ ایسے گذرے ہیں، جن کو اُمت نے اس کا اہل تسلیم کیا ہے، یہاں تک کہ صحابہ کرام جو براہِ راست رسول اللہ ﷺ کے فیض یافتہ تھے، ان میں بھی علامہ ابن قیمؒ نے صرف ۱۳۰ شخصیتوں کو فقیہ ومجتہد شمار کیا ہے، تاہم یہ اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب ہے کہ ملت اسلامیہ کی بہترین ذہانتیں اجتہاد اور فقہ کی آبیاری میں خرچ ہوئی ہیں۔

محترمانِ گرامی قدر! جیسے اجتہاد ایک ضرورت ہے، جو لوگ اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتے، ان کے لئے تقلید بھی اسی طرح ضروری ہے؛ کیوں کہ ناواقف حضرات کے لئے خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**فَاسْأَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ**'' (النحل: ۴۳) یہاں ذکر سے علم مراد ہے، (تفسیر ابن کثیر: ۵/ ۷۲) یعنی جو لوگ خود احکام شرعیہ سے واقف نہ ہوں، وہ اہل علم سے دریافت کر کے ان پر عمل کریں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**أَطِيْعُوْا اللهَ وَأَطِيْعُوْا الرَّسُوْلَ وَأُوْلِيْ الأَمْرِ مِنْكُمْ**'' (النساء: ۵۹) یعنی اللہ کی اطاعت کرو، اللہ کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اولی الامر کی، حضرت عبد اللہ بن عباس ؓ نے فرمایا کہ ''اولی الامر'' سے مراد اصحابِ فقہ اور اصحابِ دین ہیں: ''**اهل الفقه والدين**'' (مستدرک حاکم: ۱/ ۱۲۳، کتاب العلم، باب فی توقیر العالم، حدیث نمبر: ۴۲۳) اور یہ بات بالکل انسانی عقل اور فطرت کے بھی مطابق ہے کہ جو لوگ ناواقف ہوں، وہ واقف شخص سے دریافت کر کے اس پر عمل کریں، ہم لوگ شب و روز علاج کے معاملہ میں ڈاکٹر پر، مکان اور مشنریز کے لئے انجینئرز پر اور قانونی مشورہ کے لئے وکلاء پر بھروسہ کرتے رہتے ہیں، تو جیسے زندگی کے دوسرے مسائل میں ہم تقلید پر کاربند ہیں، یا جیسے ہم راوی کے معتبر یا نامعتبر ہونے کے سلسلے میں ماہرین اسماء رجال اور محدثین کی آراء پر بھروسہ کرتے ہیں، ٹھیک اسی طرح احکام شرعیہ میں بھی ضروری ہے کہ انسان اپنے سے زیادہ صاحب علم اور احکام شریعت سے باخبر شخص کی رائے پر عمل کرے، اسی کا نام ''تقلید'' ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تیسری صدی ہجری کے بعد ہمیں کوئی ایسی شخصیت نہیں ملتی کہ جس نے تمام یا معتد بہ مسائل کے بارے میں خود اجتہاد کیا ہو، امام ابو جعفر محمد ابن جریر طبریؒ (متوفی: ۳۱۰ھ) آخری شخصیت ہیں، جن کو مجتہد شمار کیا گیا، اس کے بعد بڑے بڑے اہل علم آئے؛ لیکن انھوں نے اجتہاد کے بجائے تقلید کا راستہ اختیار کیا اور اگر کسی نے اجتہاد بھی کیا، تو دو چار مسائل میں، اگر اِکا دُکا کسی نے اپنے مجتہد ہونے کا دعویٰ بھی کیا تو اُمت میں اسے قبول حاصل نہ ہو سکا، یہاں تک کہ خود محدثین جیسے امام مسلم، امام ابوداؤد، امام نسائی، بیہقی، دارقطنی، طحاوی اور زیلعی جیسے اہل علم —— جن کے پاس حدیث کا وافر ذخیرہ موجود تھا —— نے بھی اجتہاد کی بجائے اتباع و تقلید ہی کو اپنے لئے بہتر تصور کیا، ان کا یہ عمل کسل مندی یا اللہ اور رسول کو چھوڑ کر کسی اور شخص کی پیروی کے جذبہ پر مبنی نہیں تھا؛ بلکہ یہ ایک فطری بات ہے کہ کوئی بھی فن بتدریج ترقی کر کے اوجِ کمال تک پہنچ جاتا ہے، پھر اس میں کہیں کہیں جزوی خدمت کی ضرورت پڑتی ہے، جیسے عربی قواعد ہی میں نحو و صرف کے علوم ہیں کہ یہ

اپنی پختگی اور ترقی کا سفر پورا کر چکے ہیں، اب آج اگر اس میں کسی نئی بات کا اضافہ نہ ہو تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ لوگوں نے اس فن میں جمود اختیار کرلیا ہے، یہ جمود نہیں ہے؛ بلکہ تکمیل ہے، اسی طرح بعد کے اہل علم نے جو تقلید کا راستہ اختیار کیا، وہ یہی محسوس کر کے کہ زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق جو رہنمائی ہوسکتی تھی اور جن مختلف آراء کا امکان تھا، نیز مختلف صحابہ کے جو فتاویٰ تھے، سلف صالحین نے ان سب کو اپنے اجتہاد میں سمولیا ہے، اب از سرنو اس کام کو کرنا ایک عبث کام ہوگا۔

غرض کہ نفسِ تقلید کے بارے میں تو کسی کلام کی گنجائش نہیں، شبہہ ''تقلید شخصی'' کے بارے میں پیدا ہوتا ہے؛ لیکن غور کیا جائے تو خود عہد نبوی میں تقلید شخصی کی مثالیں موجود ہیں، رسول اللہ ﷺ مختلف علاقوں میں صحابہ کو بھیجتے اور اس علاقہ کے لوگوں کے لئے ہدایت ہوتی کہ وہ ان کی تعلیمات پر عمل کریں، جیسے حضرت مصعب بن عمیر ﷺ کو مدینہ بھیجا گیا، حضرت علی اور حضرت معاذ بن جبل ﷺ یمن بھیجے گئے، عہد فاروقی میں حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ کو خاص طور پر کوفہ بھیجا گیا، خود حضور ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ عبداللہ بن مسعود ﷺ کو جو پسند ہو، میں نے اپنی اُمت کے لئے اس کو پسند کیا:

''**رضيت لأمتي ما رضي به ابن أم عبد**'' (مستدرک حاکم، کتاب معرفۃ الصحابۃ، حدیث نمبر: ۵۳۸۷)

ظاہر ہے کہ وہاں کے لوگ ان ہی کے فتاویٰ پر عمل کرتے تھے اور اسی ارشاد نبوی کی وجہ سے صحابہ و تابعین حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ کی رائے کو خصوصی اہمیت دیتے تھے، یہ سب تقلید شخصی ہی کی صورتیں ہیں۔

بعد کو شخصی تقلید کو علماء نے واجب قرار دیا؛ لیکن بقول حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ یہ ''واجب لغیرہ'' ہے، یعنی تقلید شخصی بہ ذاتِ خود واجب نہیں ہے، سد ذریعہ کے طور پر واجب ہوئی ہے؛ کیوں کہ فقہاء کے درمیان بہت سے مسائل میں اختلافِ رائے ہے، ان میں بعض رائیں انسان کے لئے سہولت کا باعث ہیں؛ لیکن وہ قرآن وحدیث سے ہم آہنگ نہیں ہیں — اور انسانی کوشش میں اس طرح کی خامی کا پایا جانا اس کی عظمت یا اس کے اخلاص کے منافی نہیں ہے — اگر مختلف مسائل میں تقلید کی اجازت دے دی جاتی تو لوگ قرآن وحدیث کی اتباع کی بجائے خواہش نفس کی اتباع میں گرفتار ہوجاتے اور مختلف فقہاء کی اس رائے کو لے لیتے، جو ان کے مفاد کے مطابق ہوتی؛ اس لئے یہ بات بہتر سمجھی گئی کہ تمام مسائل میں کسی ایک ایسے فقیہ کی تقلید کی جائے، جس نے اپنے اجتہاد میں زندگی کے بیشتر مسائل کا احاطہ کیا ہو؛ تاکہ اتباعِ ہوی کا دروازہ بند ہوجائے اور لوگ کتاب وسنت کی پیروی پر قائم رہیں۔

البتہ پورے عہد تقلید میں دو باتوں کا لحاظ رکھا گیا، ایک: یہ کہ جو نئے مسائل پیدا ہوں، ان میں اجتہاد کیا جائے؛ تا کہ اُمت کسی بھی مسئلہ میں تاریکی میں اور شریعت کی روشنی سے محروم نہ رہے، اسی کو فقہ کی اصطلاح میں 'تخریج مسائل' یا 'تحقیق مناط' کہتے ہیں اور علماء متفق ہیں کہ یہ اجتہاد کی ایسی صورت ہے جو قیامت تک باقی رہے گی، یہی وجہ ہے کہ کسی دور میں یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوا کہ اب مجتہد نہیں رہے تو فلاں فلاں مسائل کیسے حل ہوں گے؟ —— دوسرے: چوں کہ کتاب اللہ اور سنت رسول کی اتباع ہی مقصود ہے اور ہر اجتہاد میں خطاء کا احتمال موجود ہے؛ اس لئے اگر امام کی کوئی رائے واضح طور پر نص سے متعارض ہو، یا عصری تبدیلیوں کی وجہ سے احتیاط کے خلاف ہوگئی ہو، یا شریعت کے بنیادی مقاصد سے ہم آہنگ نہ ہو، تو وہاں امام کے قول کو ترک کر دیا جاتا ہے، مذاہبِ اربعہ میں اس کی بہ کثرت مثالیں موجود ہیں؛ لیکن یہ حقیر صرف فقہ حنفی سے اس کی ایک ایک مثال عرض کرنے پر اکتفاء کرتا ہے:

- امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دارالحرب میں ربا جائز ہے؛ لیکن بہت سے فقہاء احناف خاص کر علماء ہند نے اس رائے پر فتویٰ نہیں دیا؛ کیوں کہ یہ رائے بظاہر صحیح اور صریح نصوص سے متعارض ہے۔
- امام ابوحنیفہؒ کے یہاں چہرہ اور گٹوں تک ہاتھ حصۂ ستر میں داخل نہیں ہے؛ لیکن متاخرین احناف نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے اور فتنہ کو دیکھتے ہوئے ضرورت کے مواقع کے سوا چہرہ کے چھپانے کو بھی واجب قرار دیا۔
- امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر کوئی مرد لاپتہ ہو جائے تو عورت کو اس کے ہم عصر لوگوں کے انتقال تک انتظار کرنا چاہئے، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ ہے؛ لیکن بعد کے فقہاء نے دیکھا کہ نکاح کا ایک اہم مقصد عفت و عصمت کی حفاظت ہے اور اتنا طویل انتظار عورت کی عزت و آبرو کو خطرہ میں ڈال سکتا ہے؛ اس لئے انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر مبنی امام مالکؒ کے فیصلے کو قبول کیا اور اسی پر فتویٰ دیا۔

اس طرح کی سینکڑوں مثالیں فقہاء کے یہاں موجود ہیں، خود فقہ شافعی میں کم سے کم بیس مسائل میں امام شافعی کے قولِ جدید کی بجائے قولِ قدیم کو فقہاءِ شوافع نے اختیار کیا ہے، غالباً اسی بنیاد پر ایک مستقل اُصول ''خروج من الخلاف'' کا تمام فقہاء کے یہاں پایا جاتا ہے کہ کسی بھی مسئلہ میں ایسے طریقہ پر عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ اس کے درست ہونے پر فقہاء کا اتفاق ہو، اس میں اصل مقصود فقہاء کے اختلاف سے بچنا نہیں ہے؛ بلکہ ان نصوص کی مخالفت سے بچنا ہے، جن پر مختلف فقہاء نے اپنی رائے کی بنیاد رکھی ہے۔

تقلید کی حقیقت ہی یہ ہے کہ ''جس شخص کی بات شریعت میں دلیل کا درجہ نہیں رکھتی ہو، اس کی بات کو دلیل پوچھے بغیر اس گمان کے تحت مان لیا جائے کہ اس نے قرآن وحدیث کو درست طور پر سمجھا ہے؛ لیکن اس میں خطاء کا احتمال بھی موجود ہے'' — اگرچہ کہ تقلید کی تعریف میں مختلف تعبیرات اختیار کی گئی ہیں؛ لیکن ان سب کا ماحصل یہی ہے، گویا مقلد تین باتوں کو مانتے ہوئے کسی فتویٰ پر عمل کرتا ہے، اول: یہ کہ کتاب اللہ اور سنت رسول کی طرح اس امام کی بات بذاتِ خود حجت ودلیل نہیں ہے، دوسرے: تقلید کا اصل مقصود کتاب وسنت کی پیروی ہے، تیسرے: امام مجتہد نبی کی طرح معصوم نہیں ہے؛ بلکہ اس کی رائے میں خطاء کا احتمال موجود ہے، — اب کون دیانت دار اور منصف مزاج شخص کہہ سکتا ہے کہ تقلید کرنے والا اپنے امام کو رسول کا درجہ دیتا ہے؟ تقلید اور اجتہاد کی تعریف تو ایک علمی بحث ہے؛ لیکن اگر آپ کسی عام آدمی سے بھی دریافت کریں کہ مثلاً تم فجر میں دو رکعت سنت اور دو رکعت فرض کیوں پڑھتے ہو؟ فریضۂ فجر سے پہلے کی یہ دو رکعت کس کی سنت ہے؟ اور دو رکعت فرض کس نیت سے ادا کرتے ہو؟ تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ یہ دو رکعت رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے، اور اس دو رکعت فرض کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، کوئی یہ نہیں کہے گا کہ یہ امام ابوحنیفہؒ یا امام شافعیؒ کی سنت ہے یا انھوں نے حکم دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ تقلید کی حیثیت کسی ماہر فن کی رائے سے فائدہ اُٹھانے کی ہے؛ لیکن عالم ہو یا عامی، ہر ایک کا مقصود اللہ اور اس کے رسول ہی کی اطاعت ہے؛ اسی لئے بہت سے مقلد علماء خاص کر ہمارے علماء دیوبند نے تقلید میں بھی غلو اور جمود کو منع کیا ہے۔

سامعین ذی احترام! بدگمانی اور غلط فہمی کا حال یہ ہے کہ بعض حضرات فقہ کو کتاب اللہ اور سنت رسول کے مقابل ایک الگ شئے قرار دیتے ہیں؛ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ فقہ کتاب اللہ اور سنت رسول سے کشید کیا ہوا عطر ہے نہ کہ اس کے مقابل کوئی چیز، مثلاً اگر کسی شخص کو نیت سے لے کر

سلام تک نماز کے احکام دیکھنے ہوں، تو اسے سینکڑوں حدیثیں دیکھنی ہوں گی، پھر راویوں کے حالات کھنگال کر ان کے درجات متعین کرنے ہوں گے، متعارض روایات میں ترجیح دینی ہوگی اور نہ جانے کتنے الفاظ کی لغوی تحقیق کرنی پڑے گی، شاید اس کے لئے سالہا سال مطلوب ہوں؛ لیکن اگر آپ فقہ کی کتابوں میں ''باب صفۃ الصلاۃ'' نکال لیں تو دو تین صفحات میں آپ کو ان تمام مباحث کا نچوڑ مل جائے گا اور نیت سے لے کر سلام تک کے تمام احکام آپ کے سامنے آجائیں گے؛ اس لئے انصاف کی بات یہ ہے کہ ہمیں فقہاء کا ممنون و شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے عام مسلمانوں کے لئے قرآن وحدیث پر عمل کرنے کو آسان کر دیا ہے۔

رہ گیا اس تقلید شخصی کا ائمہ اربعہ میں منحصر ہو جانا، تو ایسا نہیں ہے کہ کچھ لوگوں نے کسی جگہ بیٹھ کر اس پر اتفاق کرلیا ہو؛ بلکہ یہ ایک غیبی فیصلہ ہے؛ چوں کہ ان فقہاء کی آراء کتاب وسنت اور منشاء شریعت سے قریب محسوس کی گئیں اور ان کے اجتہادات زندگی کے تمام شعبوں میں موجود ہیں؛ اس لئے اُمت میں انھیں خاص طور پر پذیرائی حاصل ہوئی، جیسے: قرأت وتجوید میں قرأت سبعہ یا قرأت عشرہ کو جو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ دوسری قراءتوں کو حاصل نہ ہو سکی، جیسے احادیثِ صحیحہ کے بہت سے مجموعے مرتب ہوئے؛ لیکن صحیحین کو جو قبولِ عام وتام حاصل ہوا، وہ کسی اور تالیف کے حصہ میں نہیں آیا، اسی طرح یہ ایک غیبی فیصلہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے مذاہب کو من جانب اللہ جو قبولیت حاصل ہوئی، وہ کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکی، اس میں کسی تعصب اور تنگ نظری کو دخل نہیں ہے، اور شاید اس کی مصلحت یہ بھی ہو کہ مذاہب اربعہ نے اجتہاد واستنباط کی مختلف جہتوں کو، فقہاء صحابہ کے اکثر اقوال کو اور قیاس کے مختلف پہلوؤں کو اپنے اندر جذب کرلیا ہے، گویا یہ بحیثیت مجموعی پوری شریعتِ اسلامی کے ترجمان اور قرآن وحدیث کی تعلیمات کے لئے شرح و بیان ہیں؛ اس لئے اس پر معترض ہونا ایک طرح سے خدا کے فیصلہ پر معترض ہونا ہے۔

حضرات ! مذاہبِ اربعہ میں فقہ حنفی کے بعد اُمت میں جس فقہ کو سب سے زیادہ قبول عام حاصل ہوا، وہ ہے فقہ شافعی، —— حقیقت یہ ہے کہ اس فقہ کو زمانہ کے اعتبار سے تأخر کے باوجود جو ارتقاء حاصل ہوا اور اہل علم اور اصحاب نظر کی بارگاہ میں اس نے جو علو منزلت اور خاص توجہ وعنایت پائی، اس کے کچھ خاص اسباب ہیں :

اول: یہ کہ جو فقہاء اہل علم کے درمیان معروف ومقبول رہے ہیں اور جن کی آراء اور خیالات نے

مرتب ہوکر قبول عام اور بقائے دوام حاصل کیا ہے، ان میں امام شافعیؒ ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں، آپ بہ یک وقت بلند پایہ محدث بھی ہیں اور فقیہ و مجتہد بھی؛ اس لئے اہل روایت اور اہل درایت دونوں کے یہاں آپ کی علمی وجاہت تسلیم شدہ ہے، نہ اصحاب حدیث کو یہ جرأت ہے کہ وہ دوسرے اصحاب رائے کی طرح آپ کی آراء سے بے اعتنائی برتیں اور نہ اصحاب رائے کے لئے اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ آپ کو قوت استنباط میں کم قامت اور نصوص کے ظاہر پر جامد قرار دیں — اس کے علاوہ عام طور پر فقہاء خاص خاص علاقوں کے علماء کی روایات اور خیالات کے نمائندہ ہوا کرتے تھے اور دوسرے علاقوں کے اہل علم سے استفادہ کی نوبت کم آتی تھی؛ لیکن امام شافعی کی تشنہ لبی نے اپنے زمانہ کے علم کے تمام سرچشموں سے خود کو سیراب کیا اور اصحابِ حدیث اور اصحابِ رائے کے اعلیٰ ترین نمائندوں سے کسبِ فیض کیا، یہ وہ بات تھی جس کی وجہ سے علمی مراکز، درس گاہی تحفظات اور مختلف مکاتب کی فقہی وابستگی فقہ شافعی کے پھیلنے اور عام ہونے میں حارج نہیں ہوئی۔

دوسرا سبب فقہ شافعی میں مجتہدین اور محدثین کی کثرت ہے، واقعہ ہے کہ فقہ شافعی نہایت مردم خیز رہی ہے اور اپنے زمانہ کے سرگرم، ذکی اور اصحاب تالیف علماء کا مرکز توجہ رہی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی فقہ شافعی کی اس امتیازی شان کی طرف اشارہ فرمایا ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہی کافی ہے کہ صحاح ستہ میں سے اکثر کے مصنفین امام شافعیؒ کے مقلد یا مشہور اور اکثر اختلافی مسائل میں فقہ شافعی کے مؤید ہیں، ان کے علاوہ دوسرے مشہور جامعین حدیث اور اصحاب سنن بھی اسی فقہ کی ترجمانی اور نمائندگی کرتے ہیں، امام عزالدین بن عبدالسلام، امام الحرمین اور امام غزالیؒ جیسی اُمتِ اسلامیہ کی یادگار ہستیوں اور عبقری شخصیتوں کا قبلۂ فکر و عمل یہی لالہ زار وسدا بہار فقہ رہی ہے۔

تیسرے: ائمہ اربعہ کی فقہ میں اسی فقہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ خود صاحب مذہب امام نے اپنے طریق استنباط اور اُصول اجتہاد کو باضابطگی سے مرتب فرمادیا ہے، اس نے بعد کے فقہاء کے لئے امام کے نقطۂ نظر کی وضاحت اور تخریج وتفریع، نیز مختلف اقوال میں انتخاب وترجیح کو آسان کردیا ہے۔

یہ وہ بنیادی عوامل ہیں جنھوں نے حکومت اور سرکاری عہدوں سے دوری کے باوجود فقہ شافعی کو پھیلاؤ اور فقہاء ومحدثین دونوں کے درمیان قبول وتوجہ سے ہم کنار کیا ہے۔

حاضـــرین کرام ! امام صاحب کا ایک اہم امتیاز احقاق حق اور رد باطل بھی ہے، امام شافعیؒ کا زمانہ وہ تھا جب مختلف باطل افکار پیدا ہورہے تھے، آپ نے سلف صالحین کی طرح ان کی طرف

توجہ فرمائی؛ چنانچہ ان کے عہد میں ہی انکار حدیث کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور بعض فرق اپنی گمرہی کو چھپانے کی غرض سے حدیث کی حجیت کا انکار کرتے تھے، ان میں ایک طبقہ تو کلیۃً حدیث کا منکر تھا، امام شافعی نے ان پر رد کے لئے ''الام'' میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے، (ملاحظہ ہو: الام: ۷/۲۷۳، کتاب جماع العلم، باب حکایۃ قول الطائفۃ...... ردت الأخبار کلہا) اور قرآن کی مختلف آیات سے استدلال کرتے ہوئے غالباً آپؒ ہی نے سب سے پہلے اس امر پر زور دیا کہ قرآن میں ''**یعلمهم الكتاب والحكمة**'' میں حکمت سے مراد سنت رسول ہے۔ (الام: ۷/۲۷۴)

دوسرا طبقہ وہ تھا جو صرف ''خبر واحد'' کا منکر تھا کہ ذخیرۂ حدیث کا بڑا حصہ اسی طرح کی روایات پر مشتمل ہے، امام شافعیؒ نے خبر واحد کو ''خبر خاصہ'' کا نام دیا ہے، (الام: ۷/۲۷۸، باب حکایۃ قول من رد خبر الخاصۃ) اور اس طبقہ پر بھی نہایت ذہانت اور دقت نظر کے ساتھ رد کیا ہے، امام شافعیؒ کا یہ نقد ان کی قوت استدلال اور استنتاج کی غیر معمولی صلاحیت کا شاہد ہے، اور اس موضوع پر بعد میں جو کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے غالباً حضرت الامام کی یہی بحث اس کی اساس و بنیاد ہے۔

امام شافعیؒ کا زمانہ وہ تھا، جب عالم اسلام پر مختلف گمراہ فرقوں کے بادل چھائے ہوئے تھے اور کتاب و سنت ان کا تختۂ مشق بنے ہوئے تھے، خبر واحد کے انکار کے علاوہ ان کا طریق خاص نصوص کی دور از کار تاویلات، بعید از عقل و لغت توجیہات اور ظاہری معنی سے گریز و انحراف تھا، امام شافعیؒ کو اس فتنہ کی نزاکت اور اس کے دوررس اثرات و نتائج کا اندازہ تھا؛ اس لئے جہاں ایک طرف آپ نے حدیث اور خصوصیت سے خبر واحد کی حجیت پر دلائل قائم کئے، وہیں اس بات پر بھی زور دیا کہ نصوص کے ظاہری اور متبادر معنی ہی مراد لئے جاسکتے ہیں۔

نہی وممانعت حرمت کو بتلاتی ہے نہ کہ ''تنزیہ'' کو، اس سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ جس بات پر نصوص میں ممانعت وارد ہو، وہ حرام ہی سمجھی جائے گی :

كل ما نهى عنه فهو محرم حتى تأتي عنه دلالة تدل على أنه إنما نهى عنه لمعنى غير التحريم إما أراد به منهيا من بعض الأمور دون بعض و إما أراد به النهى تنزيهاً عن المنهى و الأدب و الإختيار و لا تفرق بين نهى النبى إلا بدلالة عن رسول الله أو أمر يختلف فيه المسلمون ۔ (الام: ۷/۲۹۱)

> جس بات سے منع کیا گیا ہے، وہ حرام ہے، تا آں کہ کوئی دلیل موجود ہو جو اس بات کو بتلاتی ہو کہ حرمت مراد نہیں ہے، بعض خاص صورتوں کی ممانعت مقصود ہے یا از راہِ تنزیہ یا بہ طور ادب یا اختیار کے ممانعت کی گئی ہے، جب تک حدیث میں کوئی دلیل موجود نہ ہو یا اجماع نہ ہو، حضور ﷺ کی نہی میں کوئی تفریق نہیں کی جائے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ علماء کو ہمیشہ اپنے عہد کے مخالفِ اسلام افکار سے باخبر ہونا چاہئے۔

حضرات ! سلف صالحین اور ائمہ مجتہدین کے عام مزاج و مذاق کے مطابق امام شافعیؒ بھی فقہی اختلافات کے باب میں بڑے سیر چشم واقع ہوئے تھے، امام شعرانی نے نقل کیا ہے کہ آپ جب بغداد تشریف لے گئے، جہاں امام ابوحنیفہؒ کی قبر واقع ہے، تو صاحبِ قبر کے احترام میں اپنی رائے کے برخلاف نماز فجر میں دُعاءِ قنوت نہیں پڑھی۔

امام صاحبؒ نے فقہی اختلاف پر اُصولی بحث بھی فرمائی ہے اور لکھا ہے کہ ایک تو اختلافِ حرام ہے، یعنی ایسی رائے جو کتاب و سنت کی صریح اور نا قابل تاویل آیت کے خلاف قائم کی گئی رائے ہو، دوسرے : اختلافِ مباح ہے، یعنی نصوص کی تشریح میں پایا جانے والا ایسا اختلاف کہ نصوص میں اس کا احتمال موجود ہے، یا قیاس و رائے میں پایا جانے والا اختلاف۔ (الرسالہ:۵۶۰)

اسی وسیع النظری کا ایک پہلو یہ ہے کہ فقہ شافعی میں اختلافی احکام میں تورع اور ممکن حد تک اختلاف سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے، اسی کو امام سیوطیؒ نے لکھا ہے: ''**الخروج من الخلاف مستحب**'' (الأشباہ والنظائر:۲۵۷) —— چنانچہ امام شافعیؒ کے یہاں جسم کی طہارت کے لئے مَلنا، ضروری نہیں ہے، مالکیہ کے یہاں ضروری ہے، شوافع کے یہاں سر کے مسح میں ایک بال بھی کافی ہے، مالکیہ کے یہاں پورے سر کا مسح ضروری ہے، شوافع کے یہاں منی پاک ہے، مالکیہ کے یہاں دھونا ضروری ہے، چھوٹی ہوئی نمازوں میں ترتیب شوافع کے یہاں واجب نہیں، حنفیہ کے یہاں واجب ہے، عمارت کے اندر بھی قبلہ کا استقبال اور استدبار حنفیہ کے یہاں مکروہ ہے، شوافع کے یہاں جائز ہے، ان تمام مسائل میں فقہاء شوافع اپنے مسلک پر عمل کرنے کے بجائے احتیاط پر عمل کرنے اور اختلاف سے بچنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

یہ پہلو ہمیں اختلاف میں باہمی احترام اور اعتدال کا سبق دیتا ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ

مذاہبِ اربعہ کے ان متبعین کے درمیان جن کا علم سے تعلق رہا ہے، کبھی نزاع وجدال کی شکل پیدا نہیں ہوئی، جیسا کہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے، انھوں نے تمام مذاہبِ فقہیہ کا احترام ملحوظ رکھا، نہ کسی دبستانِ فقہ کو غلطی سے معصوم سمجھا اور نہ کسی کو غلطیوں اور خطاؤں کا پیکر خیال کیا؛ کیوں کہ تقلید کی حقیقت میں یہ بات شامل ہے کہ ہم جس نقطۂ نظر کے حامل ہیں، اس میں بھی خطاء کا احتمال ہے اور فریق مخالف کی رائے کے بھی درست ہونے کا امکان ہے؛ اسی لئے مذاہب اربعہ کے حاملین نے ہمیشہ ایک دوسرے سے افادہ اور استفادہ کا تعلق رکھا، ایک دوسرے کی کتابوں کی شروح وحواشی کے ذریعہ خدمت کی، اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے مناقب پر شاید حنفیہ سے بھی زیادہ مالکیہ اور شوافع نے قلم اُٹھایا ہے۔

حضرات! ہندوستان میں اہل سنت کے فقہی مذاہب میں سے فقہ حنفی اور فقہ شافعی ہی کو رواج حاصل رہا ہے، اگرچہ فقہ حنفی اس ملک کے بیشتر علاقوں میں سکہ رائج الوقت کی طرح نافذ رہی ہے اور آج بھی اس کا اقتدار قائم ہے؛ لیکن بنظر انصاف دیکھا جائے تو ہندوستان میں فقہ حنفی سے بھی پہلے فقہ شافعی نے اپنا قدم رکھا ہے؛ کیوں کہ ہندوستان میں اسلام کا سورج مالابار کے ساحل سے طلوع ہوا اور کیرالا سے لے کر موجودہ بمبئی تک اس کی روشنی پھیلتی چلی گئی، ان ساحلی علاقوں میں جو عرب تجار ومبلغین آئے، وہ عام طور پر فقہ شافعی کے متبع تھے اور آج بھی ہندوستان کے بیشتر مغربی ساحلی علاقوں میں فقہ شافعی کی پیروی کی جاتی ہے۔

یہ فطری بات ہے کہ ہندوستان میں زیادہ تر فقہی سرمایہ فقہ حنفی سے متعلق ہے؛ لیکن فقہ شافعی میں بھی متعدد اہم تالیفات یہاں وجود میں آئی ہیں، خاص کر شیخ زین الدین بن عبدالعزیز مالاباری (متوفی: ۹۸۷ھ) کے قلم سے '**قرة العين لمهمات الدين**' اور اس کی شرح 'فتح المعین' کو درسی نقطۂ نظر سے ایسی قبولیت حاصل ہوئی کہ وہ نہ صرف ہندوستان میں؛ بلکہ بعض عرب ملکوں میں بھی شامل نصاب ہے۔

اکیڈمی کی شروع سے یہ سوچ رہی ہے کہ تمام مذاہب فقہیہ ہمارا علمی اثاثہ اور قیمتی سرمایہ ہیں اور یہ سب ہماری آنکھوں کا سرمہ ہیں، اکیڈمی نے محسوس کیا کہ ہندوستان کے اہل علم میں بھی فقہ شافعی کا تعارف اس طرح نہیں ہے، جو اس کا حق ہے، اسی پس منظر میں یہ سیمینار رکھا گیا ہے اور اس کے لئے کوکن کی سرزمین کا انتخاب کیا گیا ہے، جہاں زیادہ تر فقہ شافعی کا رواج رہا ہے اور جہاں فقہ شافعی کی

غالباً سب سے بڑی درسگاہ 'جامعہ حسینیہ شری وردھن' موجود ہے، اس جامعہ کی دیدہ زیب عمارت اور پُرفضا منظر ہی باعث کشش نہیں ہے؛ بلکہ اس کا معنوی حسن اس سے کہیں فزوں تر ہے، اس وقت ممبئ سے لے کر ہندوستان کی آخری جنوبی سرحدوں؛ بلکہ ان سے گزر کر سری لنکا تک اس کا فیضان جاری ہے اور اس ایک چراغ سے نہ جانے کتنے چراغ اس پورے علاقے میں روشن ہوئے ہیں۔

بزرگانِ محترم ! قدرت نے فطری حسن و جمال کی تقسیم میں اس خطہ کے ساتھ بڑی فیاضی کا سلوک کیا ہے، سروِ قامت درختوں کی ایسی قطاریں کہ جیسے سبز وردی میں ملبوس سنتری آپ کے استقبال کے لئے کھڑے ہوں اور اپنی خنک بار ہواؤں کی سرسراہٹ کے ذریعہ نغمۂ محبت پیش کررہے ہوں، بل کھاتی ہوئی سڑکیں، پہاڑوں کا فراز اور دامن کوہ کا نشیب، گاہے پہاڑ کی چوٹیوں سے زمین کی طرف آتے ہوئے تیز گام آبشار اور کہیں زمین کی آغوش میں سبک خرامی کے ساتھ مچلتی ہوئی ندیاں، ہر اس انسان کے سازِ احساس کو چھیڑنے لگتی ہیں، جو حسن فطرت سے لطف اُٹھانا اور کارخانۂ قدرت سے لذت اندوز ہونے کا ذوق رکھتا ہو، کوہ کنوں کی یہ بستی جہاں فطرت کے ان نظاروں سے مالا مال ہے، وہیں ایک ایسی سعادت سے بھی وہ سرفراز ہے، جو برصغیر کے ایک دو علاقوں کے سوا کسی اور کے حصے میں نہیں آئی، کہ کوکن کے علاقہ نے اصحابِ رسول ﷺ اور تابعین صالحین کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا ہے اور اس خطہ میں مسلمانوں کی اولین آبادی حجاز اور حضر موت کی طرف سے یہاں پہنچی ہے؛ اس لئے ایک طرح سے یہ اس ملک میں اسلام کا 'باب الداخلہ' ہے۔

ہم اس موقع پر جامعہ حسینیہ کے ذمہ داران بالخصوص ہم سب کے بزرگ حضرت مولانا شوکت علی نظیر صاحب —— متعنا اللہ بطول حیاتہم —— جامعہ کے مہتمم محبی فی اللہ حضرت مولانا امان اللہ صاحب، حضرت مولانا محمد ابراہیم خطیب صاحب شیخ الحدیث، جامعہ ہذا اور دیگر ذمہ داران اور اساتذہ کا اکیڈمی کی طرف سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے اس پروگرام کی میزبانی قبول فرمائی اور اُمید کرتے ہیں کہ اس خطہ کا اکیڈمی سے ارتباط بڑھے گا، علمی اور فکری اعتبار سے باہمی تعاون میں اضافہ ہوگا اور اس علاقہ کے علماء میں علم و تحقیق کی ایک نئی چنگاری سلگانے میں یہ پروگرام ممد و معاون ثابت ہوگا، **وباللہ التوفیق، وھو المستعان۔**

• • •

علماء ہند کی فقہی خدمات ☆

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين وعلى آله واصحابه أجمعين ، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أما بعد۔

حضرات ! اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید اور قرآن مجید کے واسطے سے اس پورے دین کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، جہاں حفاظ اور قراء و مجودین نے الفاظِ قرآنی کی حفاظت کی ہے اور خطاطین و کاتبین نے قرآن مجید کو اسی رسم الخط میں محفوظ رکھا ہے؛ جو جامع قرآن حضرت عثمان غنی ﷛ کے زمانہ سے متوارثاً چلا آرہا ہے، وہیں محدثین وفقہاء نے معانی قرآن کی حفاظت کا بیڑہ اُٹھایا، امام شافعی ؒ کے حسب تحریر ہر حدیث کسی نہ کسی درجہ میں قرآن مجید کا بیان ہے، محدثین نے اُن تمام باتوں کو جمع کیا، جو آپ ﷺ سے منسوب تھیں، پھر روایت و درایت اور عقل ونقل کی روشنی میں معتبر اور نامعتبر روایتوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا اور راویوں کی تحقیق کرکے ایک ایک حدیث پر حکم لگایا، نیز اس کے لئے ایک مستقل علم 'علم اسماء رجال' کی بنیاد رکھی، حقیقت یہ ہے کہ جیسے قرآن مجید ایک معجزہ ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے اقوال وافعال کی حفاظت کا جو اہتمام من جانب اللہ اس اُمت نے کیا ہے ، وہ بھی ایک معجزہ سے کم نہیں ہے اور یہ رسول اللہ ﷺ پر ختم نبوت کی اور شریعت محمدی کے بقاء و دوام کی دلیل ہے؛ کیوں کہ جس چیز سے انسانیت کا نفع متعلق ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اسی کو باقی رکھتے ہیں اور جس چیز سے انسانیت کا نفع ختم ہوجاتا ہے، وہ چیز خود بخود دفنا ہوجاتی ہے، اگر خدا کے یہاں یہ بات منظور نہ ہوتی کہ آپ ﷺ کی نبوت قیامت تک باقی رہے تو گذشتہ شریعتوں کی طرح آپ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت بھی انسانی آویزشوں اور ملاوٹوں کا شکار ہوگئی ہوتی۔

حدیثیں اگرچہ کتاب اللہ کی تشریح وتوضیح میں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں؛اسی لئے تفسیر قرآن مجید کا سب سے بڑا اور اہم ماخذ حدیث ہے؛ لیکن اس کے بعد بھی دو کاموں کی ضرورت باقی تھی: ایک

☆ دار العلوم مئو میں منعقد ہونے والے اجلاس میں علماء ہند کی فقہی خدمات کے جائزہ پر مشتمل یہ کلیدی خطبہ پیش کیا گیا۔

یہ کہ بہت سے احکام خاص کر عبادات کے علاوہ دوسرے مسائل قرآن وحدیث میں صراحتاً ذکر نہیں کئے گئے ہیں ؛ بلکہ اُصول و مقاصد کو واضح کردیا گیا ہے ؛ تاکہ ہر زمانہ میں پیدا ہونے والے مسائل وواقعات میں ان سے روشنی حاصل کی جائے اور اُمت کے لئے زندگی کے تمام شعبوں میں شریعت کی رہنمائی حاصل رہے، جیسے قرآن مجید نے کہا ہے: ''**وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ**'' (الطلاق:۲) لیکن عدل سے کیا مراد ہے؟ قرآن وحدیث میں اس کی کوئی تعریف نہیں کی گئی، آپ ﷺ نے قبضہ سے پہلے کسی چیز کو فروخت کرنے سے منع فرمایا (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۲۹۲)؛ لیکن قبضہ کی حقیقت کیا ہے اور کس کیفیت پر قبضہ کا اطلاق ہوگا؟ اس کو واضح نہیں فرمایا گیا، اس طرح کے بہت سے احکام قرآن وحدیث میں ملتے ہیں، جن کو مبہم رکھا گیا ہے، اسی طرح بعض مواقع پر صرف اُصول وقواعد کی رہنمائی کی گئی ہے ؛ جیسا کہ قرآن نے کہا: ''**لاَ تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلاَّ أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ**'' (النساء:۲۹) یعنی معاملات کی بنیاد تراضی عاقدین پر ہے ؛لیکن کس وقت کی تراضی معتبر ہے اور کس طور پر رضامندی کا اظہار کیا جائے گا؟ اس کو قرآن نے مبہم رکھا ہے، یا جیسے آپ ﷺ نے ایک قاعدہ مقرر فرمادیا: ''**لاضرر ولا ضرار**'' (ابن ماجہ، کتاب الأحکام، حدیث نمبر: ۲۳۰۴) زندگی کے تمام مسائل میں اس قاعدہ کا اطلاق ہوگا ؛لیکن کس درجہ کا ضرر احکام میں مؤثر ہوگا اور دفع ضرر کا طریقہ کیا ہے؟ اس کی صراحت نہیں کی گئی۔

اس ابہام واجمال کی حکمت ظاہر ہے ؛ کیوں کہ قیامت تک بے شمار مسائل جنم لیتے رہیں گے، نئے وسائل پیدا ہوں گے، طریقۂ کار میں تبدیلیاں آئیں گی، عرف ورواج بدلے گا، اگر ان تعبیرات اور اُصول وقواعد کا بے لچک مفہوم ومصداق متعین کردیا جاتا، تو ایک عہد کے بعد دوسرے عہد میں اس کا اطلاق دشوار ہوجاتا اور اگر رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ایک ہزار سال آگے کے واقعات اس وقت بتائے گئے ہوتے تو وہ گذشتہ عہد کے لوگوں کے لئے ناقابل فہم ہوتے، اس لئے ان کو مبہم رکھنا اور زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے اس کی تطبیق میں مختلف صورتوں کی گنجائش کو باقی رکھنا ایک ایسی شریعت کے لئے ضروری تھا، جسے قیامت تک انسانیت کی رہنمائی کرنا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس کے لئے اجتہاد کا راستہ کھولا، (سنن ترمذی عن معاذ بن جبل، حدیث نمبر: ۱۳۲۷) آپ کے جو رفقاء اس کے اہل تھے، ان کو بعض مسائل میں عملی طور پر اجتہاد وقیاس کا طریقہ بھی سمجھایا اور اس کو کارِ ثواب بتایا، (سنن ترمذی عن ابی ہریرۃ، حدیث نمبر: ۱۳۲۶) یہ کام بعض پہلوؤں سے محدثین کے کام سے زیادہ دشوار ہے ؛ کیوں کہ اس میں نصوص کے الفاظ ہی کو جمع کرنا نہیں ہے ؛ بلکہ اس کے

معانی میں غواصی بھی ضروری ہے، قرآن وحدیث کے اوامر ونواہی کو سمجھنا، اسرار وحکم کو جاننا، علت ومناط کو دریافت کرنا، نئے واقعات پر ان کو منطبق کرنا اور جہاں ادلۂ شرعیہ میں بظاہر تعارض ہو، ان میں تطبیق وترجیح کی راہ نکالنا، پھر نصوص کے لب ولہجہ کو دیکھتے ہوئے احکام کے مدارج کو متعین کرنا، یہ ایسی خدمت ہے، جس کے لئے جمع نصوص اور حفظِ معلومات کافی نہیں ہے؛ بلکہ غیر معمولی ذہانت، ذکاوت وطباعی اور خداداد فہم وفراست بھی مطلوب ہے۔

فقہاء نے اسی فریضہ کو انجام دیا ہے اور اسلامی تاریخ کی بہترین ذہانتیں اس میدان میں استعمال ہوئی ہیں، اہم بات یہ ہے کہ یہ فقہاء اپنے عہد کے ذہین ترین لوگ ہی نہ تھے؛ بلکہ وہ اپنے عہد میں ورع وتقویٰ کے اوجِ کمال پر بھی تھے، اگر ان کا دماغ علوم وفنون کا گنجینہ تھا تو ان کے قلوب خشیتِ الٰہی کا خزینہ تھے، امام ابوحنیفہ ؒ کا حال یہ تھا کہ ان کے معاصرین ان کو ''أعقل أہل الزمان'' بھی کہتے ہیں اور ''أورع أہل الزمان'' بھی، امام مالک ؒ کا حال یہ ہے کہ دو عباسی خلفاء نے صلاح دی کہ ان کی تالیف ''مؤطا'' کو پورے عالم اسلام کے لئے قانون واجب الطاعة بنادیا جائے؛ لیکن انھوں نے اس کو قبول نہیں کیا، بے پایاں اخلاص اور بے نہایت خشیت وتقویٰ کے بغیر کوئی عالم ایسی پیشکش کو رد نہیں کرسکتا، امام احمد بن حنبل ؒ مذہب اہل سنت کے دفاع میں کیسی کیسی ابتلاؤں اور آزمائشوں سے گزرے، یہ اسلام کی تاریخ دعوت وعزیمت کا روشن باب ہے، امام بخاری ؒ نے کیا کیا مصائب برداشت کئے؛ لیکن دین اور علم دین کی آبرو کو سلاطین کی چوکھٹ پر نثار نہیں کیا۔

غرض کہ فقہاء علم وعمل اور خشیت وورع کے جامع تھے؛ اسی لئے انھوں نے فقہ کو مرتب کرنے میں اپنی دانست کے مطابق کتاب وسنت کی تصریحات اور شریعت کے اُصول ومقاصد کو قدم قدم پر ملحوظ رکھا ہے اور ہر اجتہاد کا ماخذ قرآن وحدیث سے واضح فرمایا ہے، انھوں نے قرآن وحدیث کے مقابلہ اپنی رائے اور اپنے فہم کو کوئی اہمیت نہیں دی، فقہاء کے اس کارنامے کی اہمیت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے، جب دنیا کے دوسرے مذاہب کے اصل ماخذ اور ان کے علماء کی تعلیمات کا موازنہ کیا جائے، ہندو بھائیوں کے یہاں اصل مذہبی کتابوں کی حیثیت ''ویدوں'' کو حاصل تھی، جو اُن کے عقیدہ کے مطابق الہامی کتابیں ہیں؛ لیکن جب منوجی نے قانون مرتب کیا اور منوسمرتی وجود میں آئی، تو وہ ویدوں کی اصل تعلیمات سے بالکل مختلف تھی اور اس میں برہمنوں کی نسل پرستی اور ذات پات کی بنیاد پر تفریق کو مذہب وعقیدہ کا حصہ بنادیا گیا، یہ منوجی کی دین ہے کہ تعداد کے

اعتبار سے ایک معمولی اقلیت ہونے کے باوجود ہزاروں سال سے برہمن ہندو معاشرہ کے بے تاج بادشاہ رہے ہیں اور بڑی مکاری کے ساتھ انھوں نے موجودہ جمہوری دور میں بھی اپنی اس حیثیت کو باقی رکھا ہے، اسی طرح علماء یہود نے یہودیوں کے لئے شریعت کے طور پر ''تالمود'' مرتب کی، جس کی تعلیمات تورات کے صحیفوں سے بہت کچھ مختلف ہے اور جس میں بہت ساری باتیں علماء یہود نے اپنی رائے کے مطابق داخل کر دیں، فقہاء اسلام نے نہ صرف کتاب وسنت کے احکام کو مرتب فرمایا؛ بلکہ استنباط واجتہاد کے ایسے اُصول بھی متعین کر دیئے کہ کوئی شخص اسلام کا نام لے کر دھوکہ دیتے ہوئے شریعت سے آزاد نہیں ہوسکتا اور وہ اس بات پر مجبور ہوگا کہ ہر حکم کے لئے اس کا ماخذ واضح کرے، حقیقت یہ ہے کہ جیسے اسماء رجال کے فن نے حدیث کو لفظی تحریف سے محفوظ رکھا، اسی طرح اُصولِ فقہ نے شریعت اسلامی کو ہر طرح کی معنوی تحریف سے محفوظ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا اور اس طرح اسلامی تعلیمات بے آمیز طریقہ پر اُمت کے ہاتھوں تک پہنچ پائیں۔

یہ پہلو بھی نہایت اہم ہے کہ فقہاء نے اپنے فتاویٰ اور اجتہادات کو ہمیشہ حکومتوں کے اثر سے آزاد رکھا، اسی لئے بہت سے جلیل القدر فقہاء نے سرکاری عہدوں کو قبول کرنے سے گریز فرمایا اور اکثر فقہاء وہ تھے جن کے تعلقات اپنے عہد کی حکومتوں سے ناخوشگوار رہے، امام ابوحنیفہ ؒ کو تو اسی راہ میں جام شہادت نوش کرنا پڑا؛ لیکن امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام بخاری، علامہ ابن تیمیہ، سفیان ثوری، حسن بصری ؒ اور کتنے ہی اس میدان کے شہسوار ہیں، جن پر حکومتوں کا عتاب ہوا اور جو حضرات کسی دینی مصلحت کے پیش نظر بعض حکومتوں سے قریب ہوئے، جیسے امام مالک اور امام ابویوسف وغیرہ، تو انھوں نے بھی اس تعلق کو حکومت کی اصلاح اور شریعت کی تنفیذ کے لئے استعمال کیا، یہی وجہ ہے کہ کتبِ فقہ میں کثرت سے ایسے فتاویٰ موجود ہیں جن میں حکومتوں کے ناشائستہ رویہ پر تنقید کی گئی ہے اور حکمرانوں کے جور وظلم سے متعلق شرعی احکام پر روشنی ڈالی گئی ہے، ورنہ اسلام سے قریب ترین مذہب عیسائیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ حکمرانوں کو قریب کرنے کے لئے حضرت عیسیٰ ؑ کی بنیادی تعلیمات کو بدل ڈالا گیا اور توحید کی جگہ تثلیث نے کچھ اس طرح لے لی کہ پھر اس آج تک کی اصلاح نہ ہوسکی۔

فقہاء کے اخلاص، خشیتِ الٰہی اور تمام رشتہ وپیوند کے مقابلہ اسلام کو ترجیح دینے کا ایک پہلو یہ ہے کہ جیسے محدثین نے راویوں کی جرح وتعدیل میں نسبی یا فکری تعلق کو اہمیت نہیں دی، باپ نے

بیٹے اور بیٹے نے اپنے باپ پر جرح کی ،اسی طرح فقہاء نے بھی اپنی رائے کے اظہار میں اور جہاں اجتہاد و استنباط کی وجہ سے اختلاف رائے پیدا ہوا ، وہاں اختلاف رائے کے اظہار میں کسی تکلف سے کام نہیں لیا؛ بلکہ ایک شاگرد نے اپنے استاذ کی رائے کو اور ایک معتقد نے اپنے مقتدی اور محبوب کی رائے کو درست نہیں سمجھا تو برملا اختلاف رائے کا اظہار کیا اور کسی شخصیت کے محبت واحترام میں ادنی کمی کئے بغیر ان پر تنقید کی ؛ اس لئے کتب فقہ میں اختلاف رائے ایسی بات نہیں ،جس پر فقہاء کو مطعون کیا جائے ؛ بلکہ یہ ان کے اخلاص اور تعلق مع اللہ کی دلیل ہے اور ساتھ ہی ساتھ اُمت کے لئے سہولت اور بوقت ضرورت وسعت وگنجائش کا باعث ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اُمت کو فقہاء کا شکر گزار اور احسان مند ہونا چاہئے کہ قرآن وحدیث اور آثارِ صحابہ میں جو تعلیمات ہزاروں صفحات میں بکھری ہوئی تھیں اور جن کو سمجھنے کے لئے عمریں درکار تھیں ، نیز عوام کے لئے جن کی تحقیق کرنا دشوار تھا، فقہاء نے ان تعلیمات کو کشید کر کے اس کا عطر لوگوں کے سامنے پیش کر دیا اور شریعت اسلامی کو ایک مکمل نظام حیات کی شکل میں مرتب فرما دیا ،جس میں عبادت سے لے کر معاملات ، معاشی نظام ، اُصولِ سیاست وطریق حکمرانی اور زندگی کے تمام گوشوں کو ایک نظم وارتباط کے ساتھ مرتب کر دیا گیا اور اُمت کے لئے شریعت اسلامی پر عمل کرنے کی ایک شاہراہ بنا دی گئی ،اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ فقہ اسلامی کتاب وسنت کی عملی تشکیل اور صورت گری سے عبارت ہے۔

یوں تو تمام ہی اسلامی علوم کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے ؛لیکن غور کریں تو فقہ اسلامی ایک درجہ میں ان تمام علوم کو جامع ہے، یہ تفسیر قرآن بھی ہے ؛ کیوں کہ آیات احکام کی تشریح وتوضیح کے بغیر فقہ کی کوئی کتاب مکمل نہیں ہوسکتی ، یہ حدیث رسول بھی ہے ؛ کیوں کہ احکام فقہیہ کا سب سے بڑا مرجع کتب حدیث ہیں ، یہ علم کلام بھی ہے ؛ کیوں کہ ردت اور الفاظِ کفر کی تمام بحثیں بنیادی طور پر عقیدہ وایمان سے مربوط ہیں ، یہ تجوید وقراءت بھی ہے کہ ''زلۃ القاری'' اور بعض دوسرے مباحث اس فن سے بے تعلق نہیں ہوسکتے ، یہ تصوف واحسان بھی ہے ؛ کیوں کہ اذکار واوراد اور تزکیۂ اخلاق سے متعلق بہت سے مسائل کتب فقہ کا حصہ ہیں ، اُصولِ فقہ تو گویا فقہ کی سواری ہے کہ جس کی مدد سے فقہاء شریعت کے مقاصد تک پہنچتے ہیں اور اُصولِ تفسیر وحدیث سے بھی کوئی شخص بے نیاز نہیں ہوسکتا ؛ کیوں کہ اخذ واستنباط اور تطبیق وترجیح میں قدم قدم پر ان اُصولوں سے مدد لینی پڑتی ہے ،غرض یوں تو فقہ بظاہر ایک علم ہے ؛

لیکن اپنے پھیلاؤ کے اعتبار سے یہ تمام ہی علوم اسلامی کا نچوڑ اور پوری شریعت اسلامی کا خلاصہ ہے۔

حضرات ! علماء عجم اور خاص کر علماء ہند کا علوم اسلامی میں فقہ سے خاص اشتغال رہا ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کے ابتدائی عہد میں جہاں مجاہدین اسلام کی فوج با تمکین آئی، وہیں مختلف علوم اسلامی کے ماہرین کا کاروانِ سعادت بھی وارد ہوا اور وہ ہمیشہ کے لئے اسی ملک میں خیمہ زن ہو گیا، ان میں متعدد شخصیتوں کا امتیاز فقہ میں تھا، اس سلسلہ میں ابو معشر سندھی ؒ (متوفی: ۲۹۹ھ)، شیخ احمد بن سعید مالکی الفقیہ ؒ (متوفی: ۳۹۹ھ)، شیخ حسن علی بن حسن فقیہ ؒ (متوفی: ۴۴۵ھ) اور شیخ محمد بن احمد سندھی ؒ (متوفی: ۵۴۸ھ) کا متعدد حضرات نے ذکر کیا ہے۔

ہندوستان میں جو عجمی نژاد حکومتیں قائم ہوئیں، ان میں مغلوں سے پہلے کے دور کو عام طور پر ''عہد سلطنت'' کہا جاتا ہے، اس دور میں ہندوستان سے فقہ اسلامی کی نمایاں خدمت ہوئی ہے، اسی دور میں شاہ نظام الدین اولیاء ؒ (متوفی: ۷۲۵ھ) کا چشمۂ فیض جاری ہوا، وہ صوفی صافی بھی تھے، محدث بھی اور بڑے فقیہ بھی، یہاں تک کہ بعض اہل علم ان کو ''ابوحنیفہ ثانی'' کہتے تھے، محمد تغلق ؒ (۱۳۲۵-۱۳۵۱) کو خاص طور پر فقہ سے بڑی دلچسپی تھی، اسی کی دعوت پر برہان الدین سمرقندی اور قاضی مجد الدین شیرازی جیسے بلند پایہ علماء فقہ ہندوستان آئے، فخر الدین زرادی، محی الدین کاشانی، شیخ حسام الدین، تحفۃ النصائح کے مصنف شیخ یوسف گدائی ''ترفۃ الفقہاء'' کے مصنف شیخ فضل اللہ ماجو کا تعلق اسی عہد سے ہے۔

اسی عہد کے حکمرانوں میں فیروز شاہ تغلق ہیں، جن کا دور حکومت ۱۳۵۱ تا ۱۳۸۸ ہے، اس سلطان کی علم پروری اور دین کا پاس ولحاظ معروف ہے، فتاویٰ فیروز شاہی بزبانِ فارسی اسی زمانہ کی یادگار ہے، جس کو بادشاہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اسی دور کا عظیم کارنامہ 'فتاویٰ تاتارخانیہ' ہے، جو فقہی جزئیات کی کثرت اور حسن ترتیب کے اعتبار سے انگلیوں پر گنی جانے والی چند کتابوں میں سے ایک ہے اور بحمد اللہ گذشتہ دنوں محب گرامی مفتی شبیر احمد صاحب کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ ۲۳ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، اس کتاب کے مصنف عالم ابن علاء فیروز شاہ تغلق کے مقرب علماء میں تھے، اسی دور میں شیخ سراج الدین غزنوی ؒ (متوفی: ۷۷۳ھ) کی 'فتاویٰ قاریٔ الہدایۃ' مرتب ہوئی، حکمرانوں کی سرپرستی میں مرتب ہونے والی کتابوں میں ایک اہم کتاب قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی 'فتاویٰ ابراہیم شاہی' بھی ہے، جو اب تک مخطوطہ کی شکل میں ہے، اسی نوعیت کی ایک تالیف

’فتاویٰ غیاثیہ‘ ہے جو سلطان غیاث الدین بلبن کی طرف منسوب ہے اور جس کے مرتب شیخ داؤد بن یوسف خطیب ہیں، عہد سلطنت میں لکھی جانے والی کتابوں میں قاضی جگن گجراتی ؒ (متوفی: ۹۲۰ھ) کی ’’خزانۃ الروایات‘‘ بڑی اہم تالیف ہے، جو فقہی جزئیات کے استیعاب کے اعتبار سے فتاویٰ تاتارخانیہ اور فتاویٰ عالمگیری کے ہم پلہ قرار دی جاسکتی ہے، یہ ابھی تک مخطوطہ کی شکل میں ہے؛ لیکن اس وقت دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد میں اس پر تحقیق وتالیف کا کام چل رہا ہے، قریب قریب اسی طرح کا ایک فقہی ذخیرہ ابوالفتح رکن الدین حسام الدین ناگوری ؒ (متوفی: ۹۲ھ) کی ’فتاویٰ حمادیہ‘ ہے۔

عہد سلطنت کی فقہی تالیفات میں ابومحمد بن خطیب اشقورقانی کی ’’صنوان القضاء وعنوان الافتاء‘ قضاء کے موضوع پر بڑی اہم تالیف ہے، جو چار جلدوں میں حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی ؒ کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ وزارتِ اوقاف کویت سے شائع ہوچکی ہے، اسی دور کی تالیفات میں ابوحفص سراج الدین غزنوی کی ’فتاویٰ سراجیہ‘ ہے، جو فقہی جزئیات کے انتخاب کے اعتبار سے ایک بے نظیر مجموعہ ہے، شیخ سراج الدین ہی کی ایک اور تالیف ’’زبدۃ الأحکام فی اختلاف الأئمۃ الأعلام‘‘ ہے، جو اب تک تشنۂ طبع ہے، اسی دور کی تالیفات میں قاضی ضیاء الدین حنفی کی ’’نصاب الاحتساب‘‘ ہے، فتاویٰ عالمگیری اور بعد کی کتابوں میں جس سے بکثرت استفادہ کیا گیا ہے۔

عہد سلطنت کے بعد عہد مغلیہ کا نمبر آتا ہے، اس دور میں بھی بڑے بڑے اہل علم گذرے ہیں، جنھوں نے حدیث وفقہ میں روشن نقوش چھوڑے ہیں، ان شخصیتوں میں علامہ محمد طاہر پٹنی ؒ (متوفی: ۹۶۶ھ)، مولانا عبدالاول جونپوری ؒ (متوفی: ۹۶۸ھ)، شیخ عبدالحق محدث دہلوی ؒ (متوفی: ۱۱۰۳ھ)، شیخ وجیہ الدین گجراتی ؒ اور حافظ امان اللہ بنارسی ؒ (متوفی: ۱۱۳۳ھ) کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ہدایہ اور تلویح پر شیخ وجیہ الدین گجراتی ؒ کے حواشی، اُصولِ فقہ میں ملامحب اللہ بہاری ؒ (متوفی: ۱۱۱۹ھ) کی مقبول عام تالیف ’’مسلم الثبوت‘‘ اور ملااحمد جیون ؒ کی ’’نورالانوار‘‘ نیز آیات احکام پر ملاجیون ہی کی تالیف ’’تفسیرات احمدیہ‘‘ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

مغل سلاطین ایران کی طرف سے آئے تھے؛ اس لئے بابر اور ہمایوں کے دور میں فارسی زبان میں بھی سرکاری سرپرستی میں متعدد کتابوں کا ذکر ملتا ہے، جن میں نورالدین قطب الدین خوافی کی ’’فتاویٰ بابری‘‘ ہمایون کے دور میں امین بن عبداللہ مومن آبادی کی ’’فتاویٰ امینیہ‘‘ کے علاوہ نصیرالدین لاہوری کی ’’فتاویٰ براہنہ‘‘ کے نام ذکر کئے جاتے ہیں؛ لیکن عہد مغلیہ کا سب سے بڑا کارنامہ ’’فتاویٰ

ہندیہ'' ہے، جس کو اورنگ زیب عالمگیر کے زیر نگرانی علماء وفقہاء کی ایک جماعت نے مرتب کیا ہے، شیخ نظام الدین برہان پوری ؒ (متوفی: ۱۶۷۹ھ) اس مجلس ترتیب کے نگرانِ اعلیٰ تھے، جیسا کہ آپ حضرات کے علم میں ہے، یہ محض ایک کتاب نہیں ہے؛ بلکہ فقہ حنفی کی ایک عظیم الشان انسائیکلو پیڈیا ہے، جو ہندوستان کے مفاخر میں سے ہے۔

مسلم دورِ حکومت میں اور برطانیہ کے ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد اگرچہ اسلامی علوم کی خدمات کی رفتار سست پڑ گئی؛ لیکن اسی دور میں میدان فقہ کی بعض ایسی نابغہ روزگار ہستیاں پیدا ہوئیں اور انھوں نے عربی زبان میں فقہ اسلامی کا ایسا بلند پایہ ذخیرہ چھوڑا کہ اس کو بجا طور پر ہندوستان کی علمی تاریخ کا روشن باب کہہ سکتے ہیں، ان میں مسند الہند شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ، بحر العلوم ملا عبد العلی فرنگی محلی ؒ (متوفی: ۱۲۳۵ھ)، شاہ عبد العزیز محدث دہلوی ؒ (متوفی: ۱۲۳۹ھ)، ابو الحسنات مولانا عبد الحی فرنگی محلی ؒ (متوفی: ۱۳۰۴ھ)، نواب صدیق حسن خاں ؒ (متوفی: ۱۳۰۷ھ)، سرخیل علماء اہل حدیث شاہ محمد نذیر حسین محدث دہلوی ؒ (متوفی: ۱۳۲۰ھ)، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ؒ (متوفی: ۱۳۲۳ھ)، مولانا احمد رضا خاں بریلوی (متوفی: ۱۳۴۰ھ)، نیز حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ (متوفی: ۱۳۶۲ھ) کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

ہندوستان کی فضاء پر شروع سے فقہ حنفی 'سکہ رائج الوقت' کی طرح چھائی رہی ہے؛ لیکن ساحلی علاقوں میں فقہ شافعی نے بھی پذیرائی حاصل کی ہے؛ چنانچہ فقہ شافعی میں بھی متعدد اہم تالیفات یہاں وجود میں آئی ہیں، جن میں علامہ محمد ہاشم سندھی ؒ (متوفی: ۱۱۴۸ھ) کی ''البیان الجامع فی اقوال الفقہاء''، محمد غوث مدراسی ؒ (متوفی: ۱۲۸۸ھ) کی ''کفایۃ المبتدی فی الفقہ الشافعی'' اور عبد اللہ بن صبغہ مدراسی کی ''الفوائد الصبغیہ فی فقہ الشافعیہ'' خصوصیت سے قابل ذکر ہے، فقہ شافعی کی کتابوں میں دو اہم کتابیں ''قرۃ العین بمہمات الدین'' اور اس کی شرح ''فتح المعین''، شیخ زین الدین بن عبد العزیز ملاباری ؒ (متوفی: ۹۸۷ھ) کے قلم سے ہے، جو ہندوستان کے علاوہ یمن وغیرہ میں بھی داخل نصاب ہے۔

غرض کہ ہندوستان میں فقہ اسلامی کی خدمت کی ایک روشن اور تابناک تاریخ رہی ہے، جو اپنی گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے معاصر اسلامی دنیا کی خدمات پر اگر فوقیت نہ رکھتی ہو تو اس کی ہم پلہ ضرور ہے، جو ہمارے لئے سرمایہ افتخار بھی ہے اور دعوت جہد وعمل، مولانا عبد الحی حسنی کی ''الثقافۃ

الاسلامیہ فی الہند'' اور'' نزہۃ الخواطر''، مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کی'' رجال السند والہند''، مولانا ریاست علی ندوی کی'' عہد اسلامی کا ہندوستان''، محمد اسحاق بھٹی کی'' فقہاء ہند''، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی'' مآثر الکرام'' اور'' سبحۃ المرجان''، شیخ محمد اکرام کی'' آبِ کوثر'' اور'' رودِ کوثر'' نیز پروفیسر خلیق احمد نظامی کی'' سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات'' وغیرہ میں اس موضوع پر اتنا کچھ مواد جمع ہے کہ اگر ان کو سامنے رکھ کر قلم اُٹھایا جائے تو ایک ضخیم تاریخ مرتب ہوسکتی ہے۔

برطانوی قبضہ کے کچھ ہی عرصہ بعد ہندوستان میں اُردو زبان میں تصنیف وتالیف کے سلسلہ کا آغاز ہوگیا تھا اور اس نے اتنی تیز گامی کے ساتھ اپنا قدم بڑھایا کہ عربی زبان کے علاوہ دوسری تمام زبانوں کو پیچھے چھوڑ دیا، اس وقت تک بحمد اللہ اُردو زبان میں فقہ اسلامی پر ایک بڑا کتب خانہ تیار ہو چکا ہے اور بعض ایسی خدمت بھی انجام پائی ہے جو علمی وقعت کے اعتبار سے عربی لٹریچر کے ہم پلہ ہے، اس حقیر نے'' المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد'' میں سندی مقالہ کے لئے ایک فاضل کو'' ۱۹۴۸ء سے ۲۰۰۰ء تک اُردو زبان کے فقہی سرمایہ'' کا عنوان دیا تھا؛ چنانچہ انھوں نے تقریباً چار سو کتابوں کا تعارف جمع کیا، ماضی قریب میں اکیڈمی نے ایک فلاحی فاضل کی کتاب اسی موضوع پر شائع کی ہے، جس میں بحیثیت مجموعی اُردو کی ۶۶۴ کتابوں کا ذکر آیا ہے، اس سے اُردو کے فقہی لٹریچر کی وسعت اور کثرت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، غرض کہ علماء ہند کی فقہی خدمات کا باب بہت وسیع ہے اور اگر کوئی حوصلہ مند شخص اس کا احاطہ کرے تو اُمید ہے کہ یہ مضمون کئی جلدوں پر محیط ہوگا۔

حضرات ! بڑی مسرت کی بات ہے کہ اکیڈمی کا یہ پروگرام ایک ایسے علاقہ میں ہورہا ہے، جو ایک طویل عہد سے علوم وفنون کا مرکز رہا ہے، پورب کے اس علاقہ کو شاہجہاں نے 'شیراز ہند' کہا تھا؛ چنانچہ ایک زمانہ تک جونپور کی ریاست پورے ہندوستان کے لئے علمی دارالخلافہ کا درجہ رکھتی تھی، اعظم گڑھ، مئو، سرائے میر، غازی پور، بنارس، چریا کوٹ، محمد آباد، مبارکپور وغیرہ، یہ سب وہ علمی کواکب ہیں، جو پورے برصغیر میں اپنی روشنی بکھیرتے رہے ہیں اور بکھیر رہے ہیں، یہ علاقہ دینی درسگاہوں کی کثرت اور طالبانِ علوم نبوت کی مرجعیت کے اعتبار سے تو معروف ہے ہی، دارالمصنفین کے قیام نے علم وتحقیق اور تصنیف وتالیف کی دنیا میں بھی اس کی شہرت کو چار چاند لگا دیا ہے، اگر اس خطہ سے سیرت وتاریخ اور ادب وتنقید کے گوہر آب دار علامہ شبلی نعمانی ؒ اور فن حدیث کے درِ تابدار حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی ؒ کے سوا کوئی اور عالم پیدا نہ ہوا ہوتا تو یہی اس کے اعزاز وافتخار کے لئے

کافی ہوتا اور علمی دنیا اس کی عزت وسر بلندی پر رشک کرتی ؛لیکن ان کے علاوہ علم حدیث ،تاریخ وتنقید، شعر وسخن اور فقہ (احناف ،اہل حدیث) کی ایسی ایسی ہستیاں یہاں سے پیدا ہوئی ہیں کہ :

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

اس موقع پر اعتراف حقیقت کے طور پر عرض کرنے کو دل چاہتا ہے کہ ''اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا'' کا پورب کے اس تعلیم آباد و خندہ بنیاد شہر ''مئو'' سے دیرینہ تعلق رہا ہے، اکیڈمی کے بانی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی ﷫ اِس دار العلوم کے متعلم رہ چکے ہیں ،جس کے زیر اہتمام اس وقت یہ پروگرام منعقد ہو رہا ہے، وہ اپنے جن چند اساتذہ کا بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ ذکر فرماتے تھے، ان میں ایک قاری ریاست علی صاحب ﷫ ہیں ، جو دار العلوم کے ایک نامور استاذ تھے ، قاضی صاحب ﷫ کو ان سے بڑی محبت تھی اور ہمیشہ خیر کے ساتھ اس کا ذکر فرماتے تھے، قاضی صاحب ﷫ کی وفات کے بعد حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی ﷫ اکیڈمی کے صدر ہوئے ، انھوں نے اعلیٰ تعلیم جامعہ مفتاح العلوم مئو میں پائی ، اسی نسبت سے ان کی شناخت تھی ، انھیں اپنے اساتذہ میں محدث اعظمی سے غیر معمولی محبت اور بے حد عقیدت تھی اور ان کی مجلس شاید ہی کبھی ان کے اور مولانا عبد اللطیف نعمانی کے ذکر سے خالی رہتی ہو، ان کی وفات کے بعد اس وقت اکیڈمی کا یہ کارواں حضرت مولانا نعمت اللہ اعظمی دامت برکاتہم کی قیادت میں اپنا سفر طے کر رہا ہے، جن کا تعلق اسی خطہ سے ہے ، اکیڈمی کے سیمیناروں میں ابتداء سے آج تک پابندی کے ساتھ جن اہل علم کی شرکت ہوتی رہی ہے اور جن کی بیش قیمت تحریریں اکیڈمی کے لئے بہترین سرمایہ ہیں، ان میں سے متعدد شخصیتیں اسی خطہ کی نمائندگی کرتی ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دار العلوم مئو، جامعہ مفتاح العلوم ، جامعہ تعلیم الدین اور اطراف واکناف کی مختلف دینی جامعات ہیں، جن کے اساتذہ اور اربابِ افتاء کی شرکت اکیڈمی کے سیمیناروں کی وقعت میں اضافہ کا باعث ہے، نیز اکیڈمی کے دو سالانہ بین الاقوامی فقہی سیمینار ضلع اعظم گڑھ ہی میں منعقد ہوئے ہیں۔

حضرات ! اکیڈمی جہاں عصر حاضر میں پیدا ہونے والے شرعی مسائل کو حل کرنے کے لئے سیمینار منعقد کرتی ہے اور دینی مدارس کے نوجوان اساتذہ اور منتہی طلبہ کے لئے پروگراموں کا اہتمام کرتی ہے، وہیں اہم علمی اور فکری موضوعات پر بھی مجالس مذاکرہ رکھا کرتی ہے، یہ سیمینار اسی سلسلہ کی

ایک کڑی ہے، جس کا مقصد تاریخ کے ان نقوش کو پڑھنا ہے، جو ہمارے بزرگوں نے ثبت کئے ہیں، ماضی کی تاریخ مستقبل کے لئے مشعل راہ بنتی ہے اور جس قوم کا رشتہ اپنی تاریخ سے کٹ جاتا ہے، وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہوتی ہے، جس کو اپنی منزل کا پتہ نہیں ہوتا، اس سیمینار کا مقصد یہی ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کے علمی کارناموں کی یاد کو تازہ کریں، ان سے حوصلے حاصل کریں اور آگے کا سفر طے کریں۔

آخر میں اس اہم پروگرام کی میزبانی کے لئے دارالعلوم مئو، اس کے عالی مقام مہتمم، اس کے مؤقر اساتذہ بالخصوص مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، جناب مفتی انور علی صاحب اور ان کے رفقاء کا، نیز مئو کی دیگر دینی جامعات جامعہ مفتاح العلوم، جامعہ تعلیم الدین، جناب مولانا ابوسفیان مفتاحی اور مولانا خورشید انور اعظمی، یہاں کے بلند ہمت عمائدین شہر اور علم دوست دوستوں کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس سیمینار کے انعقاد میں تعاون فرمایا، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خطہ کی علمی روایات کو سلامت رکھے، اسے امن و آشتی کا گہوارہ بنائے اور علم و صنعت کی یہ بستی نظر بد سے محفوظ رہے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

●●●

خانوادۂ فرنگی محل کی علمی خدمات اور فکری اعتدال ☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وأصحابه أجمعين ، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ۔

صدر عالی قدر، علماء کرام اور دانش ورانِ ذی احترام! نہایت مسرت کا موقع ہے کہ اسلامک فقہ اکیڈمی کا یہ اہم پروگرام لکھنؤ جیسے گلستانِ علم وادب اور نگارستانِ تہذیب وثقافت میں منعقد ہورہا ہے، لکھنؤ ہمیشہ سے علم وادب کا سرچشمہ رہا ہے، یہاں کے اصحابِ ذوق کے ذریعہ علم کی محفلیں سجتی اور شعر وسخن کی بزمیں آراستہ ہوتی رہی ہیں، سخن ورانِ لکھنؤ کی دھوم پورے ہندوستان میں رہی ہے؛ حالاں کہ اب لکھنؤ وہ لکھنؤ نہیں رہا اور حسین ولطیف اُردو زبان میں اُردو کے تلفظ کو بے لطف کردینے والی ہندی کی آمیزش ہوگئی ہے؛ لیکن پھر بھی دار العلوم ندوۃ العلماء جیسی عظیم درسگاہ اور اپنی مردم خیزی کی وجہ سے یہ شہر عالمی سطح پر شہرت و ناموری کا حامل ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ علمی خدمات اور قائدانہ صلاحیت کے لحاظ سے اتر پردیش ہندوستان کا دل ہے اور لکھنؤ اتر پردیش کا۔

اس شہر کو ماضی میں جن دبستان ہائے علم سے شہرت حاصل رہی ہے، ان میں ایک نمایاں ترین نام 'فرنگی محل' کا ہے، جس میں بڑے بڑے علماء وفقہاء اور مصنفین واہل قلم پیدا ہوتے رہے ہیں، کہنے کو یہ ایک خاندان ہے؛ لیکن اس کی علمی خدمات بڑے بڑے اداروں اور اکیڈمیوں کے ہم پلہ ہیں، خانوادۂ فرنگی محل میز بانِ رسول حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے نسبی تعلق رکھتا ہے، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے آفتاب نبوت کی میز بانی کی تھی اور اس خاندان نے علوم نبوت کی میز بانی کی ہے؛ چنانچہ اسلامک فقہ اکیڈمی کی عام روایت اُصول فقہ اور جدید مسائل پر سیمینار کی رہی ہے نہ کہ شخصیتوں اور اداروں کی خدمات پر؛ لیکن فرنگی محل کی غیر معمولی علمی اور خاص کر فقہی خدمات کی وجہ سے اس عنوان کا انتخاب کیا گیا، جو اکیڈمی کی طرف سے اس نوعیت کا پہلا پروگرام ہے۔

☆ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے زیر اہتمام "علماء فرنگی محل - حیات وخدمات" کے موضوع پر منعقدہ سیمینار میں دیا جانے والا کلیدی خطبہ۔

حضرات ! لکھنؤ کے فرنگی محل کی تاریخ اصل میں بارہ بنکی کے گم نام قصبہ ''سہالی'' سے شروع ہوتی ہے، جہاں اپنے عہد کے بڑے عالم اور منقولات ومعقولات کے ماہر استاذ ملا قطب الدین درس دیتے ہوئے ۱۹؍رجب ۱۱۰۳ھ مطابق ۲۷؍مارچ ۱۶۹۲ء کو شہید کردیئے گئے، یہ حادثہ ایسا جان کاہ تھا کہ ملا صاحب کے بعض لڑکوں نے اورنگ زیب عالمگیرؒ کے پاس استغاثہ کیا کہ ان کا خاندان یہاں سے ہجرت کرنا چاہتا ہے اور انصاف پرور بادشاہ نے لکھنؤ میں فرانسیسی تاجر کی وہ کوٹھی عنایت کردی، جو فرنگی محل کہلاتی تھی، کسے معلوم تھا کہ فرنگیوں کا یہ محل علوم اسلامی کی اشاعت کا محل بن جائے گا اور دور دور سے تشنگانِ علوم یہاں آکر سیراب ہوا کریں گے؛ چنانچہ ملا قطب الدین کے صاحبزادے ملا نظام الدین نے یہاں اپنے والد کی درسگاہ کی نشاۃ ثانیہ کی اور تعلیمی سلسلہ شروع کیا، اسے ایسی پذیرائی حاصل ہوئی ہے کہ نہ صرف ان کا مقرر کیا ہوا نصاب ''درس نظامی'' کہلایا؛ بلکہ اس کے باوجود کہ اب یہ نصاب غیر معمولی تبدیلی کے ساتھ مختلف درسگاہوں میں پڑھایا جاتا ہے اور ملا نظام کے مقرر کئے ہوئے نصاب کی چند کتابیں ہی اس میں باقی رہ گئی ہیں، پھر بھی اسے ''درس نظامی'' ہی کہا جاتا ہے۔

فرنگی محل کا خانوادہ جلیل القدر علماء کی کثرت اور علمی خدمات کے تسلسل کے اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں ایک انفرادی شان کا حامل ہے اور اس خاندان کے علماء کی تصانیف کا اگر جامع تذکرہ مرتب کیا جائے تو یقیناً کم سے کم ایک ضخیم جلد کی ضرورت ہوگی، ان علماء میں بحر العلوم ملا عبد العلیؒ (م: ۱۸۱۰ء) ملا محمد مبینؒ (م: ۱۸۱۰ء) ملا حسنؒ، مولانا عبد الحلیم فرنگی محلیؒ (م: ۱۸۶۸ء) مولانا عبد الحی فرنگی محلیؒ (م: ۱۸۸۶ء) اور مولانا عبد الباری فرنگی محلیؒ (م: ۱۹۲۶ء) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، بحر العلوم نے اُصول فقہ میں ''ارکانِ اربعہ، حاشیہ زاہدیہ'' تالیف فرمائی، ''منار'' کی فارسی شرح ''تنویر الابصار'' کے نام سے تالیف کی، ''شرح صدر شیرازیؒ'' پر حاشیہ لکھا، ''مثنوی مولانا رومؒ'' کی شرح فرمائی، ''فقہ اکبر'' کی شرح کی اور متعدد تصنیفات ان کی یادگار ہیں؛ لیکن جس کتاب نے ان کو شہرت دوام عطا فرمائی، وہ ہے ''مسلم الثبوت'' کی مبسوط شرح ''فواتح الرحموت''، جس کا شمار اب اُصولِ فقہ حنفی کے اہم مراجع میں ہوتا ہے اور جسے عالم عرب میں بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

ملا محمد مبین فرنگی محلیؒ نے بھی ''سلم'' اور ''مسلم الثبوت'' کی شرح لکھی اور ''میر زاہد ملا جلال'' پر حاشیہ لکھا، فقہ میں ان کا ایک اہم رسالہ ''کنز الحسنات فی ایتاء الزکوٰۃ'' ہے، جس میں مقدار نصاب پر

بڑی اچھی گفتگو کی گئی ہے، یہ اپنے زمانہ کے امام المعقولات سمجھے جاتے تھے، مولانا عبدالحلیم فرنگی محلیؒ — جو مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کے والد ہیں — بھی بڑے علماء میں تھے، مولانا عبدالحی صاحبؒ نے اپنے رسالہ ''حسرۃ العالم بوفاۃ مرجع العالم'' میں ان کے حالات لکھتے ہوئے ان کی ستائیس تالیفات کا ذکر کیا ہے، جن میں ''نورالانوار'' کے حاشیہ ''قمر الاقمار'' کو خاص شہرت حاصل ہوئی ہے۔

اس خاندان کی اخیر دور کی شخصیات میں ایک اہم نام مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ (م:۱۹۲۶ء) کا ہے، ''تذکرۂ علماء فرنگی محل'' کے مصنف نے ان کی ایک سو دس تصنیفات کا ذکر کیا ہے، جن میں بہت سی تالیفات فقہ اور اُصولِ فقہ سے متعلق ہیں، آپ نے بھی ''مسلم الثبوت'' کی ایک شرح ''ملہم الملوک'' کے نام سے تالیف فرمائی ہے، آپ نے تصنیف وتالیف کے علاوہ قومی وملی جدوجہد میں بھی حصہ لیا ہے اور تحریک خلافت میں بھی شامل رہے ہیں۔

اس خاندان کے گلِ سرسبد اور شجر سدابہار شخصیت کا ذکر میں اخیر میں کر رہا ہوں اور ان کے اس تذکرہ کو مسک ختام تصور کرتا ہوں، میری مراد محدثِ جلیل اور فقیہ بے مثیل حضرت مولانا عبدالحئ فرنگی محلیؒ (م:۱۸۸۶ء) سے ہے، جو اسلامی اور عربی علوم میں نابغۂ روزگار اور درآبدار کی حیثیت رکھتے تھے، آپ کی تقریباً سو تالیفات ہیں اور ہر کتاب گویا اپنے موضوع پر حرفِ آخر ہے، اُصولِ حدیث میں ''الرفع والتکمیل'' اور ''الاجوبۃ الفاضلۃ'' ایسی تالیفات ہیں کہ اُصولِ حدیث کے پورے کتب خانہ میں شاید ہی ان کی مثال مل سکے، یہ اسلاف کے افکار وشخصیات کا عطر ہے اور اخلاف کے لئے خضرِ طریق ہے، اسی طرح فقہ میں ''شرح وقایہ'' کی شرح ''السعایہ'' اگرچہ نامکمل ہے؛ لیکن حدیث وفقہ کے استیعاب کے اعتبار سے ایک بے نظیر کتاب ہے، اگر یہ کتاب مکمل ہوجاتی تو فقہی متون کی شرح میں یقیناً لاجواب تالیف ہوتی، اسی طرح ''شرح وقایہ'' کا حاشیہ ''عمدۃ الرعایۃ'' اختصار کے ساتھ جامعیت اور حل مشکلات کے لئے نمونہ کا درجہ رکھتی ہے، صرف ۳۹ سال کی حیات مستعار پانے کے باوجود آپ نے جو عظیم علمی خدمات انجام دی ہیں اور جو تالیفی ورثہ چھوڑا ہے، وہ علماء متقدمین کی یاد دلاتا ہے، مولانا کی تالیفات تو بجائے خود گراں قدر ہیں ہی، ان کے عاشق نادیدہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کی تعلیقات مولانا لکھنوی کی تحریروں کو نہ صرف متعارف کرانے میں ممد ومعاون رہی ہیں؛ بلکہ ان کے ذریعہ ان کتابوں کی قدر وقیمت میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔

حضرات ! فرنگی محل کے علماء کی کاوشیں اگرچہ مختلف علوم وفنون میں اپنے جوہر دکھاتی رہی ہیں

اور اس زمانے کے مزاج و مذاق کے مطابق معقولات ان کی خاص جولان گاہِ فکر رہا ہے؛ لیکن شاید ان کا سب سے بڑا علمی اور تصنیفی ذخیرہ فقہ اور اُصولِ فقہ میں ہے، اس موضوع پر بڑی ہی بلند پایہ کتابیں اس خانوادۂ علمی کا اثاثہ ہیں اور وہ اپنی اہمیت اور افادیت کی وجہ سے اصحابِ علم اور اہل ذوق کی آنکھوں کا سرمہ بنتی رہی ہیں، فقہی تالیفات کے علاوہ فرنگی محل میں بالکل ابتدائی دور سے ہی فتاویٰ نویسی کا سلسلہ رہا ہے، اس حقیر کے رفیقِ درس ڈاکٹر اشتیاق احمد اعظمی نے اپنے پی ایچ ڈی کے مطبوعہ مقالہ ''اودھ میں افتاء کے مراکز اور ان کی خدمات'' میں ان کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے، اللہ کا شکر ہے کہ فرنگی محل کا یہ علمی اور تعلیمی مرکز آج بھی زندہ ہے اور حضرت مولانا ابوطیب احمد میاں فرنگی محلی اور ان کے لائق فرزند جناب مولانا خالد رشید ندوی کے ذریعہ اسے ایک نئی زندگی حاصل ہو رہی ہے، خدا کرے یہاں کی بہارِ رفتہ واپس آئے اور یہ چراغ چراغ گھر بار ہو جائے، جس کی روشنی دور تک اور دیر تک پہنچتی رہے۔

حضرات ! فرنگی محل کی فقہی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ایک خاص پہلو جس کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے، اس کو واضح کرنے کی ضرورت ہے، جس سے صرفِ نظر کر جانا ناانصافی اور زمانہ ناشناسی ہوگی اور وہ ہے فرنگی محل کا مسلکِ اعتدال ـــــ بعض اعتقادی اور عملی مسائل جن میں شاہ اسماعیل شہیدؒ، حلقۂ دیوبند اور حلقۂ بدایوں کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا تھا اور اب بھی پایا جاتا ہے، ان میں فرنگی محل کے علماء وارباب افتاء کے درمیان بھی اختلاف رائے رہا ہے اور دو مختلف نقاطِ نظر پائے گئے ہیں ؛ لیکن اس اختلاف نے حد اعتدال سے تجاوز نہ کیا اور اس اختلاف کی وجہ سے فریق مخالف کی تکفیر و تفسیق نہیں کی گئی ؛ بلکہ اسے راجح اور مرجوح کا اختلاف سمجھا گیا ، یہ بھی ایک خوش گوار حقیقت ہے کہ علماء فرنگی محل ہمیشہ تصوف کے قائل اور مشائخ صوفیہ سے مربوط رہے ہیں ؛ لیکن اس کے باوجود حدیثِ نبوی سے بھی ان کا رشتہ استوار رہا ؛ اسی لئے ہمیں یہاں ہر دور میں ایسے علماء نظر آتے ہیں، جو ایک طرف تصوف کے ان اشغال کی تائید و تقویت میں قلم اُٹھاتے ہیں، جن کا فی الجملہ احادیث و آثار سے ثبوت ہے اور ان اشغال کا رد بھی کرتے ہیں، جن کے لئے قرونِ اولیٰ میں کوئی نظیر نہیں اور جن کی سرحدیں بدعت ؛ بلکہ بعض اوقات شرک سے جا ملتی ہے۔

یہی حال فقہی مسائل و احکام کا ہے، خاص کر مولانا عبدالحئی صاحبؒ کے یہاں مسائل فقہیہ میں جو اعتدال ملتا ہے اور شارع کی نصوص اور فقہاء کے اجتہادات میں ـــــ تقلید پر قائم رہنے کے باوجود

— ہم آہنگی پیدا کرنے کی جو کوشش نظر آتی ہے، وہ علماء کے لئے ایک مثال ہے، اگر چہ ہندوستان میں تمام ہی مکاتبِ فکر اپنی نسبت مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی طرف کرتے ہیں؛ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اس دعویٰ میں کس حد تک صادق القول ہیں اور اگر شاہ ولی اللہ صاحب اس دور میں پیدا ہوتے تو ان کے افکار وخیالات پر ان حضرات کا کیا ردعمل ہوتا؛ لیکن مولانا عبد الحیؒ صاحب واقعی فکرِ ولی اللہی کے امین؛ بلکہ اس کے نقیب وترجمان تھے۔

انھوں نے متعدد مواقع پر اپنے حنفی ہونے کا ذکر کیا ہے اور وہ عموماً دوسرے مذاہب کے احترام کے ساتھ حنفیہ کے نقطۂ نظر کی بھرپور وکالت بھی کرتے ہیں؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ متأخرین احناف کی بعض آراء پر نقد بھی کرتے ہیں، نیز فقہاء کے درمیان پائے جانے والے اختلافِ رائے کو پورے انصاف اور عدل کے ساتھ پیش کرتے ہیں، مثلاً خواتین کی جماعت کو بہت سے فقہاء احناف نے مکروہ قرار دیا ہے؛ لیکن مولانا نے اپنے رسالہ ''تحفة النبلاء'' میں تفصیل سے اس موضوع کی احادیث وآثار پیش کی ہیں اور فقہاء نے کراہت کے جو اسباب لکھے ہیں، ان کا تفصیلی تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

... وبعد التسليم لا دلالة على كراهة التحريم أصلا ،
بل لو دل فإنما يدل على فضيلة صلاة الإنفراد ۔ (۱)

...... اس بات کو تسلیم کرلیا جائے تب بھی عورتوں کی جماعت کے مکروہ تحریمی ہونے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے؛ بلکہ یہ دلالت کرتی ہے تو صرف اس بات پر کہ عورتوں کا تنہا نماز پڑھنا بہتر ہے۔

مولانا نے اپنی تالیفات میں ہمیشہ اس بات کو پیش نظر رکھا ہے کہ اصحاب مذہب کے اقوال اصل ہیں اور مشائخ مذہب کے اقوال کو وہ اہمیت حاصل نہیں، انھوں نے حنفیہ کی مدافعت میں بھی اس بات کو ملحوظ رکھا ہے، مثلاً فرماتے ہیں:

فإنهم طعنوا في كثير من المسائل المدرجة في فتاوى الحنفية أنها مخالفة للأحاديث الصحيحة أو أنها ليست متأصلة على أصل شرعي ، ونحو ذلك ، جعلوا

(۱) تحفة النبلاء في جماعة النساء: ۹۱۹۔

ذلک ذریعة إلی الطعن علی الأئمة الثلا ثة ظناً منهم أنها مسائلهم ومذاهبهم ولیس کذلک ، بل هی تفریعات المشایخ ، استنبطوها من الأصول المنقولة عن الأئمة ، فوقعت مخالفة للأحادیث الصحیحة فلا طعن بها علی الأئمة الثلا ثة ، ولا علی المشایخ أیضا ، فإنهم لم یقرروها مع علمهم بکونها مخالفة للأحادیث۔ (النافع الکبیر:۲۱)

ان لوگوں نے بہت سے ایسے مسائل کے متعلق جو حنفیہ کے فتاویٰ میں بعد میں داخل کئے گئے ہیں، اعتراض کیا ہے کہ یہ صحیح احادیث کے خلاف یا یہ کسی شرعی اُصول پر قائم نہیں ہیں وغیرہ —— ان لوگوں نے اس کو لے کر امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ پر یہ سمجھتے ہوئے تنقید کی ہے کہ یہ ان کے مسائل اور ان کی آراء ہیں ؛ حالاں کہ ایسا نہیں ہے ؛ بلکہ یہ مشائخ کی تفریعات ہیں ، انھوں نے ائمہ منقول اُصول کی بنیاد پر ان کو مستنبط کیا ہے ؛ چنانچہ وہ احادیث صحیح کے خلاف ہوگئی ہیں ، ان کو لے کر ائمہ ثلاثہ پر طعن کرنا درست نہیں ہے ؛ بلکہ مشائخ پر بھی لعن کرنا درست نہیں ہے، ان حضرات نے ان کو حدیث کے خلاف جاننے کے باوجود ان آراء کا اظہار نہیں کیا ہے۔

اسی طرح اگر کسی مسئلہ میں احناف کے مختلف اقوال ہوں تو جو قول حدیث سے قریب تر ہوتا ہے، مولانا اسے ترجیح دیتے ہیں، جیسے وضو کے شروع میں بسم اللہ کہنے کا مسئلہ ہے کہ اس میں ایک قول اس کے واجب ہونے کا ہے، جس کی طرف علامہ ابن ہمامؒ کا میلان ہے، مولانا نے ظاہر حدیث سے موافقت کی وجہ سے اس کو ترجیح دیتے ہوئے فرمایا ہے: ''**وأصحها وأحسنها**'' (**أحکام القنطرة فی أحکام البسملة**: ۳۳) —— اسی طرح وضو میں گردن کے مسح کو بعض فقہاء نے سنت قرار دیا اور بعض نے بدعت ومکروہ کہا ہے و مولانا نے اپنے رسالہ تحفة الطلبہ فی تحقیق مسح الرقبة'' میں اس بات کو ترجیح دیا ہے کہ گردن کا مسح نہ سنت ہے اور نہ بدعت ؛ بلکہ مستحب ہے یا ادب کے درجہ میں ہے، اختلافی

مسائل میں غالباً مولانا کا سب سے تفصیلی رسالہ ''قراءت فاتحہ خلف الامام' کے موضوع پر ''امام الکلام مع غیث الغمام'' ہے، جس میں حدیث اور رجال کی بڑی نفیس بحثیں آ گئی ہیں، اس رسالہ میں مولانا نے حنفیہ کے دلائل کو بڑی قوت کے ساتھ پیش کیا ہے، لوگوں کی بے اعتدالی کا رونا رویا ہے اور علماء مقلدین سے گلہ کیا ہے کہ وہ ہر جگہ اس قاعدہ پر قائم رہتے ہیں کہ ہمارا مذہب صحیح ہے، گو اس میں خطا کا احتمال بھی ہے اور اس کے مقابلہ میں دوسرا مذہب خطا پر مبنی ہے، گو اس میں صواب کا احتمال بھی پایا جاتا ہے، نیز یہ بات اس وقت بھی کہی جاتی ہے جب اپنے مذہب کے خلاف واضح نصوص موجود ہوں۔

مولانا نے اس رسالہ کے اخیر میں جو رائے قائم کی ہے، وہ یہ ہے کہ مقتدی پر قراءت فرض نہیں ہے؛ البتہ سری نمازوں میں سورہ فاتحہ کا پڑھ لینا مستحب یا مسنون ہے، اگر چہ یہ مذہب کا قولِ ضعیف ہے؛ لیکن درایت کے اعتبار سے قوی ہے اور جو قول درایت کے مطابق ہو وہ قابل ترجیح ہے: ''**ولا يعدل عن الدراية إذا وافقها رواية**'' (ص: ۲۶۶) پھر آگے شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا قول نقل کر کے ان کے نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہیں کہ جہری نماز میں بھی سکتہ کے وقت سورۂ فاتحہ کو پڑھنے کی گنجائش ہے، (ص: ۲۶۸) اسی رسالہ کے اخیر میں نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ کی قراءت پر گفتگو کی گئی ہے، جس کا ماحصل یہ ہے کہ نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنا چوں کہ بعض صحابہ سے ثابت ہے؛ اس لئے اس کو مکروہ کہنا درست نہیں؛ البتہ ضروری نہیں ہے، (ص: ۲۷۳) یہ ضروری نہیں کہ ان مسائل میں مولانا کے نقطۂ نظر سے اتفاق کر لیا جائے؛ لیکن اس سے مسائل فقہیہ میں آپ کا اعتدال معلوم ہوتا ہے، آپ نے عصام ابن یوسف کا ذکر کرتے ہوئے نقل کیا ہے کہ وہ حنفی تھے؛ لیکن نماز میں رکوع سے پہلے رفع یدین کے قائل بھی تھے، پھر لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی حنفی بعض مسائل میں نصوص کی بنیاد پر دوسرے فقہاء کی رائے کو لے لے تو اس کی وجہ سے وہ حنفیت کے دائرہ سے باہر نہیں ہو جاتا۔

غرض کہ آپ کی ذات فقہاء احناف کے نقطۂ نظر پر وسیع نگاہ اور گہرے مطالعہ کے باوجود نصوص سے اعتناء، دوسرے مسالک کا احترام اور تقلید میں اعتدال کی بہترین مثال ہے، افسوس کہ مولانا لکھنویؒ اور نواب صدیق حسن خانؒ کے درمیان بعض اختلافات نے شدت اختیار کر لی اور اس کے نتیجہ میں ''ابراز الغی''، ''تذکرۃ الراشد'' اور ''تنبیہ ارباب الخبرۃ'' جیسی تالیفات آپ کے قلم سے آئیں، جو مولانا کے عمومی مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھیں؛ لیکن نواب صاحب نے تقلید اور مقلدین کے

بارے میں جو سخت لب ولہجہ اختیار کیا، یہ اس کا فطری ردعمل تھا؛ لیکن پھر بھی اپنے رسالہ ''ابراز الغی'' کی ابتدا میں نواب صاحب کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :

وهو العالم الجليل والفاضل النبيل مجمع الكمالات الإنسية منبع الفضائل الحميدة النواب السيد صديق حسن خان بهادر دام اقباله۔ (ابراز الغی:۳)

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ایک طرف ان دونوں معاصر اہل علم کے درمیان تحریری مناظرہ جاری تھا؛ لیکن دوسری طرف صورتِ حال یہ تھی کہ مولانا جب کبھی بھوپال تشریف لے جاتے تو نواب صاحب کے یہاں قیام فرماتے اور نواب صاحب جب لکھنؤ آتے تو مولانا ان کے میزبان ہوتے، نیز مولانا کی وفات پر نواب صاحب نے سخت غم واندوہ کا اظہار کرتے ہوئے سوگ کا اعلان کیا تھا۔

حضرات ! اس حقیر نے خاتم الفقہاء حضرت مولانا عبدالحئیؒ فرنگی محلیؒ کا ذکر کرتے ہوئے کسی قدر تفصیل سے اس جہت کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ آج کے حالات میں خاص طور پر علماء کو راہِ اعتدال اختیار کرنے کی ضرورت ہے ؛ کیوں کہ یہود و نصاریٰ اور اعداء اسلام عام مسلمانوں کو جغرافیائی، نسبی اور لسانی بنیادوں پر اور مذہب سے مربوط مسلمانوں کو مسلکی اساس پر تقسیم کرنے کے درپے ہیں اور اس طرح وہ اُمت کے ٹکڑے کرنے اور ان کی صفوں کو بکھیرنے میں کامیاب ہوتے جارہے ہیں ؛ اس لئے ضرورت ہے کہ علماء نقش دیوار کو پڑھیں ، دشمنوں کی چال کا ادراک کریں ، حکمت سے کام لیں ، اپنے اختلافات کو حدود میں رکھیں اور اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیں کہ دین وشریعت اصل ہے اور مسلک ومشرب ان کے تابع ، اگر مسلکی تعصّبات اُمت کے دینی وجود کو خطرہ میں ڈال دیں تو یقیناً علم کے تقاضوں سے بے خبری اور علماء کی اپنے فریضۂ منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی ہے۔

حضرات ! اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی بنیاد ۱۹۸۹ء میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے رکھی ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ، حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ ، حضرت مولانا مفتی نظام الدین اعظمیؒ ، حضرت مولانا ابوالسعود احمد باقویؒ اور حضرت مولانا عبدالرحیم لاجپوریؒ جیسے اکابر علم کی سرپرستی میں اس کاروانِ فکرونظر نے اپنا سفر شروع کیا، آج بھی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ،

حضرت مولانا محمد سالم قاسمی اور حضرت مولانا سید نظام صاحب جیسے اکابر ملت کی رہنمائی اسے حاصل ہے اور اس کے انتظام وانصرام میں ہندوستان کے ممتاز علماء فقہ کا حصہ ہے، جو اس کی مجلس انتظامی کے ارکان ہیں، بانی اکیڈمی کے بعد ممتاز صاحب افتاء اور معروف مصنف حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ کو باتفاق رائے اس کا صدر منتخب کیا گیا تھا، ان کی قیادت میں اس قافلہ نے تیز رفتاری کے ساتھ اپنا علمی سفر طے کیا، ابھی دو ماہ پہلے ان کی وفات ہوگئی ہے، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور اکیڈمی کو ان کا بدل عطا کرے۔

اکیڈمی جہاں اپنے سالانہ فقہی سیمیناروں کے ذریعہ علماء کے اجتماعی غور وفکر کے واسطہ سے نئے مسائل کا حل پیش کرتی ہے، وہیں نوجوان فضلاء کی تربیت کے لئے ورکشاپ بھی منعقد کرتی ہے اور مختلف فکری اور فقہی موضوعات پر سیمینار و سمپوزیم بھی رکھتی ہے، یہ پروگرام اسی کا ایک حصہ ہے، اس طرح ہمیں اپنے بزرگوں کی خدمات کو یاد کرنے اور ان کو نمونہ بنا کر عمل کرنے کا موقع ملے گا کہ جو قومیں اپنے ماضی کو یاد نہیں رکھتیں، ان کے لئے مستقبل کا سفر طے کرنا دشوار ہو جاتا ہے اور وہ احساس کمتری اور کم حوصلگی میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔

ہم آخر میں حضرت مولانا ابو الطیب احمد میاں فرنگی محلی اور ان کے صاحب زادگان مولانا طارق رشید ندوی اور مولانا خالد رشید ندوی، نیز ان کے رفقاء کار، شہر کے حاضرین اور مقالہ نگاروں کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان ہی کی عنایت وتوجہ سے فکر ونظر کی یہ محفل سجائی گئی ہے اور دُعاء کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پروگرام کو اپنے مقصد میں کامیاب فرمائے، فرنگی محل کی علمی خدمات میں تسلسل قائم رہے اور اس جگہ کو علمی وفکری خدمات کا بہترین مرکز بنائے۔

وباللہ التوفیق ، وھو المستعان۔

● ● ●

موسوعہ فقہیہ اور اس کا اُردو ترجمہ☆

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام علىٰ سيد المرسلين وعلىٰ آله وصحبه أجمعين ومن تبعهم بإحسان إلىٰ يوم الدين۔

بزرگانِ محترم، صدر عالی قدر! یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی علوم میں فقہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، ایک طرف اس کا مصدر ومنبع کتاب اللہ اور سنت رسول ہے اور پورا فقہی ذخیرہ براہ راست یا بالواسطہ اس سے ماخوذ ہے، جو علم صحیح ومعصوم کا سب سے اہم ذریعہ ہے، دوسری طرف یہ پوری طرح انسانی زندگی سے مربوط ہے اور دنیا میں آنے سے لے کر جانے تک زندگی کے ایک ایک لحہ اور انسان کی متنوع حیات مستعار کے ایک ایک گوشہ میں رہنمائی کرتا ہے، اس لئے ہر دور میں فقہ اسلامی اپنے عہد کی عظیم علمی شخصیتوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔

موجودہ دور چوں کہ صنعتی ترقی، وسائل ابلاغ اور ذرائع مواصلات کے فروغ اور نئے افکار ونظریات کے ظہور کا دور ہے اور ان ترقیات کی وجہ سے پوری دنیا ایک گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے؛ اس لئے نئے مسائل کے پیدا ہونے کی رفتار گذشتہ صدیوں کے مقابلہ کہیں تیز ہے، فقہاء ہی ان مسائل کا حل پیش کر سکتے ہیں اور مسلمانوں کی رہنمائی کر سکتے ہیں کہ وہ بدلے ہوئے حالات میں کس طرح اپنے مسائل پر احکام شریعت کو منطبق کریں؟ اس لئے عصر حاضر میں بھی فقہ اسلامی کو علماء ومحققین کی خصوصی توجہ حاصل رہی ہے۔

اس دور میں جو فقہی خدمات انجام دی گئیں ہیں، ان کو ہم بنیادی طور پر تین زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں: منہج فقہ، اُصولِ فقہ اور احکامِ فقہ — فقہی منہج کے سلسلہ میں دو باتیں خاص طور پر قابل لحاظ ہیں :

الف : رسول اللہ ﷺ نے احکام شریعت پر غور کرنے کا انفرادی طریقہ بھی بتایا اور اجتماعی بھی،

☆ تعارفی کلمات جو موسوعہ فقہیہ کے اُردو ترجمہ کی رسم اجراء کے موقع پر پیش کئے گئے۔

انفرادی اجتہاد کی اصل وہ حدیث ہے، جو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجے جانے کے واقعہ سے متعلق ہے:

إن رسول الله صلى الله عليه وسلم لما أراد أن يبعث معاذاً إلى اليمن قال : (كيف تقضي إذا عرض لك قضاء) ، قال : اقضى بكتاب الله ، قال : (فإن لم تجد في كتاب الله ؟) قال : فبسنة رسول الله صلى الله عليه وسلم ، قال : (فإن لم تجد في سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا فى كتاب الله ؟) قال : أجتهد برأيي ولا آلو ، فضرب رسول الله صلى الله عليه وسلم صدره فقال : (الحمد لله الذي وفق رسول رسول الله صلى الله عليه وسلم لما يرضي رسول الله) ۔(۱)

اور اجتماعی اجتہاد کی نظیر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ہے:

قلت : يا رسول الله صلى الله عليه وسلم إن نزل بنا أمر ليس فيه بيان أمر ولا نهي ، فما تأمرنا ؟ قال : تشاوروا الفقهاء والعابدين ولا تمضوا فيه رأي خاصة ، رواه الطبراني في المعجم الأوسط ، ووثق رواته الهيثمي وقال : رجاله موثقون من أهل الصحيح ۔(۲)

صحابہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے، تابعین میں مدینہ کے فقہاء سبعہ نے اور ائمہ متبوعین میں امام ابوحنیفہؒ نے خاص طور پر اس منہج کو اختیار کیا، موجودہ دور میں علم وتحقیق کے میدان میں کم حوصلگی، ورع وتقویٰ اور خشیتِ الٰہی میں کمی اور صورت مسئلہ سے علماء شریعت کی اس بناء پر کم آگہی — کہ وہ جدید سائنسی تحقیق سے متعلق ہیں — کی وجہ سے اجتماعی طریقہ اجتہاد ہی محفوظ اور آسان راستہ ہے، اس لئے اس دور میں نئے مسائل کی بابت اجتماعی اجتہاد کی طرف رجحان بڑھا ہے؛ اسی پس منظر میں عالم اسلام میں بھی اور غیر مسلم اکثریت ممالک میں بھی مجامع فقہیہ قائم کی گئی ہیں، انھیں میں سے ایک ''اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا'' بھی ہے۔

(۱) **أبوداود**، حدیث نمبر: ۳۵۹۲، **باب اجتهاد الرأى في القضاء**، نیز دیکھئے: **سنن ترمذي ، باب ماجاء في القاضي كيف يقضي**؟ حدیث نمبر: ۱۳۲۲۔ (۲) **مجمع الزوائد**: ۱/۱۷۸۔

ب : دوسرا اہم رجحان تقلید کے باوجود حسبِ ضرورت مختلف دبستانِ فقہ سے استفادہ کا ہے؛ کیوں کہ اس دور میں جو مسائل پیدا ہوئے ہیں، کسی ایک فقہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے ان کو حل کرنا دشوار ہے ؛ اس لئے ہندوستان اور اس جیسے ممالک جہاں اُمت اسلامیہ کا تعامل تقلید پر ہے اور جہاں علماء اور اصحابِ فکر بجا طور پر اسے دین پر چلنے کا محفوظ طریقہ سمجھتے ہیں ، وہاں بھی ایک دبستانِ فقہ سے وابستگی کے باوجود دوسرے مکاتب فقہ سے استفادہ کا رجحان بڑھا ہے ؛ کیوں کہ تمام فقہاء سلف کے اجتہادات شریعت ہی کے دائرہ میں ہیں اور ایک فقہ سے دوسری فقہ کی طرف عدول ''ہجرت من الدین اِلی الدین'' ہے نہ کہ ''ہجرت من الدین اِلی الدنیا''، اسی لئے اس دور میں فقہ مقارن پر متعدد اعلیٰ درجے کی تصنیفات بھی منظر عام پر آئی ہیں۔

فقہی اُصول وقواعد کے سلسلہ میں دو کام بڑے اہم ہوتے ہیں :

الف : تقعید — یعنی فقہی قواعد سازی ، قواعد فقہ کا موضوع ویسے بہت قدیم ہے ، احادیث وآثار میں بھی بعض قواعد ہیں ، امام محمد اور امام شافعی کی کتابوں میں بھی بہت سے قواعد مل جاتے ہیں اور چوتھی صدی ہجری اور اس کے بعد اس فن پر درجنوں کتابیں لکھی گئی ہیں ؛ لیکن موجودہ دور میں فقہی قواعد وضوابط کے استقراء اور تتبع کی جو کاوشیں ہو رہی ہیں، وہ قواعد فقہیہ کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، جس میں مختلف فقہی ابواب سے متعلق قواعد کو جمع کرنے ، کتاب وسنت سے ان کی اصل تلاش کرنے اور فقہاء کے اجتہادات کی روشنی میں یہ متعین کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ کن کن ابواب میں یہ قاعدہ قابل عمل ہے؟ نیز نئے مسائل کے حل میں ان سے مدد لینے کا عمومی رجحان پیدا ہوا ہے، اس سلسلہ میں ''مجمع الفقہ الاسلامی الدولی ، جدہ'' کے زیر نگرانی جو کام ہو رہا ہے، وہ بہت ہی قابل تحسین ہے اور جب یہ کام مکمل ہوگا تو اپنے موضوع پر انشاء اللہ ایک انسائیکلو پیڈیا ہوگا۔

ب : دوسرا اہم کام ''مقاصدِ شریعت'' سے متعلق اُصول کی تنقیح وتوضیح کا ہے ، یوں تو مقاصدِ شریعت کا ذکر امام غزالیؒ ، امام الحرمینؒ ، علامہ عز الدین ابن عبد السلامؒ وغیرہ نے بھی کیا ہے اور متاخرین میں علامہ ابو اسحق شاطبیؒ نے اس پر نہایت بصیرت مندانہ اور چشم کشا گفتگو کی ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے شریعت کے مقاصد ومصالح کو منقح کر کے غور وفکر کا ایک نیا راستہ لوگوں کو دکھایا ہے ؛ لیکن موجودہ دور میں مقاصدِ شریعت پر خصوصی توجہ دی گئی ہے ؛ بلکہ اسے ایک مستقل علم کی حیثیت سے متعارف کرایا جارہا ہے ؛ اگر چہ یہ بات قابل غور ہے کہ کیا محض مقاصد کو سامنے رکھ کر فتاویٰ

دیئے جاسکتے ہیں اور یہ کہنا مداہنت ہوگا کہ ''مقاصد شریعت'' کو سامنے رکھتے ہوئے بعض اہل علم کی طرف سے جو اجتہادات سامنے آرہے ہیں، وہ سب کے سب قابل قبول ہیں؛ لیکن بہر حال شریعت اسلامی کی منطقیت، اس کی عقل وفطرت سے ہم آہنگی اور شریعت کے مزاج و مذاق کو سمجھنے کے لئے ان اُصولوں کی بڑی اہمیت ہے۔

احکامِ فقہ کے سلسلہ میں ایک کام تو اجتہاد و استنباط کا ہوا ہے، اور وہ ہے اس دور میں پیدا ہونے والے نئے معاشی اور سیاسی اداروں کے اسلامی متبادل کی تلاش، جیسے : اسلامک بینکنگ، اسلامی تکافل، اسلامی اسٹاک ایکسچینج یا موجودہ جمہوری نظام کو اسلام کے سیاسی احکام سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش وغیرہ۔

دوسرا کام جمع و ترتیب اور تعبیر و تسہیل کا ہے، اس نقطۂ نظر سے تین طرح کے کام ہو رہے ہیں: تقنین، تسہیل اور موسوعات کی تیاری۔

''تقنین'' سے مراد احکام شریعت کو دفعہ وار طریقہ پر مرتب کرنا ہے، اس کام کی ابتداء غالباً خلافت عثمانیہ کے ''مجلۃ الأحکام العدلیۃ'' سے ہوئی، اس کے بعد موجودہ دور میں مختلف حکومتوں نے سرکاری سطح پر اور شخصیتوں نے انفرادی سطح پر اس کام کو انجام دینے کی کوشش کی ہے، ہندوستان میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے تحت ''مجموعۂ قوانین اسلامی'' کے نام سے مسلم پرسنل لا کے ضمن میں آنے والے مسائل کی دفعہ وار ترتیب بھی اس سلسلہ کی ایک اہم اور قابل ذکر خدمت ہے۔

دوسرا کام فقہی مضامین کی تسہیل و تیسیر کا ہوا ہے، اور مختلف کتابیں ''الفقہ المیسر'' یا ''الفقہ المنہجی'' کے نام سے یا کسی اور عنوان سے تالیف کی گئی ہیں اور انھیں قبولیت حاصل ہو رہی ہے۔

تیسرا کام جو بعض پہلوؤں سے ان تمام کاموں سے زیادہ اہم ہے، وہ ہے موسوعات کی ترتیب کا رجحان —— اس وقت مختلف اسلامی علوم میں موسوعات کی تیاری کا کام چل رہا ہے، انفرادی طور پر بھی اس طرح کی خدمت انجام دی جارہی ہے، میرا خیال ہے کہ ایسی انفرادی کوششوں میں ڈاکٹر رواس قلعجی کی کاوشیں خاص طور پر قابل تحسین ہیں کہ ان کے ذریعہ بعض ان فقہاء کی خدمات بھی زندہ ہوئی ہیں، جن کی فقہ ناپید ہو چکی تھی اور جن کی آراء مختلف کتابوں میں بکھری ہوئی تھیں، اس اہم کام کو اس کی شان کے مطابق انجام دینے کے لئے اجتماعی کاوشیں بھی ہو رہی ہیں اور اس سلسلہ میں سب سے بڑا کام؛ بلکہ کارنامہ وزارت اوقاف کویت کے زیر نگرانی مرتب ہونے والی ''موسوعہ فقہیہ''

رہے ہے، جس کو اس صدی کی سب سے بڑی فقہی خدمت قرار دیا جاسکتا ہے اور جس کی ترتیب و تبویب میں عالم اسلام کے جلیل القدر اور عمیق النظر فقہاء شامل رہے ہیں۔

میرے حقیر مطالعہ کے مطابق اس موسوعہ کی درج ذیل خصوصیات خاص طور پر قابل ذکر ہیں :

۱- اس کی ترتیب حروف تہجی پر ہے، اس لئے اگر مطلوبہ کلمہ یا اس کا مادہ معلوم ہو، تو بآسانی مطلوبہ مواد تلاش کیا جاسکتا ہے۔

۲- فقہ کی بعض کتابوں کی عبارتیں بہت دقیق اور مغلق ہیں، فقہ مالکی کی بہت سے تصنیفات اور فقہ حنفی کی بعض متون کا خاص طور پر اس سلسلہ میں ذکر کیا جاسکتا ہے، موسوعہ فقہیہ میں عبارت کو حتی المقدور سہل اور آسان رکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور بعض مشکل مسائل کو بھی آسان تعبیر میں پیش کیا گیا ہے۔

۳- اس کی ایک اہم خصوصیت اس کی جامعیت ہے، ہر لفظ کے تحت اس کے لغوی معنی، اصطلاحی تعریف، قریب المعنی اصطلاحات کے درمیان فرق سے لے کر اس لفظ کے ذیل میں آنے والی زیادہ سے زیادہ جزئیات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۴- اہل سنت والجماعت کے چاروں دبستانِ فقہ — حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی — کے نقاطِ نظر اور ان کے دلائل کو انصاف کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، تمام آراء کا احترام ملحوظ رکھا گیا ہے اور فقہی تعصّبات سے اوپر اُٹھ کر گفتگو کی گئی ہے۔

۵- تمام فقہاء کی آراء خود ان مذاہب کے مستند مراجع سے نقل کی گئی ہیں ؛ کیوں کہ ایک دبستانِ فقہ سے وابستہ لوگ جب دوسرے دبستانِ فقہ کی آراء کو نقل کرتے ہیں تو بھول چوک کا امکان ہوتا ہے، یا وہ مذہب کے غیر راجح قول کو راجح سمجھ کر نقل کر دیتے ہیں، پھر مرتبین نے اس بات کا بھی اہتمام کیا ہے کہ کسی مسئلہ کے نقل کرنے میں ایک ہی کتاب پر اکتفاء نہیں کیا جائے ؛ بلکہ متعدد مراجع سے استفادہ کیا گیا ہے اور اگر مشائخ مذہب کے درمیان قولِ مستند کے سلسلہ میں اختلاف ہو تو اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، نیز احادیث و آثار کو بھی اصل مراجع سے نقل کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، اس طرح یہ کتاب دستاویزی حیثیت کی حامل ہوگئی ہے اور فقہاء کے لئے ایک مستند مرجع کا درجہ رکھتی ہے۔

۶- یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حالاں کہ اس موسوعہ کی ترتیب میں بہت سے اہل علم شامل رہے ہیں ؛ لیکن منہج میں بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تدوین کمیٹی نے لکھنے والوں کے لئے ایک منہج متعین کر کے کام کرایا ہوگا۔

۷- فقروں پر نمبر اندازی کی گئی ہے، اس کی وجہ سے مسائل کے تلاش کرنے اور ان کا حوالہ دینے میں سہولت ہوتی ہے۔

۸- اس بات کا بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ ہر جلد کے ساتھ ان شخصیات کے تراجم بھی تحریر کر دیئے جائیں، جن کا اس جلد میں ذکر آیا ہے، اس سے قارئین کو بڑی سہولت حاصل ہوتی ہے کہ انھیں فقہاء کے احوال جاننے کے لئے کسی اور کتاب سے مراجعت کی ضرورت نہیں رہتی اور مختلف عہد کے فقہاء کے نقاطِ نظر میں کیا اختلاف پایا جاتا ہے؟ آسانی سے اس کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔

۹- اتنی وسیع الاطراف اور حروف تہجی کی ترتیب پر مرتب ہونے والی کتاب میں تکرار کا پایا جانا فطری بات ہے ؛ کیوں کہ بہت سی اصطلاحات متداخل ، اور بہت سے مضامین ایک دوسرے سے مربوط ہیں ؛ لیکن اس کتاب میں بڑی حد تک تکرار سے بچنے کی کوشش کی گئی ہے اور اسی لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ مترادف اور متقارب الفاظ کے حوالہ دیئے جانے پر اکتفاء کیا جاتا ہے اور ایک ہی جگہ شرح وبسط سے گفتگو کی جاتی ہے۔

۱۰- کتاب کی کتابت اور طباعت میں بھی اعلیٰ معیار کو ملحوظ رکھا گیا ہے، علمی اور تحقیقی کتابوں کے شایانِ شان صفحات کے سائز ہیں، آسانی کے لئے ان کو دو کالمی رکھا گیا ہے، متن اور حاشیہ کے حروف کے حجم میں فرق رکھتے ہوئے ایسا سائز منتخب کیا گیا ہے کہ پڑھنے والوں کو دشواری نہ ہو، نیز مرکزی عنوان ، ذیلی عنوان ، متن اور حاشیہ کے حروف کے سائز پوری کتاب میں یکساں رکھے گئے ہیں۔

واقعہ ہے کہ یہ کتاب اپنی جامعیت ، استناد و اعتبار اور اُسلوب و بیان کے اعتبار سے اس حقیر کی رائے میں اس صدی کا سب سے بڑا فقہی کارنامہ ہے، اس کتاب میں اُصولِ فقہ کے مباحث نہیں آئے ہیں اور اس کے لئے مستقل طور پر — جیسا کہ معلوم ہوا ہے — ''**الملحق الأصولي**'' کی ترتیب کا کام جاری ہے، اس کے مکمل ہونے کے بعد انشاء اللہ اس کی افادیت اور جامعیت میں مزید اضافہ ہوجائے گا ، اور جب بھی اس عہد کی علمی وفقہی خدمات کی تاریخ لکھی جائے گی ، اس موسوعہ کے ذکر کے بغیر وہ ادھوری ہوگی ، اس سلسلہ میں وزارت اوقاف کویت کا جس قدر شکریہ ادا کیا جائے کم ہے اور خود مملکت کویت کا بھی ، کہ کویت حجم کے اعتبار سے چھوٹا ملک ہے ؛ لیکن اسلامی علوم کی نشر واشاعت اور اسلامی کاز کی تائید وتقویت کے اعتبار سے اس کی خدمات بہت ہی وسیع ہیں۔

اس کتاب کی اہمیت اورافادیت کا تقاضہ ہے کہ مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو، برصغیر کے لوگوں کے لئے خوشی کی بات ہے کہ سب سے پہلے اس کا ترجمہ اُردو زبان میں ہوا ہے، اُردو زبان دنیا میں سب سے زیادہ بولی جانے والی چھ زبانوں میں سے ایک ہے، اس زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کی گود میں پیدا ہوئی ہے، یوں تو اس میں دنیا کی مختلف زبانوں کے الفاظ موجود ہیں ؛ لیکن سب سے زیادہ عربی، فارسی اور ہندی کے الفاظ ہیں، ایک صاحبِ نظر عالم کے تجزیہ کے مطابق تقریباً ساٹھ فیصد قرآنی الفاظ اپنی اصل صورت میں یا تبدیلی کے ساتھ اُردو میں شامل ہیں، بہت سی اسلامی تعبیرات اُردو زبان کا جزو لاینفک بن گئی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اُردو کے غیر مسلم ادباء بھی ''سبحان اللہ، ماشاء اللہ اور الحمد للہ وغیرہ'' کہے بغیر اپنی بات پوری نہیں کر پاتے، حمد ونعت اُردو شاعری کی مستقل صنفیں مانی گئی ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ کی تعریف اور رسول ﷺ کی توصیف کی جاتی ہے، اُردو زبان کی پہلی نثر ''معراج العاشقین'' کو قرار دیا جاتا ہے، جو تصوف کے موضوع پر خواجہ گیسو درازؒ کی تصنیف ہے، اور اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ولی دکنی ہیں، جو ایک صوفی شاعر تھے، اور جن کے اشعار میں اسلامی تعلیمات اور اخلاقیات رچی بسی ہیں، غرض کہ اُردو کے روز پیدائش سے ہی اسلام سے اس کا رشتہ قائم ہے، اس نے علامہ اقبال جیسا شاعر دنیا کو دیا ہے، اسی زبان میں قرآن مجید کے سب سے زیادہ ترجمے پائے جاتے ہیں اور اُردو کے بالکل ابتدائی دور میں ہمیں سید شاہ مراد اللہ سنبھلی کی ''تفسیر مرادیہ'' ملتی ہے، اس وقت برصغیر میں تقریباً ۳۵ کروڑ مسلمانوں کی زبان اُردو ہے، اس کے علاوہ یورپ، امریکہ اور مختلف علاقوں میں اُردو بولنے والے مسلمانوں کی کثیر تعداد بستی ہے، اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو شاید مسلمانوں میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ''اُردو'' ہی ہوگی۔

اس لئے اس زبان کا حق تھا کہ اس عظیم الشان کتاب کے ترجمہ میں اس کو اولیت حاصل ہو؛ چنانچہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا وزارت اوقاف کویت کی بے حد شکر گذار ہے کہ اسے اس موسوعہ کے اُردو ترجمہ کا موقع دیا گیا اور اکیڈمی نے بھی پورے اہتمام اور دقت نظر کے ساتھ اس فریضہ کو انجام دیا، جو اب اپنے آخری مرحلہ میں ہے، اکیڈمی نے اس ترجمہ میں جن اُمور کو ملحوظ رکھا ہے اور جو اہتمام کیا ہے، ان کا تذکرہ بھی مناسب ہوگا :

الف : ترجمہ ایک مشکل فن ہے ؛ بلکہ بعض دفعہ ترجمہ کا کام اصل تالیف سے زیادہ مشکل ہو جاتا ہے ؛ کیوں کہ مؤلف اظہار و تعبیر میں آزاد ہوتا ہے اور مترجم مؤلف کی تعبیر کا پابند، ترجمہ کے لئے

ضروری ہے کہ وہ دونوں زبانوں کے محاورات اور اسالیب بیان سے اچھی طرح واقف ہو، چنانچہ مترجم کا انتخاب کرتے ہوئے اکیڈمی نے اس بات کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔

ب : کتاب جس موضوع کی ہو، ضروری ہے کہ مترجم اس موضوع اور فن سے مناسبت رکھتا ہو؛ تا کہ اصطلاحات و استعارات کے مفاہیم درست طریقہ پر متعین کرسکے، اسی لئے موسوعہ کے ترجمہ کے لئے اکیڈمی نے عام طور پر فقہ کے اساتذہ اور افتاء وقضاء سے مربوط شخصیتوں کا انتخاب کیا اور انھیں سے یہ خدمت لی۔

ج : اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ ترجمہ میں برجستگی باقی رہے، ترجمہ پن پیدا نہ ہو، اور ممکن حد تک سہل و عام فہم زبان استعمال کی جائے، جملوں کی ترکیب اُردو زبان کے مزاج کے مطابق ہو اور رموزِ تحریر کی پوری پوری رعایت رکھی جائے۔

د : فقہی اصطلاحات کو اصل شکل میں باقی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، ترجمہ کرتے ہوئے ایسی تعبیرات اختیار کی گئی ہیں کہ فقہی حدود وقیود سے تجاوز نہ ہو جائے۔

ان تمام اُمور کی رعایت ملحوظ رکھنے کے لئے ترجمہ کے کام کو پانچ مراحل پر تقسیم کیا گیا تھا :

۱- پہلا مرحلہ مترجمین کی تعیین کا تھا، اس کے لئے پورے ملک سے کہنہ مشق اور باصلاحیت فضلاء سے ترجمہ کے نمونے طلب کئے گئے اور ایک کمیٹی نے اصل اور ترجمہ کا تقابل کر کے مترجمین کا انتخاب کیا۔

۲- پھر مختلف افراد کو مختلف جلدوں کے ترجمہ کی ذمہ داری سونپی گئی، ترجمہ اور رموزِ تحریر کے استعمال کے سلسلہ میں ایک تفصیلی ہدایت نامہ مرتب کر کے انھیں بھیجا گیا اور اس کی روشنی میں ان حضرات نے ترجمہ کیا اور اگر کہیں موسوعہ کی عبارت سمجھنے میں دقت ہوئی تو اصل مراجع —— جن کا حوالہ دیا گیا تھا —— سے بھی مراجعت کی گئی۔

۳- ترجمہ کے بعد ایک اور فاضل کو —— جو نسبتاً زیادہ تجربہ رکھتے تھے —— اس پر نظر ثانی کی ذمہ داری دی گئی اور ان سے کہا گیا کہ وہ صرف ترجمہ کی عبارت دیکھنے اور اس کے نوک و پلک درست کرنے پر اکتفاء نہ کریں؛ بلکہ اصل عبارت سے بھی تقابل کریں۔

۴- اس کے بعد نظر نہائی کی ذمہ داری ایسے افراد کو سونپی گئی، جو تالیف و ترجمہ میں زیادہ فائق و با اعتماد ہوں، ان سے کہا گیا کہ وہ نظر ثانی شدہ ترجمہ کو اصل سے ملائیں اور اپنے ساتھ ایک

اور معاون کو رکھیں اور دونوں مل کر نظر ڈالیں ؛ تاکہ زیادہ بہتر طور پر کام ہو سکے اور فنی ولسانی فرد گذاشتیں نظر انداز نہ ہو جائیں۔

۵- ان مراحل سے گذرنے کے بعد ترجمہ وزارت اوقاف کویت کو بھیجا جاتا ہے، انھوں نے اپنے یہاں دو تین اُردو داں اصحابِ نظر علماء کی کمیٹی رکھی ہے، جو اس پورے کام کا ناقدانہ جائزہ لیتی ہے اور حرف حرف پڑھ کر اپنے ''ملاحظات'' لکھتی ہے، پھر اس کے مطابق ترجمہ کی تصحیح کی جاتی ہے۔

اس طرح ان مراحل سے گذر کر اس ترجمہ کو قابل طباعت سمجھا جاتا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ موسوعہ کی کمپوزنگ کا کام عام اُردو خواں حضرات سے نہیں لیا گیا ہے؛ بلکہ ایسے حضرات سے لیا گیا ہے، جو فقہی اصطلاحات، شخصیات، تعبیرات اور کتابوں کے ناموں سے ایک گونہ مانوس ہوں، اس لئے پوری کمپوزنگ اکیڈمی کے دفتر میں کرائی گئی ہے اور کمپوزنگ کے لئے بھی اُردو خط کے جدید ترین پروگرام سے فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔

پھر یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ حروف کے حجم، صفحات کے سائز وغیرہ بالکل اصل کے مطابق ہوں، جہاں اکیڈمی نے ترجمہ کا کام کرایا ہے اور وہ اس کی علمی نگرانی کر رہی ہے، وہیں ''جینوین'' کو ایک تفصیلی معاہدہ کے تحت اس کی طباعت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، جس نے کتاب کے سرورق کا ڈیزائن اور کاغذ اور طباعت کا معیار اصل کے مطابق یا اس کے قریب رکھنے کی کوشش کی ہے۔

اس موقع پر ہمیں بے ساختہ اکیڈمی کے بانی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی یاد آتی ہے، جنھوں نے اس اہم علمی پراجکٹ پر توجہ کی، وزارت اوقاف سے اس کی منظوری حاصل فرمائی، مترجمین کا انتخاب کیا، بعض جلدوں پر خود نظر نہائی کی اور ان کی زندگی میں کئی جلدوں کا ترجمہ ہوا، نیز متعدد جلدوں پر نظر ثانی اور نظر نہائی کا کام مکمل ہو گیا، یہ ان کے اخلاص کی برکت ہے کہ ان کی وفات کے بعد بھی کسی وقفہ کے بغیر یہ عظیم علمی خدمت کا سلسلہ جاری رہا، اگر وہ اپنی آنکھوں سے اس کا مطبوعہ نسخہ دیکھتے تو یقیناً بے حد خوش ہوتے ؛ لیکن ہمیں اُمید ہے کہ یہ عظیم فقہی خدمت ان کے لئے بہترین صدقۂ جاریہ ہوگی اور اگر ہاتف غیبی نے آج کی اس تقریب کی خبر اللہ کی قدرت سے ان کو پہنچائی ہو تو یقیناً ان کی روح بے حد مسرور وشادکام ہوئی ہوگی۔

اخیر میں ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ بہ قول امجد حیدرآبادی :

جو کچھ ہوا ہے ، ہوا ہے کرم سے تیرے
جو بھی ہوگا ، تیرے کرم سے ہوگا

اکیڈمی، مسلمانانِ ہند اور پوری دنیا میں اُردو بولنے والے مسلمانوں کی طرف سے وزارت اوقاف کویت کا شکریہ ادا کرتی ہے، ان کی خدمت میں جذبۂ سپاس پیش کرتی ہے، نیز ان تمام لوگوں کی بھی شکرگذار ہے، جنھوں نے کسی بھی جہت سے اس کام میں تعاون کیا ہے اور حصہ لیا ہے، اخیر میں دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے اور اکیڈمی کے کاروانِ علم وتحقیق کو اپنی منزل کی طرف رواں دواں رکھے۔

واللہ ھو المستعان۔

● ● ●

تحقیق مخطوطات کی اہمیت ☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على خاتم النبيين وأفضل الأنبياء والمرسلين وعلى آله وأصحابه أجمعين ، أما بعد ۔

علماء کرام اور طلبۂ عزیز! اللہ کا شکر ہے کہ ہم سب ایک ایسے نبی کی اُمت ہیں، جن کی نبوت کا سایہ قیامت تک قائم رہے گا، جس کی لائی ہوئی شریعت ایک زندہ شریعت ہے، جو آخری درجہ فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ اور زندگی کی ضرورتوں اور مصلحتوں کو پوری کرنے والی ہے، جو شریعت انسانی زندگی سے متعلق ہو اور جو دین قیامت تک بے آمیز طریقہ پر باقی رہنے کے لئے ہو، ضروری ہے کہ اس سے متعلق علوم وفنون بھی زندہ و پائندہ رہیں، وہ کہنگی نا آشنا ہوں اور ان کی تازگی ہمیشہ برقرار رہے؛ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے دوسرے مذاہب اور ان کی مذہبی کتابوں سے متعلق علم و تحقیق کا سلسلہ یا تو مسدود ہو چکا ہے یا محدود؛ لیکن اسلام وہ دین برحق اور قرآن مجید وہ ازلی کتابِ ہدایت ہے، جس میں کسی وقفہ کے بغیر علم و تحقیق کا سلسلہ جاری وساری ہے اور گذشتہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال کی بہترین ذہانتیں ان علوم وفنون کی آبیاری میں خرچ ہوتی رہی ہیں، —— اور کیوں نہ ہوں کہ اسلام نے علم کو جو اہمیت دی ہے، مذاہب عالم میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ علم میں زیادتی عبادت میں زیادتی سے بہتر ہے ''**فضل العلم خير من فضل العبادة**'' (طبرانی، عن حذیفہ بن یمان، بحوالہ مجمع الزوائد، حدیث نمبر: ۴۷۸) رسول اللہ ﷺ کے سامنے جب دو ایسے اشخاص کا ذکر کیا گیا، جن میں ایک کا امتیاز عبادت میں تھا اور دوسرے کا علم میں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے کسی معمولی شخص پر، ''**فضل العالم على العابد كفضلي على أدناه**'' (ترمذی عن ابی امامہ، حدیث نمبر: ۲۶۵۰) آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کے ساتھ خیر کا معاملہ فرماتے ہیں تو اس کو تفقہ یعنی علمی گہرائی عطا فرماتے ہیں: ''**من يرد الله به خيرا يفقه في الدين**'' (سنن ترمذی: ۲۶۴۵) یہ اور اس طرح کے کتنے ہی ارشادات نبوی ہیں،

☆ کلیدی خطبہ بہ موقع: ''**دورة تدريبية لمنهج البحث والتحقيق**'' بمقام: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

جن میں علم کو بمقابلہ دوسرے اعمال کے ترجیح دی گئی ہے، یہاں تک کہ حضرت علی ؓ کا قول مروی ہے کہ اس عبادت میں خیر نہیں، جس کے ساتھ علم نہ ہو اور وہ علم مفید نہیں جس کے ساتھ فہم نہ ہو، ''**لا خير من عبادة لا علم فيها ولا خير في علم لافهم فيه**''۔ (سنن دارمی، حدیث نمبر: ۲۹۸)

یہ اسلام کا فیض ہے کہ اس نے انسانیت کو لوح وقلم کی اہمیت سے آشنا کیا، پیغمبر اسلام ﷺ پر جو پہلی وحی نازل ہوئی، خود اس میں قلم کا ذکر موجود ہے، قرآن نے قلم کی قسم کھائی ہے، ''**نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ**'' (القلم: ۱) عربوں کا حال یہ تھا کہ انھیں اپنے اُمی ہونے پر فخر تھا، اہل سیر کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ پیدا ہوئے تو مکہ میں صرف تیرہ لوگ لکھنا جانتے تھے اور جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو انصار میں صرف گیارہ لوگوں کو لکھنا آتا تھا اور عورتوں کے کاتب ہونے کو تو بہت ہی برا سمجھا جاتا تھا؛ لیکن یہ آپ ﷺ کا فیض ہے کہ صرف آپ کے کاتبانِ وحی کی تعداد چالیس سے زیادہ ہے، آپ نے خواتین کے لئے لکھنے کی حوصلہ افزائی فرمائی اور خود اُم المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو کتابت سکھوائی، اس لئے تحریر وتالیف اور بحث وتحقیق اس اُمت کو میراث میں ملی ہے، مسلمانوں نے کتابت کے وسائل پر بھی توجہ دی ہے، عرب عام طور پر اونٹ کی ہڈیوں، کھجور کی چھالوں اور بعض نرم سفید پتھروں پر لکھا کرتے تھے، اسلام کے آنے کے بعد بتدریج اسے ترقی حاصل ہوئی، یہاں تک کہ عالم اسلام میں عباسیوں کے دور ہی سے کاغذ کا استعمال عام ہوگیا، اس وقت پریس کا وجود نہیں تھا؛ اس لئے ''وراقی'' کا پیشہ شروع ہوا، نقل نویس ''وراق'' کہلاتے تھے اور انھیں معاشرہ میں بڑا مقام حاصل تھا، بڑے بڑے شہروں میں ان کے باضابطہ بازار ہوا کرتے تھے، علامہ مقریزی نے اپنی کتاب ''خطط'' میں تفصیل سے وراقین کا اور ان کے تحریری کمالات کا ذکر کیا ہے، یہاں تک کہ اسماء رجال کی کتابوں میں بعض دفعہ شخصیتوں کے تذکرہ میں حسن خط کا بھی ذکر کیا جاتا ہے، یہ سب کچھ نبی عربی اُمی ﷺ کا اعجاز تھا کہ جو قوم لکھنے پڑھنے سے بالکل ہی نابلد تھی، اس نے علمی کمالات اور بحث وتحقیق کے میدان میں امامت کا درجہ حاصل کرلیا، اب ضرورت ہے کہ پھر اسی جامِ کہن کا دور چلے، علم وتحقیق کی مجلسیں آراستہ ہوں اور موجودہ عہد کی ضرورت کے مطابق علماءِ اسلام دین وعلم دین کی خدمت کا فریضہ انجام دیں۔

شاید یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی نظام تھا کہ خلافت راشدہ کے عہد زریں تک تو سیاسی اور دینی قیادت کا مرکز ایک ہی رہا؛ لیکن جیسے جیسے سیاسی اقتدار کے ایوانوں پر خدا ناترس لوگ مسلط

ہوتے گئے اور اللہ کے دین کو نافذ کرنے کے لئے نہیں ؛ بلکہ اپنی عیش کوشی کے لئے لوگ اس میدان میں طالع آزمائی کرنے لگے، اقتدار کے دو الگ الگ مرکز قائم ہو گئے، ایک مرکز سیاسی قیادت کا تھا، دوسرا مرکز دینی رہنمائی کا تھا، پہلے مرکز سے ملک و مال کے فاتحین پیدا ہوئے اور دوسرے مرکز سے مفسرین ومحدثین، فقہاء وصوفیاء اور دین کے مخلص شارحین ومبلغین وجود میں آئے، اگرچہ اس تقسیم سے بعض نقصانات بھی ہوئے، مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کے دو بڑے فائدے بھی ہوئے، ایک یہ کہ اسلام کا پیغام ہر طرح کی آمیزش سے محفوظ رہا، حکومت کا جبر واستبداد بھی اس پر اثر انداز نہ ہوسکا، یہاں تک کہ صورتحال یہ تھا کہ اگر کوئی محدث شاہی دربار میں آمد ورفت رکھتا اور سرکاری عہدہ قبول کرتا تو محدثین اس کی روایت لینے سے گریز کرتے اور اگر کوئی فقیہ ایوان حکومت سے تعلق رکھتا اور کسی سرکاری منصب پر بٹھایا جاتا تو لوگ اس کے فتویٰ کو نامعتبر مانتے، یہاں تک کہ امام ابو یوسفؒ جیسی شخصیت جنھوں نے عہدۂ قضاء کو عباسی خلفاء کی بتدریج اصلاح کے لئے استعمال فرمایا، کتاب الخراج جیسی کتاب لکھی اور اس کے مقدمہ میں نہایت دردمندی کے ساتھ حکمرانوں کو دین وشریعت کی طرف متوجہ فرمایا، ان سے بھی امام ابو حنیفہؒ کے بعض تلامذہ نے کنارہ کشی اختیار کر لی، اس کی اہمیت کا اندازہ عیسائیت یا ہندومت کی تاریخ سے لگایا جاسکتا ہے، محض رومی حکمرانوں کو ان کے سابق مذہب سے مانوس رکھتے ہوئے عیسائیت کو قابل قبول بنانے کی غرض سے تثلیث کا عقیدہ گھڑا گیا ؛ کیوں کہ رومیوں کے مذہب میں تثلیث کا تصور پہلے سے موجود تھا، اسی طرح ہندو مذہب میں برہمنوں نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے اور برسر اقتدار گروہ پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لئے ویدوں کی حقیقی تعلیمات کو کنارے کر دیا اور بت پرستی، انسانیت کے درمیان تفریق اور آواگون کا پورا فلسفہ وضع کر لیا، جسے منوجی کی تعلیمات کہا جاتا ہے، اسلام میں بھی حالاں کہ اس کی حقیقی تعلیمات کو مسخ کرنے کی ناپاک کوششیں بھی ہوئیں ؛ لیکن اس میں کبھی کامیابی نہیں مل سکی ؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات منظور تھی کہ یہ دین ہمیشہ اپنی اصلی شکل پر باقی رہے اور بظاہر اس کا سبب یہی ہوا کہ علماء اسلام نے اپنے آپ کو سیاسی طالع آزمائی سے دور رکھا اور حکومتوں سے قربت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ سیاسی طوفان آتے اور جاتے رہے، اقتدار کے لئے کشت وخون کا بازار گرم ہوتا رہا؛ لیکن ان آندھیوں نے علم کے چراغ کو بجھنے بلکہ مدھم تک ہونے نہیں دیا؛ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جو زمانہ شدید سیاسی اُتار چڑھاؤ کا رہا ہے، عین اس زمانہ میں بھی اہل علم نے گوشۂ تنہائی

میں بیٹھ کر بڑے بڑے علمی کارنامے انجام دیئے ہیں اور ایسی کتابیں تالیف کی ہیں، جن کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی؛ بلکہ ایسا بھی ہوا کہ جب عالم اسلام کا چپہ چپہ تاتاریوں کے قدموں کی دھمک سے لرز اُٹھا تو اہل علم نے دوسرے علاقوں میں ہجرت کی اور وہ وہاں پہنچ کر گیسوئے علم کی آراستگی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

سلف صالحین علم وتحقیق کے کام کو ایک عبادت سمجھ کر انجام دیتے تھے، علامہ ابن جوزیؒ جو کثیر التصنیف علماء میں تھے، انھوں نے ڈھائی سو کتابیں تصنیف کی ہیں اور خود فرمایا کہ میری ان انگلیوں نے دو ہزار جلدیں لکھی ہیں، انھوں نے حدیث شریف کی جو کتابیں لکھیں، ان کے قلموں کے تراشے جمع کرتے گئے اور وصیت کی کہ انھیں تراشوں سے میرے غسل کا پانی گرم کیا جائے؛ چنانچہ ان کی وصیت پر عمل کیا گیا، امام ابوجعفر طبری کی وفات کے بعد ان کی تصنیفات کو شمار کیا گیا تو ابتدائے جوانی سے یوم وفات تک چودہ ورق روزانہ کا اوسط پڑا۔

ابن شہاب زہریؒ کے علمی اشتغال کا حال یہ تھا کہ ان کی بیوی ان کی کتابوں کے بارے میں کہتی تھیں کہ یہ مجھ پر تین سوکنوں سے بڑھ کر ہیں ’’**واللہ لھذہ الکتب أشد عليّ من ثلاث ضرائر**‘‘ وہ کھانے کے وقت بھی اپنے مسودہ کا مطالعہ کرتے رہتے اور ان کی بہن ان کے منھ میں لقمہ ڈالتی جاتی تھیں، امام رازی کو اس بات کا افسوس ہوتا کہ ان کے کھانے کا وقت ضائع ہوجاتا ہے؛ کیوں کہ وہ وقت علمی اشتغال سے خالی رہتا ہے، پھر جو کچھ لکھا اور پڑھا جاتا، اس کے پیچھے گہری تحقیق اور غیر معمولی محنت کارفرما ہوتی تھی۔

ابوعبیدہ بن سلام سے مروی ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب ’’غریب الحدیث‘‘ کی تصنیف میں چالیس سال صرف کئے، —— شیخ عبدالفتاح ابوغدہ اور خود اُردو میں بھی مولانا محمد حبیب الرحمٰن شیروانی نے اپنی کتاب ’’علماء سلف‘‘ میں تذکرہ ورجال کی بہت سی اہم کتابوں سے علماء کے علمی اشتغال کے کتنے ہی اہم واقعات نقل کئے ہیں، جو طلبۂ عزیز کے پڑھنے کے لائق ہیں، یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ ان کے نزدیک علم وتحقیق کو عبادت کا درجہ حاصل تھا اور وہ اس کام کو اللہ کی رضاء وخوشنودی کے لئے کیا کرتے تھے۔

افسوس کہ اہل علم کا بہت سارا علمی ذخیرہ آج دستیاب نہیں ہے، بعض کم فہم لوگوں کا حال تو یہ ہے کہ اگر کسی عالم کی کسی تالیف کا کتابوں میں تذکرہ ملتا ہے؛ لیکن اب وہ دستیاب نہیں ہے تو لوگ ان

تصنیفات کو ماننے سے انکار کر جاتے ہیں اور مسلکی تعصب کی بنا پر اس کو جھوٹ قرار دیتے ہیں ؛ حالاں کہ ایسا نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں نے جس دور میں علم وفن کے چراغ جلائے، وہ دور پریس کی سہولتوں کا نہیں تھا، علمی کاموں کے لئے دماغ کے ساتھ ساتھ آنکھوں کا چراغ بھی جلانا پڑتا تھا اور الفاظ ونقوش کے لعل و گہر مشینوں کے ذریعہ نہیں ؛ بلکہ اپنے ہاتھوں سے پروئے جاتے تھے، اس لئے بڑی مشقت سے کتاب کی تالیف پایۂ تکمیل کو پہنچتی تھی اور کبھی کبھی اتنی ہی دشواری کے ساتھ اس کے قلمی نسخے تیار کئے جاتے تھے، پھر ان کی حفاظت کے لئے معقول انتظام بھی نہیں تھا، زیادہ تر انفرادی طور پر لوگ ان علمی جواہر کو محفوظ کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس لئے بہت سارے مخطوطات ضائع ہوگئے۔

خاص کر جب تاتاریوں نے بغداد کا عظیم الشان مکتبہ جلا کر خاکستر کر دیا تو علم وفن کے کتنے ہی جواہر پارے ہمیشہ کے لئے نیست ونابود ہوگئے، کہا جاتا ہے کہ ان کتابوں کی راکھ سے دریائے دجلہ پر پل بنایا گیا، اِس سے اس خزانۂ علمی کی کثرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، عجیب بات ہے کہ تاتاری قوم غیر مہذب اور وحشی تھی ؛ لیکن موجودہ دور میں جو لوگ اپنے آپ کو تہذیب وشائستگی کا نمائندہ سمجھتے ہیں، انھوں نے بھی علمی خزانہ کی تباہ کاری میں کچھ کم ''بہادری'' کا مظاہرہ نہیں کیا، کویت اور عراق کی جنگ میں جامع امام ابوحنیفہؒ بغداد سے منسلک مخطوطات کی ایک بڑی لائبریری کو عصر حاضر کے تاتاری یعنی امریکہ نے قصداً بمباری کر کے راکھ کا ڈھیر بنا دیا، اسی طرح کتنے ہی مخطوطات ہیں، جن کو مغرب کی استعماری طاقتیں مشرقی اور اسلامی ملکوں سے لوٹ کر لے گئیں، ان میں سے بعضوں نے یقیناً بہتر طور پر ان کی حفاظت کا انتظام بھی کیا ؛ لیکن بہت سے مخطوطات ضائع بھی کر دیئے گئے، اس لئے یہ سمجھنا کم فہمی ہوگی کہ جن تالیفات کا کتابوں میں ذکر آیا ہے، اگر وہ آج دستیاب نہ ہوں تو گذشتہ مؤلفین کے بیان کو خلاف واقعہ سمجھا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے کہ اس وقت بھی دنیا کے مختلف خطوں میں اسلامی مخطوطات کی ایک بڑی تعداد موجود ہے، ترکی — بہ قول ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ — ان مخطوطات کا دار الخلافہ ہے اور عالم اسلام کے خاص خاص ملکوں میں ان کی بڑی تعداد موجود ہے ؛ لیکن برصغیر کا مقام بھی اس معاملہ میں کم نہیں ہے، سندھ کا علاقہ تو اس کے لئے معروف رہا ہی ہے ؛ لیکن موجودہ ہندوستان میں بھی مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے، خدا بخش لائبریری پٹنہ، شعبۂ مخطوطات مشرقی حیدر آباد، رضاء

لائبریری رامپور، نیشنل لائبریری کلکتہ، ٹونک، بھوپال، ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ کی خاندانی لائبریری اور نہ جانے کتنے انفرادی مکتبے اور دینی درسگاہوں اور علمی اکیڈمیوں کی لائبریریاں ہے، جو ان خزانوں سے معمور ہیں، اگرچہ کہ'' مکتبہ الجمعہ الماجد، عرب امارات'' اور ایرانی سفارت خانہ کے ذریعہ اس کی فہرست سازی اور مخطوطات کی اسکیاننگ کا نہایت قابل قدر کام انجام پارہا ہے؛ لیکن اس کے باوجود آج بھی بہت سے مخطوطات ان دفینوں کی نذر ہیں، جہاں تک اہل علم کی رسائی نہیں ہو پائی ہے ، ہندوستان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ سب سے پہلے حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کی تصحیح وتحقیق کے ساتھ یہاں سے صحیحین کی طباعت عمل میں آئی، جو آج بھی صحیح ترین نسخہ تصور کیا جاتا ہے — اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے فضیلت جنگ حضرت مولانا شاہ انوار اللہ فاروقیؒ کو، جیسے انھوں نے اسلامی علوم کی تدریس کے لئے'' جامعہ نظامیہ'' کی بنیاد رکھی، اسی طرح اسلامی علوم کے ان مستور خزانوں کو اہل علم تک پہنچانے کے لئے مستقل ایک ادارہ'' دائرۃ المعارف العثمانیہ'' (سابق نام: دائرۃ المعارف النظامیہ) کی بنیاد رکھی، جس کے ذریعہ مختلف اسلامی علوم وفنون کے بہت سارے مخطوطات منظر عام پر آئے، جن میں علامہ سمعانیؒ کی 'کتاب الانساب' حافظ ذہبیؒ کی 'تذکرۃ الحفاظ' شیخ علی متقی الہندیؒ کی 'کنز العمال' امام طحاویؒ کی 'مشکل الآثار' امام محمد بن حسن شیبانیؒ کی 'کتاب الآثار' حدیث کی معروف کتاب 'سنن بیہقی' مفردات حدیث میں 'غریب الحدیث' رجال میں 'کتاب المجروحین' ربط آیات پر منفرد تفسیر 'نظم الدرر' اور نہ جانے کتنے ہی علمی شہ پارے شامل ہیں اور اس یہاں سے طرح ایک عظیم تاریخی کارنامہ انجام پایا۔

بحمد اللہ ادھر مخطوطات کی تحقیق پر لوگوں کی توجہ بڑھی ہے، خاص کر عالم عرب کی جامعات میں دکتورہ کے طلبہ اس موضوع پر بڑی اہم خدمت انجام دے رہے ہیں؛ لیکن خاص کر فقہ حنفی کے مخطوطات پر ابھی بھی توجہ کی ضرورت ہے، فقہ مالکی کی کتابوں کو مغرب کی حکومت نے شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے، فقہ حنبلی کی کتابیں سب سے کم دستیاب تھیں، ان پر موجودہ سعودی حکومت نے توجہ دی، نیز سعودی حکومت نے تفسیر وحدیث کے مخطوطات کو بھی طبع کرنے کا اہتمام کیا، شافعی دبستانِ فقہ میں چوں کہ بڑے بلند پایہ علماء ومحدثین پیدا ہوتے رہے ہیں، اس لئے انھوں نے اپنے مذہب کی کتابوں کی خود ہی خدمت کر کے ان کو مستغنی کر دیا ہے۔

لیکن فقہ حنفی کے ساتھ یہ سانحہ ہوا کہ جن ملکوں میں احناف کی اکثریت ہے، وہاں کی

حکومتوں کو دین و مذہب سے کم تعلق ہے ؛ چنانچہ آج تک امام محمد کی ''کتاب الاصل'' کی بھی پوری جلدیں نہیں آسکیں ، حاکم شہید کی ''الکافی'' کے لئے اب تک نگاہیں ترستی ہیں ، محیط برہانی اور تاتار خانیہ جیسی اہم کتابیں ابھی کچھ عرصہ پہلے منظر عام پر آئی ہیں ، نیز امام صاحب ، ان کے تلامذہ ، مشائخ مذہب اور محدثین احناف کی کتنی ہی تالیفات ہیں ، جن کے نام ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں ، مگر وہ اہل علم کا سرمہ چشم نہیں بن سکیں ، اللہ جزائے خیر دے حضرت مولانا ابوالوفاء افغانیؒ کو ، کہ انھوں نے ''احیاء المعارف النعمانیہ'' قائم کر کے فقہ حنفی کی بعض بنیادی کتابوں کو اہل علم کی بارگاہ تک پہنچایا ، اس سے پہلے غالباً لوگ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی کتابوں کو دیکھنے سے بھی قاصر تھے ، اس کے علاوہ بھی ہندوستان کے اہل علم نے اس پر خصوصی توجہ دی ہے ، جب حدیث وفقہ کی اہم کتابیں عالم اسلام میں ناپید تھیں ، اس وقت ہندوستان میں بعض قیمتی مخطوطات طبع ہوئے اور ہندوستان کے اصحابِ ذوق نے اہم ترین علمی ذخائر کو اہل علم کی بارگاہ تک پہنچایا ، اس سلسلہ میں ماضی قریب کی شخصیتوں میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ ، مولانا ابوالوفاء افغانیؒ ، مولانا مہدی حسن شاہجہاں پوری ، مولانا حبیب الرحمن اعظمی وغیرہ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

ابھی بھی بے شمار مخطوطات ہیں جو منظر عام پر نہیں آپائے ہیں ، اسی طرح بعض مخطوطات وہ ہیں جو اگرچہ طبع ہوئے ہیں ؛ لیکن ان میں اغلاط کی کثرت ہے ، نصوص کی تصحیح پر توجہ کم دی گئی ہے ، بعض کتابیں جن مصنفین کی طرف منسوب کر کے شائع کی گئی ہیں ، علماء کے نزدیک اس کی نسبت بجائے خود مشکوک ہے ؛ اس لئے ضرورت ہے کہ ہندوستان میں علمی و تحقیقی اکیڈمیاں اور اعلیٰ دینی تعلیمی درسگاہیں اس اہم خدمت کی طرف متوجہ ہوں۔

حضرات ! المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد ، جس کے قیام پر بارہ سال کا عرصہ گزر چکا ہے ، اس کا مقصد صرف تعلیم و تعلم ہی نہیں ؛ بلکہ بحث و تحقیق اور برادران وطن میں دعوت اسلام اور اس کی تربیت بھی ہے ؛ چنانچہ اب تک ۱۴۹ ر موضوعات پر یہاں زیر تربیت فضلاء نے کام کیا ہے ، جن میں سے عربی واُردو میں ۴۰ مقالات طبع ہو چکے ہیں ، اور کام لیتے ہوئے چند جہتوں کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے ، اول یہ کہ ایسے نئے مسائل پر ان سے کام کرایا جائے ، جس کی موجودہ دور میں ضرورت ہے ، دوسرے : ان موضوعات کا انتخاب کیا جائے جو اہل علم کے لئے نفع بخش ہیں ، تیسرے : سلف کے وہ علوم جو مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہیں ، ان پر تعلیق و تحقیق ؛ تا کہ وہ اہل علم کے لئے لائق

استفادہ ہوسکیں؛ چنانچہ ''الأدلۃ الشریعۃ علی مذہب أبي حنیفۃ، الفوائد الظہیریۃ، فتاویٰ سراجیہ، فتاویٰ غیاثیہ، تفسیرات أحمدیۃ، الکافي للشہید، مختصر شرح معاني الآثار لابن رشد المالکي'' پر اس وقت کام چل رہا ہے، اور شعبۂ حدیث میں تحقیق کے کام کے لئے ڈاکٹر حمید اللہؒ چیئر اور فقہ میں قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ چیئر قائم ہے، اس سال شعبۂ تحقیق کو مستقل حیثیت دیتے ہوئے اس کو ایک علاحدہ شعبہ کی حیثیت سے قائم کیا جارہا ہے، یہ شعبہ ابتداءً چھ رفقا پر مشتمل ہوگا، اسی مناسبت سے اس ورکشاپ کا انعقاد عمل میں آرہا ہے؛ تاکہ اس کام کے لئے افراد کار تیار ہوسکیں اور علماء ایک پیشہ کے طور پر نہیں؛ بلکہ اپنے سلف کی طرح ایک عبادت کے طور پر اسے انجام دیں، اگرچہ اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ کام کی وسعت کے لحاظ سے یہ ایک حقیر کوشش ہے؛ لیکن انسان اپنی صلاحیت کے مطابق کوشش کرنے کا مکلف ہے، ایک ایک اینٹ کے جڑنے سے دیوار وجود میں آتی ہے اور ایک ایک قطرہ مل کر سمندر بنتا ہے، کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس معمولی سی کوشش کو اِس طرف لوگوں کے متوجہ ہونے کا ذریعہ بنادے، **وما ذالک علی اللہ بعزیز۔**

اخیر میں اپنے ان مہمانوں کا شکر گزار ہوں، جن کی تشریف آوری نے آج کے اس اجلاس کی رونق کو بڑھایا ہے، خاص کر محب گرامی مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی صاحب، پروفیسر اختر الواسع صاحب، پروفیسر محسن عثمانی صاحب، پروفیسر سید جہانگیر صاحب، پروفیسر عبد المعز صاحب اور ڈاکٹر فہیم اختر ندوی صاحب کا، جن کی آمد نے اس پروگرام کی وقعت میں اضافہ کیا ہے، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ معہد کو اس کے بلند، وسیع مقاصد میں کامیاب فرمائے اور اسے دین کی دعوت و تحقیق کا اور حفاظت واشاعت کا مرکز بنادے۔ آمین

● ● ●

موجودہ عہد میں اسلامی قانون کی اہمیت ☆

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام على سيد المرسلين ، وعلىٰ آله وصحبه اجمعين ، وعلىٰ من تبعهم باحسان الى يوم الدين ـ

صدر عالی قدر، بزرگانِ محترم، حضرات گرامی! اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے کہ اس وقت ہم آفاقی شہرت کی حامل ایک تاریخی دانش گاہ میں جمع ہیں، جس کے بانی کی بنیادی فکر تھی کہ ہمارے دائیں ہاتھ میں قرآن مجید ہو، بائیں ہاتھ میں سائنس اور سر پر "**لا اله الا الله محمد رسول الله**" کا تاج — بانی کے اخلاص اور ان کی حسن نیت کا ثمرہ ہے کہ آج علم ودانش کے اس مہر عالم تاب کی کرنیں پوری دنیا میں پھیل رہی ہیں اور انشاء اللہ ہمیشہ پھیلتی رہیں گی، اللہ اسے نظر بد سے محفوظ رکھے، اس لئے اس جگہ سے زیادہ مناسب اور زیادہ بہتر شاید کوئی اور جگہ نہیں ہوسکتی تھی، جہاں "موجودہ عہد میں اسلامی قانون کی معنویت" پر یہ مذاکرہ منعقد ہوتا۔

حضرات ! انسان کی خواہشات، اس کی چاہتیں اور آرزوئیں جن کو قرآن نے "امانی" سے تعبیر کیا ہے، (النساء: ۱۲۳) بے شمار اور بے نہایت ہیں؛ جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو اس کی تمام تر وسعت کے باوجود محدود وسائل کا حامل بنایا ہے، اس دنیا میں انسان کی ضرورتیں تو پوری ہوسکتی ہیں، کہ یہ اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کا عین تقاضا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "**وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلاَّ عَلَى اللهِ رِزْقُهَا**" (**ھود:۶**) اور رزق میں تمام ضرورتیں شامل ہیں؛ لیکن اس کی نہ ختم ہونے والی سرحد ناآشنا خواہشات پوری نہیں ہوسکتیں، اس کی جگہ دنیا نہیں، آخرت ہے، جو "**مَا تَشْهِيْ اَنْفُسَكُمْ**" کی جگہ ہے (**فصلت:۳۱**) اسی لئے آخرت میں جنت مکیں لوگوں کے درمیان کوئی ٹکراؤ اور تصادم نہیں ہوگا اور ان کے قلوب ہر طرح کے "غل وغش" سے پاک ہوں گے؛ مگر اس دنیا میں محدود وسائل کی وجہ سے خواہشات کے درمیان ٹکراؤ ہوگا، اس ٹکراؤ کی وجہ سے ظلم وزیادتی کے واقعات بھی پیش آئیں گے اور جرائم کا ارتکاب بھی ہوگا؛ بلکہ پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام

☆ اس عنوان سے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے جامعہ ملیہ دہلی میں شعبۂ اسلامیات کے تعاون سے ایک سیمینار منعقد کیا تھا، یہ اس سیمینار کا کلیدی خطبہ ہے۔

کی اولاد ہابیل اور قابیل سے ہی اس کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔(المائدۃ:۲۸)

اسی کے لئے قانون کی ضرورت پیش آتی ہے، قانون اس تصادم کو روکتا ہے، قانون ہر شخص کے لئے دائرے مقرر کرتا ہے کہ اس کے حقوق اور اختیارات کی حدیں کہاں تک ہیں؟ قانون ظالم کو ظلم سے باز رکھتا ہے اور اس کے جرائم کی سزا دیتا ہے، مظلوم کو انصاف دلاتا ہے اور اس کے حق کو بازیاب کرتا ہے، اس لئے کوئی مہذب انسانی سماج ایسا نہیں ہوسکتا، جو کسی قانون کے بغیر زندگی بسر کرے، جو سماج لاقانونیت پر مبنی ہو، وہ حقیقت میں ''جنگل راج'' کا مصداق ہوگا اور وہاں ''جس کی لاٹھی، اس کی بھینس'' کے اُصول پر جبر وظلم کے سایہ میں لوگوں کو زندگی بسر کرنی ہوگی، اس لئے قانون کی اہمیت اور انسانی سماج کے لئے اس کی ضرورت کا کوئی سمجھدار شخص انکار نہیں کرسکتا۔

اہمیت اس بات کی ہے کہ قانون بنانے کا حق کس کو ہے؟ —— بنیادی طور پر دنیا کی تاریخ میں تین قسم کے قوانین پائے جاتے ہیں، شخصی قانون، عوامی قانون اور الہامی قانون، شخصی قانون میں ایک شخص کی زبان اور اس کی سوچ قانون کی اساس ہوتی ہے، تنہا بادشاہ یا ڈکٹیٹر کے فیصلے تمام عوام پر واجب العمل سمجھے جاتے ہیں، آج کی دنیا شاہی نظامِ حکومت کو رد کرچکی ہے، بہت کم ملکوں میں اس طرح کے نظام قائم ہیں اور جہاں ہیں، وہاں بھی بہت سی جگہوں میں بادشاہ کو محض ایک علامتی سربراہ کی حیثیت سے باقی رکھا گیا ہے؛ عوام اپنے منتخب نمائندوں کے واسطہ سے خود قانون بناتے ہیں، جسے ہم ''جمہوریت'' کہتے ہیں، آج کی دنیا میں یہ ایک آئیڈیل، پسندیدہ اور مقبول ترین نظام حکومت ہے، جو ہمارے ملک میں بھی جاری ہے؛ بلکہ کہا جاتا ہے کہ ہم دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہیں، ان دونوں نظام ہائے حکومت میں انسان کو قانون بنانے کا اہل مانا جاتا ہے اور وہی قانون کا اصل سرچشمہ ہوتا ہے، چاہے شاہی فرامین ہوں، عوام کے منتخب نمائندوں کے فیصلے ہوں یا حکومت کے نامزد عوامی نمائندوں کے فیصلے، یا وہ رسوم ورواجات جنھیں عوامی مقبولیت حاصل ہوگئی ہے۔

اس کے مقابلہ قانون کی ایک قسم وہ ہے جو الہام پر مبنی ہے، یعنی وہ قانون جس کی بنیاد مذہب پر ہے اور مذہب وجود میں آتا ہے خدا کے تصور سے، اس لئے اہل مذہب اپنے قوانین کے بارے میں خیال رکھتے ہیں کہ یہ خدا کا بھیجا ہوا قانون ہے، جو کسی ذریعہ سے انسانیت تک پہنچا ہے، اسلام بنیادی طور پر اسی کا قائل ہے؛ چنانچہ اسلام کی نگاہ میں قانون بنانے اور حلال وحرام کو متعین کرنے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، **إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ**، (الانعام:۵۷) **وَلَهُ الْأَمْرُ** (الاعراف:۵۴)؛ کیوں کہ پوری انسانیت کے لئے وہی ذات نظامِ حیات کو طے کرسکتی ہے، جو ایک طرف پوری کائنات کے

بارے میں باخبر ہو اور پوری انسانیت کے جذبات واحساسات اور اس کی خواہشات وضروریات، نیز اس کے نفع ونقصان اور اشیاء کے نتائج واثرات سے پوری طرح واقف ہو؛ کیوں کہ اگر وہ ان حقیقتوں کا علم نہیں رکھتا ہو، تو عین ممکن ہے کہ اس کے دیئے ہوئے بعض احکام نفع کے بجائے نقصان اور خیر وفلاح کے بجائے ناکامی وخسران کا باعث بن جائیں۔

دوسری طرف وہ تمام انسانی طبقات کے ساتھ عدل وانصاف کا برتاؤ کرسکتا ہو، کالے گورے، امیر وغریب، مرد وعورت، رنگ ونسل اور زبان ووطن کی بنیاد پر ان کے درمیان کوئی تفریق روانہ رکھتا ہو —— اور ایسی ذات خدا ہی کی ہوسکتی ہے؛ کیوں کہ وہ علیم وخبیر بھی ہے اور عادل ومنصف بھی۔

انسان یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ کائنات کی تمام اشیاء کے فائدہ ونقصان اور پوری انسانیت کے جذبات واحساسات سے واقف ہے؛ بلکہ وہ تو اپنے آپ سے بھی پوری آگہی کا مدعی نہیں ہوسکتا، اور ہر انسان چوں کہ کسی خاص رنگ ونسل، کنبہ وخاندان اور زبان وعلاقہ کی وابستگی کے ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے اور یہ وابستگی اس میں فطری طور پر ترجیح وطرفداری کا ذہن پیدا کرتی ہے؛ اس لئے کسی انسان یا انسانی گروہ کے بارے میں یہ بات نہیں سوچی جاسکتی کہ وہ تمام انسانوں کے ساتھ مساوی طریقہ پر عدل وانصاف کا برتاؤ کرے گا؛ اس لئے خدا کا بھیجا ہوا قانون انسانی قانون کے مقابلہ یقینا برتر وفائق اور مبنی بر انصاف ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے جس دن سے کائنات کی یہ بستی انسانوں سے بسائی ہے، اسی دن سے انسان کو زندگی بسر کرنے کے طریقہ کی بھی تعلیم دی ہے، پھر انسانی تمدن کے ارتقاء کے اعتبار سے وقتاً فوقتاً نئے احکام بھی دیئے جاتے رہے ہیں، نیز قانون کی گرفت کو کمزور کرنے کے لئے انسان نے آسمانی ہدایات میں اپنی طرف سے آمیزشیں بھی کی ہیں، ان تحریفات اور آمیزشوں سے پاک کرنے کی غرض سے رب کائنات کی طرف سے انسانیت کے لئے نئے بے آمیز ہدایت نامے آتے رہے ہیں، اس سلسلہ کی آخری کتاب قرآن مجید کی صورت میں پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی، یہ کوئی نیا قانون اور مکمل طور پر نئی شریعت نہیں ہے؛ بلکہ اسی قانون کا تسلسل ہے، جو مختلف ادوار میں پیغمبروں کے واسطہ سے انسانیت تک پہنچتا رہا ہے۔

محترم حضرات ! شریعتِ اسلامی کو جو باتیں انسان کے خودساختہ قوانین سے ممتاز کرتی ہیں، ان میں سے چند کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے :

۱- عدل

شریعتِ اسلامی کا سب سے امتیازی پہلو اس کا عدل ہے، اس دین کی بنیاد ہی عدل پر ہے، **إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ**،(**النحل: ۹۰**) اسلام کی نگاہ میں رنگ و نسل ،جنس اور قبیلہ وخاندان کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

> **يَآ أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْباً وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ، إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ** ۔ (**الحجرات: ۱۳**)
>
> اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک ہی مرد وعورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو خاندانوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ہے؛ تا کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک تم میں سب سے زیادہ معزز اللہ کے نزدیک وہ ہے، جو سب سے زیادہ تقوی اختیار کرنے والا ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے اس کو مزید واضح فرمایا اور ارشاد ہوا کہ کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے،(**مسند احمد: ۵/۴۱۱**) اسلام کے تمام قوانین کی اساس اسی اُصول پر ہے، برخلاف انسانی قوانین کے کہ انسانوں نے جو بھی قوانین وضع کئے ہیں، وہ ایک گروہ کی برتری اور دوسرے طبقہ کی تذلیل وحق تلفی پر مبنی رہا ہے، مغربی ممالک میں نصف صدی پہلے تک نسلی تفریق موجود تھی، ساؤتھ افریقہ میں تو یہ تفریق (جو اہل یورپ کی طرف سے مسلط کی گئی تھی) گذشتہ پندرہ بیس سال پہلے تک بھی موجود تھی ، آج بھی ان کے آثار وشواہد باقی ہیں ،جنھیں دیکھ کر انسانیت کا سر مارے شرم کے جھک جاتا ہے، امریکہ جو دُنیا کی واحد سُپر طاقت ہے ، وہاں کی بعض ریاستوں میں آج بھی نسلی امتیاز پر مبنی قوانین موجود ہیں ،شہریت کے مختلف درجات مقرر ہیں اور اسی نسبت سے ان کو رعایتیں اور سہولتیں حاصل ہوتی ہیں ،بعض ریاستوں میں اب بھی گوری اور کالی نسل کے درمیان شادی نہیں ہوسکتی ، اگر کر لی جائے تو یہ شادی غیر معتبر ہوگی اور پانچ سو ڈالر یا چھ مہینہ کی قید یا دونوں سزائیں اس کا ارتکاب کرنے والوں کو دی جائیں گی ۔(**الرق بیننا وبین أمریکا: ۳۹، تالیف: علی شحاته**)

۲- توازن واعتدال

شریعتِ اسلامی کا دوسرا امتیازی وصف اس کا '' توازن و اعتدال '' ہے ،مثلاً مرد وعورت

انسانی سماج کے دو لازمی جزو ہیں، دُنیا میں کچھ ایسے قوانین وضع کئے گئے، جن میں عورت کی حیثیت جانور اور بے جان املاک (Property) کی سی قرار دے دی گئی، نہ وہ کسی جائیداد کی مالک ہوسکتی تھی نہ اس میں تصرف کرسکتی تھی، نہ اس کو اپنے مال پر اختیار حاصل تھا نہ اپنی جان پر، یہاں تک کہ اہل علم کے درمیان بحث جاری تھی کہ عورتوں میں انسانی روح پائی جاتی ہے یا حیوانی روح؟ اس کے مقابل دوسری طرف کچھ لوگوں نے عورتوں کو تمام ذمہ داریوں میں مردوں کے مساوی قرار دے دیا، عورتوں کی جسمانی کمزوری، ان کے ساتھ پیش آنے والے قدرتی حالات وعوارض اور طبیعت ومزاج اور قوتِ فیصلہ پر ان کے اثرات کو نظر انداز کردیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہ ظاہر تو اسے عورت کی حمایت سمجھا گیا؛ لیکن انجامِ کار اس آزادی نے سماج کو بے حیائی، اخلاقی انارکی، ناقابل علاج امراض، خاندانی نظام کا بکھراؤ اور خود عورتوں کو ناقابل تحمل فرائض کا تحفہ دیا۔

اسلام نے مردوں اور عورتوں سے متعلق نہایت متوازن قانون دیا ہے، انسانی حقوق میں مردوں اور عورتوں کو مساوی درجہ دیا گیا ہے، **وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ**، **(البقرہ: ۲۲۸)** لیکن سماجی زندگی میں دونوں کے قویٰ اور صلاحیت کے لحاظ سے فرق کیا گیا ہے اور بال بچوں کی تربیت کی ذمہ داری عورتوں پر اور کسبِ معاش کی ذمہ داری مردوں پر رکھی گئی ہے، سماجی زندگی کا یہ نہایت ہی زریں اُصول ہے، جس میں خاندانی نظام کا بقاء، اخلاقی اقدار کی حفاظت اور عورت کو ناقابل برداشت مصائب سے بچانا ہے۔

دولت مندوں اور غریبوں، آجروں اور مزدوروں، عوام اور حکومت کے تعلقات اور مجرموں اور جرم سے متاثر مظلوموں کے درمیان انصاف وغیرہ سے متعلق اسلامی تعلیمات کو اگر حقیقت پسندی کے ساتھ دیکھا جائے تو قانونِ شریعت میں جو اعتدال نظر آئے گا، گذشتہ اور موجودہ ادوار میں انسانوں کے بنائے ہوئے کسی قانون میں ایسی میانہ روی نہیں ملے گی۔

۳- عقل و مصلحت سے ہم آہنگی

خدا سے بڑھ کر کوئی ذات انسان کی مصلحتوں سے آگاہ نہیں ہوسکتی؛ اسی لئے شریعت کے احکام عقل کے تقاضوں اور مصلحتوں کے عین مطابق ہیں، یہاں تک کہ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ شریعت تمام تر مصلحت ہی سے عبارت ہے اور ہر حکم شرعی کا مقصد یا تو کسی مصلحت کو پانا ہے، یا کسی نقصان اور مفسدہ کا ازالہ:

’’**إن الشريعة كلها مصالح ، إمادرأ مفاسد ، أوجلب مصالح**‘‘۔ (قواعد الاحکام لعزالدین بن عبدالسلام: ۱/۹)

اس کے برخلاف انسان کی عقل کوتاہ ونارسا ہے اور بہت سی دفعہ خود اپنے نفع ونقصان کو سمجھنے سے بھی قاصر وعاجز انسان بعض اوقات خواہشات سے اس قدر مغلوب ہوجاتا ہے کہ کسی بات کو نقصان جانتے ہوئے بھی اس کو قبول کرلیتا ہے، اس کی واضح مثال شراب ہے، شراب انسان کے لئے نہایت نقصان دہ اور اس کی صحت کو برباد کردینے والی چیز ہے، اس پر اتفاق ہے؛ لیکن آج دُنیا کے ان تمام ملکوں میں جو انسانی قانون کے زیر سایہ زندگی بسر کررہے ہیں، شراب کی اجازت ہے، غیر قانونی جنسی تعلق اور ہم جنسی کے بارے میں تمام میڈیکل ماہرین متفق ہیں کہ یہ صحت کے لئے نہایت مہلک فعل ہے اور نہ صرف اخلاق کے لئے تباہ کن ہے؛ بلکہ طبی نقطۂ نظر سے بھی زہر ہلاہل سے کم نہیں، اس کے باوجود عوامی دباؤ اور آوارہ خیال لوگوں کی کثرت سے مجبور ہوکر بہت سے ترقی یافتہ ملکوں میں ان خلافِ فطرت اُمور کی بھی اجازت دے دی گئی ہے۔

اسلامی شریعت کہیں بھی عقل اور حکمت ومصلحت سے برسرِ پیکار نظر نہیں آتی اور اس کا ایک ایک حکم انسانی مفاد ومصلحت پر مبنی ہے۔

۴- فطرتِ انسانی سے مطابقت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے، اسی لئے وہی انسانی فطرت سے بھی پوری طرح واقف ہے اور اس کی بھیجی ہوئی شریعت مکمل طور پر فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ ہے؛ اسی لئے قرآن نے اسلام کو دین فطرت سے تعبیر کیا ہے، **فِطْرَةَ اللهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا**، (الروم: ۳۰) فطرت سے بغاوت ہمیشہ انسان کے لئے نقصان وخسران اور تباہی وبربادی کا سبب بنا ہے، انسان کے بنائے ہوئے قانون میں فطرت سے بغاوت کا رجحان قدم قدم پر ملتا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے عورت کی فطرت میں جلد بازی، زود رنجی اور بعجلت قدم اُٹھانے کا مزاج رکھا ہے؛ اسی لئے اسلام نے طلاق کا اختیار عورت کے ہاتھ میں نہیں رکھا، مرد کو طلاق کا اختیار دیا اور عورت کے لئے عدلیہ کے واسطہ سے گلو خلاصی کی سہولت دی، مغرب نے مرد وعورت کو مساوی درجہ دیتے ہوئے طلاق کے معاملہ میں بھی دونوں کو یکساں حیثیت دے دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طلاق کی شرح بہت بڑھ گئی؛ یہاں تک کہ بہت سے ملکوں میں نکاح کے مقابلہ طلاق کی شرح بڑھی ہوئی ہے، خاندانی نظام بکھر کر رہ گیا ہے، اس وقت مغربی سماج اس درد میں کراہ رہا ہے اور رشتوں کی بنیاد محبت کی بجائے خود غرضی پر قائم ہوگئی ہے۔

اسی طرح انسانی فطرت ہے کہ سخت اور مناسب سزائیں ہی انسان کو جرم سے باز رکھ سکتی ہیں اور مجرم کے ساتھ حسن سلوک دراصل مظلوم کے ساتھ نا انصافی اور سماج کو امن سے محروم کر دینے کے مترادف ہے؛ اسی لئے اسلام میں قتل کی سزا قتل رکھی گئی اور بعض دیگر جرائم میں بھی سخت سزائیں رکھی گئیں ؛ لیکن مختلف ملکوں میں قتل کے مقابلہ قتل کی سزا ختم کر دی گئی اور ہمدردی و انسانیت کے نام پر مجرم کو سہولتیں دی گئیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرائم پر جسارت بڑھتی جارہی ہے اور جو سزائیں دی جاتی ہیں، وہ جرم کے سد باب کے لئے قطعاً نا کافی ثابت ہو رہی ہیں ؛ اسی لئے بعض ملکوں میں تو قتل کی سزا منسوخ کرنے کے بعد دوبارہ ان کے اجراء کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

شریعتِ اسلامی کے جس حکم کو بھی حقیقت پسندی کے ساتھ دیکھا جائے ، محسوس ہوگا کہ اس میں قانونِ فطرت کی مطابقت غیر معمولی حد تک پائی جاتی ہے، برخلاف انسان کے خود ساختہ قوانین کے، کہ اس میں فطرت سے بغاوت اور عقل و مصلحت کے تقاضوں پر خواہشات کے غلبہ کا رجحان ہر جگہ نمایاں ہے۔

۵- ثبات وتغیر — دوش بدوش

کسی بھی قانون کے مفید اور فعال رہنے کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ اس میں حالات اور مواقع کے لحاظ سے تغیرات کو قبول کرنے کی گنجائش رہے، وہیں ایک گونہ ثبات و دوام اور بقاء و استمرار بھی ضروری ہے، جو قانون بالکل بے لچک اور تغیر نا آشنا ہو، وہ زمانہ کی تبدیلیوں کا ساتھ نہیں دے سکتا اور جس قانون میں کوئی بقاء و استحکام ہی نہ ہو، وہ انصاف قائم کرنے اور لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا ؛ کیوں کہ اس کے ہر اُصول میں شکست و ریخت کی گنجائش ہوگی اور لوگ اس کو اپنی خواہشات کے سانچہ میں ڈھال لیں گے۔

شریعتِ اسلامی میں ان دونوں پہلوؤں کی رعایت ملحوظ ہے، کچھ احکام وہ ہیں، جن کی بابت اُصول و قواعد اور شریعت کے مقاصد کی وضاحت پر اکتفاء کیا گیا ہے، ہر عہد میں جو مسائل پیدا ہوں، ان کو ان اُصولوں کی روشنی میں حل کیا جائے گا ؛ کیوں کہ شریعت کا اصل مقصد عدل کو قائم کرنا اور ظلم کو دفع کرنا ہے، اگر ایک ہی حکم کسی زمانہ میں عدل کو قائم رکھنے کا سبب ہو اور دوسرے عہد میں ظلم و نا انصافی کا باعث بن جائے ، تو دونوں حالات میں حکم ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔

شریعت نے بعض مسائل میں جزوی تفصیلات کو بغیر کسی استثناء اور تخصیص کے متعین کر دیا ہے، یہ تعیین وتحدید اس بات کی علامت ہے کہ یہ قیامت تک قابل عمل ہے، اسی طرح شریعت میں جو اُصولی ہدایات دی گئی ہیں اور جن قواعد اور مقاصد کی رہنمائی کی گئی ہے، وہ نا قابل تبدیل ہیں، اسی لئے قرآن مجید نے کہا ہے کہ قرآنی ہدایات کے ذریعہ دین پایۂ کمال کو پہنچ چکا ہے، **اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ**، (**المائدۃ:** ۳) اور محمد رسول اللہ ﷺ پر سلسلۂ نبوت کو ختم کر دیا گیا ہے، (**الاحزاب:** ۴۰) لہٰذا اب خالق کائنات کی طرف سے کسی نئی شریعت کے آنے کا امکان باقی نہیں رہا۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے، لباس کی مقدار میں اضافہ ہوتا جاتا ہے؛ لیکن جب انسان جوانی کی عمر کو پہنچ جاتا ہے، تو اس وقت جو لباس اس کے لئے موزوں ہوتا ہے، وہ ہمیشہ اس کے لئے کافی ہوتا ہے اور اس کی موزونیت باقی رہتی ہے، اسی طرح انسانی تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حسبِ حال احکام آتے رہے، یہاں تک کہ جب انسانی شعور اور اس کا تمدن اپنے اوجِ کمال کو پہنچ گیا تو اسے شریعت محمدی سے نوازا گیا، اب یہ انسانی سماج کے لئے ایسا موزوں قانون ہے کہ قیامت تک اس کی موزونیت اور اس کی افادیت کم نہیں ہوسکتی۔

مگر —— جیسا کہ مذکور ہوا —— اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلامی قانون میں کوئی لچک نہیں ہے؛ بلکہ شریعت کے وہ قوانین جو قیاس واجتہاد یا مصلحت پر مبنی ہوں، براہ راست قرآن مجید اور معتبر احادیث سے ماخوذ نہ ہوں یا جن پر فقہاء مجتہدین کا اتفاق نہ ہو، ہر عہد میں ان کی تطبیق اس زمانے کے مطابق ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی؛ بلکہ خود قرآن وحدیث میں بھی ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، جن کی مختلف ادوار میں، ان ادوار کے وسائل اور احوال کے لحاظ سے تعبیر کی جاسکے، جیسے قرآن مجید میں گواہوں کے ''عادل'' ہونے کی شرط لگائی گئی ہے (طلاق: ۲)؛ لیکن ''عادل'' کا مصداق متعین نہیں کیا گیا ہے؛ تاکہ ہر زمانہ میں اس زمانہ کے اخلاقی معیار کے مطابق اس کا مصداق متعین کیا جائے، اسی طرح حدیث میں کسی چیز پر قبضہ سے پہلے خرید وفروخت سے منع کیا گیا (بخاری، عن علی بن عبداللہ، حدیث: ۲۱۳۵)؛ لیکن اس کا قطعی مفہوم متعین نہیں کیا گیا؛ تاکہ ہر زمانہ میں قبضہ کی جو نئی شکلیں پیدا ہوں، وہ اس حکم کے دائرہ میں آسکیں۔

۶- قانون کی تنفیذ

کسی بھی قانون کا نفاذ دو طریقوں پر ہوتا ہے، سماج کے اندر قبول وطاعت کا جذبہ پیدا

کر کے اور قانون کے خلاف طاقت کا استعمال۔

کچھ طبیعتیں سلامتی اور شرافت کی حامل ہوتی ہیں، ان میں از خود قانون پر عمل کرنے کا جذبہ موجود ہوتا ہے؛ لیکن جن طبیعتوں میں سرکشی اور بغاوت ہوتی ہے، یا جو خواہشات سے مغلوب ہوتی ہیں، وہ جبر وخوف کے بغیر یا قانون کو قبول کرنے کی شکل میں اس سے خوب تر کی اُمید کے بغیر سرِ تسلیم خم نہیں کرتیں، انسانی قوانین میں عدالت، پولیس اور ان دونوں شعبوں کے ذریعہ سزاؤں کا خوف ہی انسان کو جرم سے باز رکھتا ہے، لیکن شریعتِ اسلامی میں اس سے آگے ایک اور عقیدہ ''آخرت کے عذاب وثواب'' کا ہے، اسی لئے قرآن وحدیث میں ہر حکم کے ساتھ، اس کے ماننے پر آخرت کا اجر اور اس کے نہ ماننے پر آخرت کی پکڑ کا ذکر موجود ہے، یہ ایسا انقلاب انگیز عقیدہ ہے، جو طاقتور سے طاقتور انسان کے دل کو ہلا کر رکھ دیتا ہے اور بڑے بڑے مجرموں کو قانون کے سامنے سپر انداز ہونے پر مجبور کرتا ہے، جب کوئی آنکھ دیکھنے والی اور کوئی زبان ٹوکنے والی نہیں ہوتی، اس وقت بھی یہ عقیدہ اس کے ہاتھوں کے لئے ہتھکڑی اور اس کے پاؤں کے لئے زنجیر بن جاتا ہے۔

مسلم سماج میں اِس گئے گذرے دور میں بھی اس کی مثالیں بہ آسانی دیکھی جاسکتی ہیں، مثلاً یہی منشیات کا مسئلہ ہے، آج پوری دُنیا اس مسئلہ سے دو چار ہے اور اس کے نقصانات بحث سے ماوراء ہیں، امریکہ نے ان حالات کو دیکھتے ہوئے ۱۹۳۰ء میں نشہ بندی کا ایک قانون بنایا اور شراب کی مضرتوں کو واضح کرنے کے لئے صرف تشہیر پر ۶۵ ملین ڈالر خرچ کئے، ۹ ہزار ملین صفحات شراب کے نقصانات پر لکھے گئے، ۲۰۰ آدمی قتل کئے گئے، ۵ لاکھ کو قید کی سزا دی گئی، جو جرمانے کئے گئے، اس کی مقدار بے شمار ہے؛ لیکن اس کے باوجود قانون کی طاقت سے قانون کو منوایا نہیں جاسکا اور ۱۹۳۳ء میں امریکی حکومت اس بات پر مجبور ہوئی کہ اس قانون کو واپس لے لے۔

قرآن مجید نے جب شراب کو حرام قرار دیا، تو عرب اس کے بے حد عادی تھے، یہاں تک کہ اسلام سے پہلے ان کی مذہبی تقریبات بھی شراب سے خالی نہیں ہوتی تھیں؛ لیکن شراب کی حرمت کا حکم آتے ہی لوگوں نے اپنا سر جھکا دیا اور مدینہ کی گلیوں، کوچوں میں شراب بہنے لگی، آج بھی صورتِ حال یہ ہے کہ جہالت وغفلت کے باوجود مسلمان سماج میں شراب سے جو احتیاط برتی جاتی ہے، شاید ہی اس کی مثال مل سکے، مغربی ممالک میں خاص طور پر اس کو محسوس کیا جاسکتا ہے کہ دوش بدوش زندگی گذارنے والے مسلمان اور غیر مسلم مئے نوشی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت مختلف کردار

کے حامل ہوتے ہیں۔

اسی طرح زنا اور غیر قانونی جنسی تعلق کا معاملہ ہے، کہ آج بھی اس معاملہ میں مسلم سماج دوسری قوموں سے بدرجہا غنیمت ہے، یہی وجہ ہے کہ ایڈس کی بیماری کی شرح مسلم ملکوں میں سب سے کم ہے، یہاں تک کہ وہ مسلمان ملک جنھیں سیکولرزم کے نام پر ''اغواء'' کرلیا گیا ہے، وہ بھی ایسی برائیوں میں مغربی اور مغرب زدہ ممالک سے بہتر حالت میں ہیں، — مغربی ملکوں میں شہر شہر بوڑھے لوگوں کے لئے ہاسٹل قائم کردیئے گئے ہیں، لوگ بوڑھے ماں باپ اور بزرگانِ خاندان کو ان ہاسٹلوں میں رکھ کر اپنا بوجھ ہلکا کرلیتے ہیں، لیکن مسلم سماج میں آج بھی ایسی خودغرضی نسبتاً کم پائی جاتی ہے، والدین کا احترام اور بزرگوں کی قدردانی کو لوگ اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں، یہ آخرت کے خوف اور آخرت میں جوابدہی کے احساس کے بغیر نہیں ہوسکتا، پس وضعی قوانین کا نفاذ قانون کی طاقت ہی سے ممکن ہے؛ لیکن قانون شریعت کے نفاذ میں عقیدہ وایمان کی طاقت بھی مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔

اجتہاد

حضرات گرامی! اسلامی قانون کا تعارف اس وقت تک نامکمل ہوگا جب تک مسئلہ اجتہاد کے بارے میں کچھ عرض نہ کیا جائے، اجتہاد کے سلسلہ میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ اسلامی قانون کے بنیادی مصادر چار ہیں: کتاب اللہ، سنتِ رسول، اجماع یعنی اُمت کا کسی مسئلہ پر اتفاق، قیاس یعنی جس صورتِ حال کا حکم قرآن وحدیث میں صراحتاً ذکر نہ کیا گیا ہو اس میں قرآن وحدیث کے مماثل حکم جاری کرنا، اس کے علاوہ بعض ضمنی مآخذ بھی ہیں جن کا تعلق ضرورت ومصلحت اور عرف ورواج وغیرہ سے ہے، ان مآخذ سے شرعی احکام مستنبط کرنے اور جو نئے واقعات پیش آئیں، ان کو اس پر منطبق کرنے کو اجتہاد کہتے ہیں، پیغمبر اسلام ﷺ نے نہ صرف 'اجتہاد' کو درست قرار دیا؛ بلکہ اس کو اجر وثواب کا باعث بھی بتایا، اس لئے اجتہاد کا مسئلہ اسلامی قانون سے حد درجہ مربوط ہے۔

یہ بات عرصہ سے زیر بحث ہے کہ اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے یا بند ہوچکا؟ — اس پر اہل علم کے درمیان کافی بحثیں بھی کی جاتی ہیں، اس سلسلہ میں ایک بات تو واضح ہے کہ جس دروازہ کو رسول اللہ ﷺ نے کھولا ہے اسے کوئی کیسے بند کرسکتا ہے، اُمت کے بڑے سے بڑے عالم کو بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ قرآن وحدیث میں جس بات کو جائز قرار دیا گیا ہے وہ اس سے منع کردے؛ البتہ دو باتیں قابل غور ہیں، اول یہ کہ کس حد تک اجتہاد کی ضرورت ہے؟ دوسرے یہ کہ کونسے مسائل اجتہاد کا محل ہیں؟

مجتہد بنیادی طور پر تین کام کرتا ہے :

(الف) جس ذرائع سے کوئی حکم ہم تک پہنچا ہے، اس کے معتبر و نامعتبر اور مقبول و نامقبول ہونے کی تحقیق، جیسے وہ احادیث جو متواتر نہیں ہیں، یا صحابہ کے اقوال وغیرہ کے بارے میں اس بات کو جاننا کہ جن شخصیتوں کی طرف ان اقوال و افعال کی نسبت کی گئی ہے، وہ نسبت مستند و معتبر بھی ہے یا نہیں؟

(ب) شریعت میں قرآن و حدیث میں بعض احکام وہ ہیں جن کے اسباب و علل اور مقاصد کو بھی واضح کر دیا گیا ہے اور بہت سے احکام وہ ہیں جن میں ان کی وضاحت نہیں کی گئی ہے، غور وفکر کر کے مجتہدین ان کی علتوں کو دریافت کرتے ہیں۔

(ج) تیسرا کام یہ ہے کہ جن صورتوں کے بارے میں کتاب وسنت میں صراحت نہیں کی گئی ہے اور اس دور میں وہ پیش آتی ہیں، دریافت شدہ اسباب و علل کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان پر اس کو منطبق کیا جائے۔

ان میں سے پہلے دو کام وہ ہیں جو صدیوں کی محنتوں کے نتیجے میں پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے ہیں، ائمۂ مجتہدین نے روایت اور درایت اور داخلی اور خارجی شہادتوں کے ذریعہ نصوص کو پرکھنے کا کام اس ذہانت ومحنت کے ساتھ انجام دیا ہے کہ تاریخ علم میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، اب از سرنو اس کام کو کرنا بنی بنائی مستحکم عمارت کو ڈھا کر دوبارہ تعمیر کرنے کے مترادف ہے، جو یقینا ایک عبث کام ہوگا، ہر علم میں تدریج اور ارتقاء کا ایک فطری دور ہوتا ہے اور جب وہ ارتقاء کی ایک منزل تک پہنچ جاتا ہے تو اب اس میں مزید ترقی کی گنجائش نہیں رہتی، یہ دونوں کام اپنی اس منزل کو پہنچ چکے ہیں۔

تیسرا کام وہ ہے جس کی ضرورت قیامت تک باقی رہے گی، اسی کو فقہاء احناف نے ''تخریج مسائل'' اور علامہ شاطبی نے ''تحقیق مناط'' سے تعبیر کیا ہے، ہر دور میں علماء اس کام کو کرتے رہے ہیں اور موجودہ دور میں تیز رفتار تبدیلیوں اور سائنسی ترقیوں کی وجہ سے اس کی ضرورت بڑھ گئی ہے، اس لئے 'اجتہاد مطلق' جو مذکورہ تینوں کاموں سے مرکب ہے، کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی؛ بلکہ اس میں ڈھیر سارے مفاسد کا اندیشہ ہے اور جزوی اجتہاد اپنے عہد کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک ضرورت ہے اور کسی صاحبِ نظر عالم نے اس کا انکار نہیں کیا ہے اور نہ اس سے انکار نہیں کیا ہے۔

دوسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ کونسے مسائل اجتہاد کا محل ہیں؟ —— اس سلسلہ میں اُصولی بات

یہ ہے کہ جو مسائل یقینی ذریعہ یعنی قرآن مجید اور حدیثِ متواتر سے ثابت ہوں اور اپنے معنی و مفہوم پر بھی اس کی دلالت واضح ہو، اس میں کسی اور معنی کا احتمال نہ ہو یا جن مسائل پر اُمت کا اجماع و اتفاق ہو ان میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں، جو احکام قیاس و مصلحت پر مبنی ہوں، ایسے دلیلوں سے ثابت ہوں جن کا معتبر ہونا متفق علیہ نہ ہو، ایسے الفاظ میں ان احکام کا ذکر کیا گیا ہو جن میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال ہو یا جن اُمور کے بارے میں معتبر فقہاء کے درمیان اختلافِ رائے پایا جاتا ہو وہی اصل میں اجتہاد کا محل ہیں، بدقسمتی سے ہمارے دور میں ایک طبقہ ایسے مسائل میں اجتہاد چاہتا ہے جو محل اجتہاد ہیں ہی نہیں اور جو مسائل اجتہاد کا محل ہیں اور ان میں اجتہاد کی ضرورت ہے ان میں اجتہاد کا عمل جاری ہے، خاص کر فقہ اکیڈمیاں جو عالم اسلام اور بعض غیر مسلم ممالک جیسے: ہندوستان اور یورپ وغیرہ میں خدمت انجام دے رہی ہیں وہ اجتہاد کی ضرورت کو اجتماعی کوششوں کے ذریعہ پوری کررہی ہیں، ہندوستان میں بھی خاص کر مسلمان خواتین کے مسائل کو حل کرنے کے لئے علماء ایسی کوششیں کرتے رہے ہیں، اس سلسلہ میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ''**الحیلة الناجزة**'' کے علاوہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے آٹھویں سیمینار منعقدہ: ۷-۸ر جولائی ۲۰۰۷ء علی گڑھ کا ذکر کیا جاسکتا ہے، جس میں کئی فیصلوں کے بہ شمول دو اہم فیصلے کئے گئے، ایک ''اشتراط فی النکاح'' کا، یعنی اگر نکاح کے وقت عورت کوئی ایسی شرط لگائے جو شریعت کے خلاف نہ ہو تو وہ معتبر ہوگی، دوسرے مشروط مہر کا یعنی نکاح کے وقت اگر دو مختلف حالتوں کے ساتھ دو مہر مقرر کئے جائیں تو اس کا اعتبار ہوگا، اس لئے حقیقت یہ ہے کہ ضرورت کی حد تک اجتہاد کا عمل ہمیشہ سے جاری رہا ہے اور جاری رہے گا، یہ شریعت اسلامی کی ابدیت اور محمد رسول اللہ ﷺ پر ختم نبوت کا لازمی تقاضہ ہے۔

حضرات ! قانون شریعت کی ضرورت و مصلحت اور فطرت انسانی سے ہم آہنگ کا نتیجہ ہے کہ پوری دنیا میں اور خود ہمارے ملک میں بھی اسلامی قانون سے استفادہ کیا جاتا رہا ہے، جیسے قانونِ طلاق ہے؛ چوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک اخلاقی ہدایت انجیل متی میں موجود ہے کہ ''جس کو خدا جوڑے، اس کو کوئی نہ توڑے'' اس لئے عیسائی دنیا میں نکاح ایسا بندھن سمجھا جاتا تھا، جس کو کھولا نہیں جاسکتا، اسی لئے مغربی دنیا میں طلاق کا تصور نہیں تھا اور نہ ہمارے ہندو بھائیوں کے یہاں تھا؛ لیکن آج پوری دنیا میں طلاق کو ایک سماجی ضرورت تسلیم کیا گیا ہے، —— عورتوں کو نہ یورپ میں میراث کا حق تھا اور نہ ہندوستان میں یورپ میں انیسویں صدی کے اختتام تک بھی عورتوں کو حق

میراث حاصل نہ ہوتا تھا؛ لیکن آج مغرب سے مشرق تک خواتین کو حق میراث دیا گیا ہے، ہمارے ملک میں بیوہ عورتوں کو دوسرے نکاح کی اجازت نہیں تھی ؛ لیکن موجودہ ہندو قانون میں اجازت دی گئی ،غرض کہ زندگی کے مختلف شعبوں کا جائزہ لیا جائے تو آج کی دنیا کے بہت سے قوانین وہ ہیں، جو شریعت اسلامی سے مستفاد ہیں، مجھے یاد آتا ہے کہ جسٹس کرشنا ایرَ نے اپنے ایک خطاب میں کہا تھا کہ اگر ہندوستان میں یکساں سیول کوڈ نافذ ہوا تو یقینا وہ زیادہ تر مسلم پرسنل لا سے ماخوذ ہوگا، اورسابق وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی نے اپنے وزارت عظمیٰ کے دور میں کہا تھا کہ مجھے اسلامی شریعت کی یہ بات بہت اچھی لگتی ہے کہ اس میں عورت کو خود اپنا نکاح کرنے کا حق دیا گیا ہے اور کسی لڑکی کی رضامندی کے بغیر اس کا نکاح نہیں ہوسکتا۔

اس لئے یہ خوش فہمی اور مذہبی خوش اعتقادی نہیں ہے ؛ بلکہ روشن حقیقت ہے کہ اسلامی قانون میں ہر عہد کی ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کرنے اور انسانی زندگی کے مصالح کو روبہ عمل لانے کی پوری صلاحیت ہے اور مشرق ومغرب کا کوئی قانون نہیں، جس نے اس چشمۂ فیض سے کسبِ فیض نہ کیا ہو اور کیوں نہ ہو کہ یہ مخلوق کا نہیں ؛ بلکہ خالق کا بھیجا ہوا قانون ہے، جس سے بڑھ کر کوئی ذات انسانی ضرورتوں اور مصلحتوں سے باخبر نہیں ہوسکتی۔

محترمانِ ما! اسلامک فقہ اکیڈمی جہاں عصر حاضر میں پیدا ہونے والے مسائل کو اجتماعی طور پر حل کرنے کے لئے بین الاقوامی سیمینار منعقد کرتی ہے —— اور اس سلسلہ کا سیمینار خود اس یونیورسٹی میں فاضل گرامی پروفیسر مولانا سعود عالم قاسمی (شعبۂ دینیات) کی دعوت پر منعقد ہو چکا ہے، جس میں بہت سے اہم سماجی اور طبی مباحث طے ہوئے تھے، اس موقع پر یونیورسٹی کی طرف سے شایانِ شان ضیافت کی حلاوت ابھی بھی ہم لوگ فراموش نہیں کر پائے ہیں، —— وہیں فکری اور تربیتی سیمینار، سمپوزیم اور ورکشاپ بھی منعقد کئے جاتے ہیں اور اب تک اس نوعیت کے ۲۵ پروگرام منعقد ہو چکے ہیں، یہ پروگرام بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جس کا مقصد اسلامی قانون کی اہمیت ،عصر حاضر میں اسلامی قانون سے متعلق خدمات ،بعض پہلوؤں سے ہندوستان کے دستور اور قوانین کا تجزیہ، اسلامی قوانین کی معنویت و نافعیت ، ہندوستان میں اس کی تنفیذ کی ممکنہ کوشش اور قانون کی تعلیم کے سلسلہ میں غور وفکر اور مسلمان طلبہ کو اس کی طرف توجہ دہانی وغیرہ جیسے موضوعات کو زیر بحث لایا جارہا ہے، اس سے ایک طرف ہمیں خود احتسابی کا موقع ملے گا ، دوسری طرف اسلامی قانون سے متعلق غلط

فہمیوں کو دور کرنے میں مدد ملے گی، اور تیسری طرف ہم اپنے نوجوان طلبہ کو توجہ دلاسکیں گے کہ وہ شعبۂ قانون کی طرف آئیں اور اس میں محنت کریں؛ تاکہ ملک کی اعلیٰ عدالتوں میں مسلمان قانون دانوں کا جو خلا پایا جاتا ہے، اسے دور کیا جاسکے؛ کیوں کہ ہم سے اس سلسلہ میں جو بے توجہی ہوئی ہے اور جس کا ہم شدید نقصان اُٹھارہے ہیں، اس کی کچھ نہ کچھ تلافی ہوسکے۔

حضرات ! یہ حقیر، اکیڈمی اور اس کے ذمہ داروں کی طرف سے آپ سبھی حضرات کا بے حد شکر گزار ہے کہ انھوں نے اس اہم پروگرام کی میزبانی کی اور ان کے اشتراک وتعاون سے یہ پروگرام منعقد ہورہا ہے، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پروگرام کو کامیاب بنائے، اسے مفید اور نتیجہ خیز فرمائے اور یہ اس کی رضاء وخوشنودی اور اس کے دین کی تائید وتقویت کا ذریعہ ثابت ہو۔

وباللہ التوفیق وھو المستعان۔

● ● ●

خاندانی نظام — اسلامی نقطۂ نظر ☆

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على رسوله الكريم ، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ۔

صدر عالی قدر، بزرگان محترم، بھائیو اور بہنو! اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے، اسے بہترین تخلیقی ڈھانچہ سے نوازا ہے: ''**لَقَدْ خَلَقْنَا الإِنسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ**'' (التین: ۴) اس انسانیت کو شرافت وکرامت سے نوازا ہے: ''**وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ**'' (بنی اسرائیل: ۷۰) اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی توقیر وتکریم کا اوج کمال یہ ہے کہ اسے فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا اور شیطان کو صرف اسی لئے عالم بالا سے اتار پھینکا گیا کہ اس نے انسان کو حقیر سمجھ کر سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور اللہ کے حکم سے سرتابی کی راہ اختیار کی، (البقرۃ: ۳۴، الأعراف: ۱۱، بنی اسرائیل: ۶۱، الکہف: ۵۰، طٰہٰ: ۱۱۶) اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان پر یہ احسان بھی کیا ہے کہ اس کو قوت تسخیر سے نوازا گیا ہے، وہ سمندر کی تہوں کو ٹٹول رہا ہے، وہ حد نظر سے دور سیاروں پر اپنی کمندیں پھینک رہا ہے، وہ ہوا کے دوش اور سمندر کی متلاطم موجوں کی پشت پر سوار ہو کر ہزاروں میل کا سفر طے کرتا ہے، ہر صبح جب طلوع ہوتی ہے تو کائنات کی چھپی ہوئی حقیقتوں کے انکشافات اور نئے نئے آلات کے اختراع میں انسان کی فتح مندی کا مژدہ سناتی ہے؛ لیکن جہاں اس کی عقل ودانش کی سحر طرازیوں کے آگے کائنات دم بخود ہے، وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ جسمانی اعتبار سے بے حد کمزور، نحیف اور محتاج وضرورت مند ہے، دنیا میں جتنے جاندار ہیں، وہ بمقابلہ انسانی نومولود کے جلد اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے ہیں، بعض جانور چند گھنٹوں میں چلنے پھرنے لگتے ہیں اور اپنی غذائی ضرورت خود پوری کر لیتے ہیں، بعض چند دنوں میں اور بعض چند مہینوں میں؛ لیکن انسان کو صرف آنکھ کھولنے میں کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں، مہینوں میں وہ بولنا شروع کرتا ہے اور سالوں میں چلنا پھرنا، بلوغ وشباب کی منزل کو پہنچنے میں اسے

☆ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے معہد کے اشتراک سے اس موضوع پر ایک سیمینار منعقد کیا تھا، یہ اسی سیمینار کا کلیدی خطبہ ہے۔

پندرہ سولہ سال لگ جاتے ہیں، پھر شعور کی پختگی، جذبات میں اعتدال، فکر میں گہرائی وغیرہ کے لئے بھی سالہا سال مطلوب ہوتے ہیں؛ اس لئے وہ طویل عرصہ تک اپنے والدین کا، بزرگوں اور دوستوں کا، اساتذہ اور مربیوں کا بہتر مشورہ دینے والے اور بہی خواہی کا جذبہ رکھنے والے رہنماؤں کا محتاج ہوتا ہے۔

اسی لئے انسان کو سب سے زیادہ خاندان کی ضرورت پڑتی ہے، اگر ماں باپ کا سایہ اس کے سر سے اُٹھ جائے تو وہ ایک خزاں رسیدہ درخت کی طرح اپنے آپ کو بے سایہ اور بے سہارا محسوس کرتا ہے، اگر وہ بھائی بہن سے محروم ہے تب بھی اسے اپنی تنہائی کا احساس ہوتا ہے، اگر کچھ اور بزرگ رشتہ دار —— دادا، دادی اور نانا، نانی —— نہ ہوں تو وہ غیر معمولی خلا محسوس کرتا ہے، اگر چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ سے محروم ہو تو اسے لگتا ہے کہ جیسے اس کے اِردگرد اپنے خاندان کا حفاظتی حصار موجود نہیں ہے، پھر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد جب تک شریک حیات کا ساتھ حاصل نہ ہو جائے، اس کی زندگی بے سکون اور نا آسودہ ہوتی ہے، اب آگے خود اس کے گھر میں پھول کھلتے ہیں اور وہ صاحب اولاد ہوتا ہے تو اس سے غیر معمولی نفسیاتی مسرت اسے حاصل ہوتی ہے اور بیٹوں اور بیٹیوں کے بغیر اسے اپنی تگ و دو اور جد و جہد بے معنی اور بے مقصد نظر آتی ہے، پھر سسرالی خاندان کے ذریعہ وہ اپنے آپ میں مزید توانائی محسوس کرتا ہے، غرض کہ انسان کی فطرت چاہتی ہے کہ وہ ایک خاندان کا حصہ بن کر رہے۔

خاندان کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اس کے لئے حفاظتی حصار ہوتا ہے، اگر کوئی شخص اس پر زیادتی کرے تو انسان یہ سمجھ کر اپنا دفاع کرتا ہے کہ اس کی پشت پر اس کا پورا خاندان ہے اور خود زیادتی کرنے والے کو بھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمیں تنہا ایک شخص کا نہیں؛ بلکہ پورے خاندان کا مقابلہ کرنا ہوگا؛ اسی لئے شریعت نے قتل کی دیت (خون بہا) قاتل کے قریب ترین رشتہ داروں کے ذمہ رکھی ہے، جس کو ''عاقلہ'' کہا جاتا ہے؛ تا کہ ایک طرف قاتل پر عائد ہونے والی اس بڑی مالی سزا کو رشتہ داروں پر تقسیم کر دیا جائے اور وہ اس کے لئے قابل برداشت ہو سکے، دوسری طرف جو اعزہ واقارب ہیں، وہ بھی محسوس کریں کہ اپنے خاندان کے ایک فرد کو جرم سے باز رکھنے کے لئے ہم بھی ذمہ دار ہیں، ورنہ جرمانہ میں ہمیں بھی شریک ہونا پڑے گا، اسلام سے پہلے عربوں میں یہ خاندانی نظام ہی تھا، جس کے ذریعہ لوگوں کا تحفظ ہوتا تھا، اور آج بھی قبائلی علاقوں میں یہی نظام لوگوں کی جان و مال کا محافظ ہے۔

خاندان کا دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے کمزوروں، غریبوں، معذوروں، بوڑھوں، یتیموں، بیواؤں اور خواتین کی کفالت کا سامان ہوتا ہے؛ کیوں کہ ہر شخص اپنے خاندان کے مجبور و نادار لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے، والدین پر اولاد کی اور اولاد پر والدین کی، شوہر و بیوی، بھائیوں، بہنوں کی ایک دوسرے پر، اسی طرح خاندان کے نادار اور بے سہارا لوگوں کی خاندان کے مرفہ الحال لوگوں کو ذمہ داری سونپی جاتی ہے، اسلام میں نفقہ، کفالت اور میراث کے پورے قانون کی اساس یہی ہے کہ انسان پر صرف اسی کی ذمہ داری نہیں ہے؛ بلکہ وہ خاندان کا ایک حصہ ہے، وہ ایک کل کا جزو اور ایک عمارت کی اینٹ ہے، اس کے لئے درست نہیں ہے کہ وہ دوسروں سے بالکل بے تعلق ہو جائے۔

خاندان کا تیسرا اہم مقصد خوشی اور مسرت کو دوبالا کرنا اور مصائب و آلام کو تقسیم کرنا اور ہلکا کرنا ہے، کتنی بھی خوشی کی بات ہو جائے، اگر اس خوشی میں ماں باپ کی شرکت نہ ہو تو یہ خوشی ادھوری، ناتمام اور بے کیف معلوم ہوتی ہے، اسی طرح اگر انسان پر کوئی مصیبت آئے، اس کے درد پر آنسو بہانے والی کوئی آنکھ نہ ہو، اس کے غم کو بانٹنے والا کوئی دل نہ ہو اور اس کی تسلی و دلداری کرنے والی کوئی زبان نہ ہو تو رائی برابر مصیبت پہاڑ کی طرح معلوم ہوتی ہے، یہ انسانی فطرت ہے اور انسان کی نفسیات کا لازمی حصہ ہے، خاندان کی شرکت خوشی کو دوبالا اور غم کے احساس کو ہلکا کرتی ہے۔

اسی لئے قرآن مجید نے خاندان کے وجود کو اللہ تعالیٰ کے احسان میں شمار کیا ہے، بنیادی طور پر انسان تین خاندانوں کے درمیان ہوتا ہے، ددیہال، نانیہال اور سسرال، ددیہال اور نانیہال ماں باپ کی طرف سے اور سسرال شوہر و بیوی کی طرف سے، قرآن نے پہلے دونوں خاندان کو ''نسب'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور تیسرے خاندان کو 'صہر'' کے لفظ سے: **''وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَراً فَجَعَلَهُ نَسَباً وَصِهْراً وَكَانَ رَبُّکَ قَدِیْراً''** (الفرقان: ۵۴) اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خاندانی نظام انسانی سماج کے لئے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اس میں انسان کا تحفظ ہے، اس میں اس کی کفالت کا انتظام ہے اور اس میں قلبی اور روحانی سکون کا سامان ہے؛ لیکن اسلام کا قانون میراث اور قانون نفقہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ خاندانی نظام میں اتنا پھیلاؤ بھی نہ ہونا چاہئے کہ انسان کے لئے اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہو جائے اور ہر انسان کے اندر خلوت پسندی اور دوسروں کی مداخلت سے تحفظ کا جو جذبہ رکھا گیا ہے وہ بھی مجروح نہ ہونے پائے؛

کیوں کہ اگر خاندان کی وسعت غیر محدود ہو جائے تو انسان گھر میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو بازار میں محسوس کرتا ہے اور مزاج کا اختلاف دوریاں پیدا کرنے کا اور ایک دوسرے سے اکتاہٹ کا سبب بن جاتا ہے؛ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں خاندانی نظام کی بڑی اہمیت ہے؛ لیکن اس کے دائرہ کو اس حد تک محدود کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان بے سکونی محسوس نہ کرے۔

خاندانی نظام کی بنیاد شریعت اسلامی میں عدل واحسان پر ہے، عدل یہ ہے کہ جو آپ کے کام آتا ہے اور جتنا کام آتا ہے، آپ بھی اس کے کام آئیں اور اسی قدر آئیں؛ اسی لئے شریعت نے نفقہ کی ذمہ داری، حصہٗ میراث کے تناسب سے رکھی ہے، اعزہ واقارب کا نفقہ ان رشتہ داروں پر واجب ہوتا ہے، جو امکانی طور پر اس کے وارث ہونے کے اہل ہیں اور اتنی ہی مقدار میں واجب ہوگا، جتنا اس کا حق میراث ہوتا ہے —— احسان یہ ہے کہ جو آپ کے کام نہ آئے آپ اس کے کام آئیں، یعنی ایثار اور بے غرضی پر مبنی تعلق، اسی لئے جن لوگوں کا نفقہ کسی شخص پر واجب ہوتا ہے، وہ اس پر قرض نہیں ہوتا؛ بلکہ تبرع ہوتا ہے، یہ سمجھ کر رشتہ داروں کی خدمت کی جاتی ہے کہ ان کے لئے کھونا بھی پانا ہے؛ اس لئے اسلام میں خاندانی نظام کی بنیاد عدل واحسان یا انصاف وایثار پر ہے۔

حضرات ! خاندان کی تشکیل میں خواتین کا کردار بنیادی اہمیت رکھتا ہے، عورت ایک طرف اپنے بچوں کو سمیٹ کر رکھتی ہے اور دوسری طرف اپنے رشتہ داروں اور اپنے شوہر کے رشتہ داروں سے اپنی اولاد کو جوڑتی ہے، ماں کی ممتا اور بیوی کی محبت کا حق اسی وقت ادا ہوسکتا تھا، جب کہ وہ لطافت کا پیکر اور سراپا لطف ومحبت ہو، لطافت کے لئے جسمانی نزاکت بھی ضروری ہے اور لطف ومحبت کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اندر جذبات کا عنصر زیادہ ہو اور اس کا دل دردومحبت سے معمور ہو، اس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک غیر معمولی خوبی ہے؛ لیکن دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس سے انسان کی قوت فیصلہ متأثر ہوتی ہے اور اس میں ذکاوت حس پیدا ہو جاتی ہے؛ اس لئے اسلام میں خواتین کے حقوق پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے کہ مرد اس کی جسمانی کمزوری کا فائدہ نہ اُٹھائے اور اس کے جذبات محبت کا استحصال نہ کرے، رسول اللہ ﷺ نے اسی لئے عورتوں اور غلاموں کے حقوق پر سب سے زیادہ زور دیا ہے، اگر خواتین کو ان کے حقوق نہ دیئے گئے، انھیں برابر کی شریک حیات کا درجہ نہ دیا گیا، انھیں اپنی ضروریات کے لئے گھر سے باہر نکلنے پر مجبور کیا گیا اور فرائض مادری ادا کرنے میں رکاوٹ پیدا کی گئی تو یقینی طور پر خاندانی نظام بکھر کر رہ جائے گا۔

حضرات ! مغرب میں اس وقت یہی صورت حال ہے، مغرب نے مادی مفادات، زیادہ سے زیادہ افرادی وسائل کے حصول اور تجارتی ترقی کے لئے خواتین کو گھر سے باہر نکالا، انھیں تشہیر تجارت کا ذریعہ بنایا اور انھیں اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اس ذمہ داری کو بھی ادا کریں، جو فطری طور پر ایک عورت ہی ادا کرسکتی ہے اور کسبِ معاش کی جدو جہد میں بھی مردوں کے ساتھ شریک ہوں، اپنا بوجھ آپ اُٹھائیں اور اپنی ضرورتیں آپ پوری کریں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میاں بیوی کے تعلق میں جذباتیت اور وفاداری کم ہوگئی، طلاق کے واقعات بڑھ گئے، بغیر نکاح کے زندگی گذارنے کو بہتر سمجھا جانے لگا، بچے والدین کے لئے بوجھ ہوگئے، شرح پیدائش گھٹتی چلی گئی، زنا کی کثرت اور شناخت سے محروم بچوں کی بہتات ہوگئی، پُرسکون ازدواجی زندگی سے محرومی کی وجہ سے سکون حاصل کرنے کے لئے نشہ خواری زندگی کا حصہ بن گئی، والدین اور اولاد میں بھی محبت، وفاداری اور جذبہ خدمت باقی نہیں رہا اور خاندانی نظام پوری طرح بکھر کر رہ گیا، خاندانی نظام کے بکھراؤ سے مغربی سماج کو جو نقصانات پہنچے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں :

● بوڑھے اور ضعیف لوگوں کے لئے زندگی گذارنا دوبھر ہوگیا، اب ان کے لئے دو ہی راستے رہ گئے، یا تو وہ اپنے گھر میں تنہائی اور بے چارگی کی زندگی گذاریں، انھیں ایک گلاس پانی دینے والا اور ایک نوالہ کھلانے والا بھی میسر نہ ہو، یا وہ سن رسیدہ اور معمر لوگوں کے لئے بنائے گئے ہاسٹل میں رہیں اور ان کے بچے سال میں ایک دفعہ آکر انھیں گلدستہ پیش کردیں اور بس، یہ ایسی زندگی ہے جس میں انسان کو موت زندگی سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔

● دوسرا نقصان عورتوں کا ہوا، عورتوں کی صحت میں فطری طور پر جلد انحطاط پیدا ہوتا ہے، ولادت اور فطری عوارض تیزی سے ان کی صحت کو متأثر کردیتے ہیں اور عمر گذرنے کے ساتھ ساتھ نہ صرف ان کی خوبصورتی کو گہن لگنے لگتا ہے؛ بلکہ ان کی قوت فکر اور قوت عمل بھی تیزی سے متأثر ہونے لگتی ہے، اب جس معاشرہ میں عورت صرف مرد کے لئے ہوس کا سامان ہو، اس میں ایک ایسی عورت کی کیا قیمت ہوسکتی ہے، جس کا حسن و جمال ڈھل چکا ہو؛ اسی لئے مغربی سماج میں عورتیں اپنے آپ کو بہت پریشان محسوس کرتی ہیں اور غالباً اسی سبب سے مغربی ممالک میں خواتین بہ مقابلہ مردوں کے زیادہ اسلام قبول کرنے پر مائل ہیں۔

● تیسرے اس سے بچے متأثر ہوتے ہیں، جب زندگی میں ایک دوسرے سے جوڑ نہ ہو،

زندگی کا مقصد صرف عیش وعشرت ہو تو وہاں انسان کے دادِعیش دینے میں جو چیز بھی رکاوٹ بنتی ہو، وہ بوجھ بن جاتی ہے، بچے اس آزادی میں بھی خلل انداز ہوتے ہیں، وہ ماؤں کے لئے ملازمت میں رکاوٹ بنتے ہیں اور شوہر و بیوی کے درمیان تعلقات میں بے وفائی کی وجہ سے یہ اندیشہ بھی دامن گیر ہوتا ہے کہ اگر ہمارے راستے الگ ہوگئے تو ان بچوں کا بوجھ کون اُٹھائے گا؟ اس لئے مغربی سماج اولاد سے راہ فرار اختیار کر رہا ہے اور جو بچے پیدا ہوجاتے ہیں، انھیں دیکھ بھال کے لئے پرورش گاہوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا انھیں ہفتہ میں ایک دو دن ہی مل پاتی ہے، اس طرح بچوں پر غیر معمولی نفسیاتی اثر پڑتا ہے۔

● اس کا ایک بڑا نقصان اپنی شناخت سے محرومی ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں یہ بات رکھی ہے کہ وہ اپنی پہچان کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کے شہر کی، اس کے گھر کی، اس کے کاروبار کی اور اس کی اپنی پہچان ہو، سب سے زیادہ اس کو جو شناخت عزیز ہوتی ہے، وہ فطری شناخت ہے، یعنی ماں باپ اور خاندان سے اس کی نسبت، وہ اس کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھتا ہے، جو لوگ اپنی شناخت سے محروم ہوتے ہیں، انھیں یہ محرومی ستاتی ہے، وہ نفسیاتی مریض ہوجاتے ہیں، یہاں تک کہ مجرمانہ حرکتوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں، خاندانی نظام کے بکھراؤ کی وجہ سے نکاح سے گریز، زنا کی کثرت اور اپنی شناخت سے محروم بچوں کی پیدائش مغربی ملکوں میں ایسے مجرموں کو پیدا کر رہی ہیں۔

● انسان کو جو چیز سب سے زیادہ محبوب ہے، وہ ہے دل کا سکون، یہ سکون یا تو انسان کو تعلق مع اللہ سے ہوتا ہے، یا ایک انسان کو دوسرے انسان سے، بچوں کو اپنے ماں باپ کی گود میں جا کر جو سکون ملتا ہے، اس کی کسی بڑی سے بڑی نعمت سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی، نوجوان اولاد بوڑھے ماں باپ کے سر میں تیل لگائے اور پاؤں دبائے، اس سے والدین کو جو خوشی ہوتی ہے اور قلب و روح کو جو تسکین حاصل ہوتی ہے، وہ سونے چاندی کی پلنگ پر سلانے سے بھی حاصل نہیں ہوسکتی، شوہر و بیوی جیسے ایک دوسرے کے سکون کا ذریعہ ہیں، کوئی چیز اس کا متبادل نہیں بن سکتی، بھائی بہن کو ایک دوسرے کی محبت سے جس خوشی کا احساس ہوتا ہے، وہ کسی اور چیز سے نہیں ہوسکتا، جب خاندان بکھرتا ہے تو رشتوں کے آبگینے ٹوٹ جاتے ہیں، جیسے برقی سے محروم بلب سے روشنی حاصل نہیں کی جاسکتی، اسی طرح ان بے روح رشتوں سے انسان کو سکون کی غذا حاصل نہیں ہو پاتی، یہی وجہ ہے کہ مغرب

اور مغرب زدہ معاشرہ میں بے خوابی، ڈپریشن اور خودکشی کے واقعات تیزی سے بڑھتے جارہے ہیں؛ اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خاندانی نظام کی بقا انسان کے لئے بہت بڑی نعمت اور اس کا بکھر جانا بہت بڑی آزمائش ہے۔

حضرات ! اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا ہندوستان کا ایک مؤقر ادارہ ہے، جس کے بنیادی مقاصد عصر حاضر میں پیدا ہونے والے شرعی مسائل کو علماء اور ارباب افتاء کی اجتماعی رائے سے حل کرنا، اہم علمی موضوعات پر تحقیق اور ریسرچ کا کام کرانا، دینی مدارس اور عصری دانش گاہوں کے نوجوان طلبہ کی فکری تربیت کرنا، علمی اور تحقیقی موضوعات پر لٹریچر مرتب کرنا، نیز دوسری زبانوں سے اُردو میں اور اُردو سے دوسری زبانوں میں اہم علمی وفقہی تحقیقات کو منتقل کرنا وغیرہ ہے؛ چنانچہ اب تک اس کے ۱۹؍ انٹرنیشنل فقہی سیمینار منعقد ہو چکے ہیں جن میں ڈیڑھ سو سے زیادہ جدید پیش آمدہ مسائل پر فیصلے کئے گئے، اکیڈمی کی تحقیقات اور مطبوعات سو سے زیادہ ہو چکی ہیں، جن میں ۴۵ جلدوں میں کویت سے شائع ہونے والی ''الموسوعۃ الفقہیۃ'' (فقہی انسائیکلو پیڈیا) اور تقریباً چالیس جلدوں میں فقہی سیمیناروں کے مقالات کا مجموعہ ہے، جو ''جدید فقہی تحقیقات'' کے نام سے شائع ہو رہا ہے اور اکیڈمی کا ایک اہم ترین مقصد عصر حاضر کے اہم فکری، تعلیمی، سماجی اور اقتصادی مسائل پر امت کی رہنمائی اور خواص اُمت کی فکر سازی بھی ہے، اس مقصد کے لئے سیمینار منعقد کئے جاتے ہیں اور ان میں اصحاب نظر کو اظہار خیال کی دعوت دی جاتی ہے، اس وقت جو سیمینار ہو رہا ہے، یہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اس سیمینار میں خاندانی نظام کے استحکام، مشترک اور جداگانہ خاندانی نظام کی خوبیوں اور خامیوں اور خواتین کے حقوق پر گفتگو ہوگی، خواتین کے حقوق سے مراد صرف بیویوں کے حقوق نہیں ہیں، جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے؛ بلکہ عورتوں کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے ان کے حقوق اس میں شامل ہیں، ماں، بیٹی، بیوی، بہن اور دوسری قریبی خاتون رشتہ دار، مطلقہ و بیوہ اور حقوق سے محروم معلقہ عورتیں، سبھوں کو ہمیں اس بحث کے دائرہ میں لانا چاہئے؛ کیوں کہ جیسے بیوی اور بہو کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے، موجودہ معاشرہ میں اس سے کم زیادتی ماں، ساس اور بہنوں کے ساتھ نہیں ہوتی، ان سب کے ساتھ انصاف ہونا چاہئے۔

حضرات ! گلوبلائزیشن کی بنیاد پر صرف مغرب کے تجارتی سامان ہی کا مشرقی ملکوں

میں ایکسپورٹ نہیں ہورہا ہے؛ بلکہ مغربی افکار، مغربی تہذیب اور مغرب کا طرز زندگی بھی ہمارے سماج کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے، نوجوان لڑکوں اور خاص کر لڑکیوں میں خاندان سے بے تعلق ہوکر ایسی زندگی گذرانے کا مزاج پیدا ہورہا ہے کہ جس میں انھیں نہ اپنے بڑوں کی خدمت کرنی پڑے اور نہ ان کا حکم ماننا پڑے، ماں باپ جن کے قدموں کے نیچے جنت رکھی گئی اور جن کو جنت کا دروازہ کہا گیا، وہ اولاد کے لئے بوجھ بنتے جارہے ہیں، خاندان کے بزرگوں کے تجربات پر مبنی مشغلوں کو دخل در معقولات تصور کیا جارہا ہے، رشتۂ نکاح میں وفاداری کے بندھن کمزور ہوتے جارہے ہیں، اولاد سے فرار کا جذبہ پروان چڑھ رہا ہے، خاندان کے مجبور لوگوں کی کفالت اور ان کی خدمت کی ذمہ داری لوگ اپنے آپ پر محسوس نہیں کرتے، غرض کہ ہمارا خاندانی نظام بھی شکست وریخت کے خطرہ سے دوچار ہے، اسی پس منظر میں آج یہ سیمینار منعقد کیا جارہا ہے۔

اُمید کہ یہ سیمینار ان مسائل کو واضح کرنے، اس سلسلہ میں غور وفکر کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنے اور اس اہم موضوع پر لوگوں کی فکر کو بیدار کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوگا، یہ حقیر اکیڈمی اور المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کی طرف سے تمام مقالہ نگاروں، اظہار خیال کرنے والوں، بحث میں حصہ لینے والے شرکاء، بھائیوں اور بہنوں کا شکر گذار ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح راہ دکھائے اور صحیح نتائج اخذ کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

وباللہ التوفیق وھو المستعان۔

● ● ●

انسانی حقوق اور اسلام ☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين و على آله وأصحابه أجمعين ، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين۔

صدر عالی قدر، دانشوران گرامی اور بزرگانِ محترم! اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے لئے بے حد خوشی ومسرت اور اس کے ساتھ ساتھ شرف وسعادت کی بات ہے کہ وہ برصغیر کی اس تاریخی اور تاریخ ساز دانش گاہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں نہایت اہم اور وقت کے سلگتے ہوئے مسئلہ پر سیمینار منعقد کر رہی ہے، اللہ تعالیٰ اسے اپنے مقصد میں کامیابی سے ہم کنار کرے اور انسانی حقوق کے سلسلہ میں انسانیت کے ضمیر کو بیدار کرنے اور اسلام کی صاف وشفاف تعلیمات کو لوگوں تک پہنچانے کا ذریعہ بنائے۔

حضرات ! خالق کائنات نے اپنی اس دنیا کو بے شمار مخلوقات کا مسکن بنایا ہے، ایک سے ایک طاقتور، خوبصورت اور مختلف صلاحیتوں کے حامل حیوانات اس دنیا میں بستے ہیں، ان کے مفادات میں باہم ٹکراؤ بھی پایا جاتا ہے، ایک محدود جنگل سے سب کو اپنا چارہ حاصل کرنا ہے اور ایک ہی چشمہ سے مختلف جانوروں کو پانی لینا ہے؛ لیکن یہ بات نہیں سنی گئی کہ مفادات کا یہ تصادم ان کے درمیان باہمی جنگ وجدال کا باعث بن گیا ہو، مثلاً ایک علاقہ کے گھوڑوں نے اپنی فوج بنا کر دوسرے علاقہ کے گھوڑوں پر حملہ بول دیا ہو، اس کے نتیجہ میں سینکڑوں گھوڑوں کی جان چلی گئی ہو اور بہت سے زخمی ہو گئے ہوں، ایسا کوئی واقعہ دنیا میں پیش نہیں آیا؛ بلکہ یہ کیفیت دو مختلف جانوروں کے درمیان بھی پیش نہیں آئی، ایسا نہیں ہوا کہ جنگل کے شیروں نے مل کر اپنا ایک لشکر ترتیب دیا ہو اور اجتماعی طور پر ہرنوں پر ٹوٹ پڑے ہوں؛ تاکہ اس جنگل سے ان کا صفایا کر دیا جائے؛ لیکن عجیب بات ہے کہ انسانوں کی بستی میں یہ واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور کم وبیش ہر روز پیش آتے ہیں، انسان دوسرے انسان کو نقصان پہنچانے کے لئے اللہ تعالیٰ کی عطا فرمائی ہوئی فطری طاقت ہی کو کافی نہیں سمجھتا؛ بلکہ اپنے ہم جنسوں کو ہلاک کرنے کے لئے تباہی وبربادی کے نئے نئے ہتھیار بھی بناتا ہے،

☆ 'انسانی حقوق' کے موضوع پر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے دہلی میں ایک سیمینار منعقد کیا تھا، یہ اسی سیمینار کا کلیدی خطبہ ہے۔

دوسرے انسانوں کو نقصان پہنچا کر اور تکلیف دے کر اسے بے حد خوشی ہوتی ہے اور فاتحانہ جذبات سے سرشار ہو کر وہ اپنی طاقت اور غلبہ کا اعلان کرتا رہتا ہے، آج پوری دنیا میں ہلاکت خیز ہتھیاروں کی بہتات، انسان کی بہترین ذہانتوں کا اس تخریبی کام میں خرچ ہونا، قدرت کے انمول وسائل کو اس انسانیت سوزی کی صفت میں صرف کرنا اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ہلاک کر دینے کی ٹکنالوجی کو فروغ دینا اس کی واضح مثال ہے۔

غالباً اسی لئے آج جانوروں کے حقوق، ماحولیات کے تحفظ، نباتات کے بقاء اور زمین وفضا میں موجود قدرت کے اَن دیکھے خزانوں کے تحفظ کی بجائے یا اس سے بڑھ کر انسانی حقوق کی ادائیگی اور انسانیت کے تحفظ پر گفتگو کرنا ایک مجبوری بن گئی ہے؛ تاکہ عقل وشعور کی دولت سے مالا مال، سمندر کی تہوں کو فتح کرنے والی اور فضاؤں میں تیرتے ہوئے سیاروں پر کمندیں ڈالنے والی اس مخلوق کو آداب انسانیت سکھائے جائیں اور انھیں بتایا جائے کہ قدرت کی دی ہوئی بہترین صلاحیتوں کو وہ تخریب کی بجائے تعمیر میں اور ضرر رسانی کی بجائے نفع رسانی میں استعمال کرے۔

اسلام کا تصور یہ ہے کہ انسان اس کائنات کی سب سے اشرف وافضل مخلوق ہے: ''**وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ**'' (الاسراء: ۷۰) خدا نے بہترین تخلیقی ڈھانچہ سے اس کو نوازا ہے: ''**لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ**'' (التین: ۴) تخلیقی ڈھانچہ کی طرح اخلاقی کمالات کے اعتبار سے بھی انسان کو سب سے اونچا بنایا گیا ہے؛ چنانچہ خیر البشر حضرت محمد ﷺ کے بارے میں فرمایا گیا: ''**وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ**'' (القلم: ۴) اسے علم وتحقیق کی نعمت اور اختراع وایجاد کی صلاحیت سے نوازا گیا ہے: ''**عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ**'' (العلق: ۵) پوری کائنات اس کی خدمت کے لئے ہے اور وہ اس کا مخدوم ہے: ''**هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعاً**'' (البقرۃ: ۲۹) اسی لئے کائنات کی تمام چیزیں اس کے لئے مسخر ہیں: ''**سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ**'' (لقمان: ۲۰) وہ اس کائنات میں حاکم کے درجہ پر ہے اور تمام مخلوقات اس کی رعایا کے درجہ میں ہیں، اسی کو قرآن مجید میں 'خلافت' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے: ''**إِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيْفَةً**'' (البقرۃ: ۳۰) اس لئے اس کے حقوق کو خاص اہمیت حاصل ہے؛ چنانچہ قرآن وحدیث میں کائنات کی دوسری موجودات کے حقوق کے بارے میں بہت کم کہا گیا ہے اور اللہ اور اس کے رسول کے بعد سب سے زیادہ کائنات کی جس ہستی کے حقوق ذکر کئے گئے ہیں، یا جن پر زور دیا گیا ہے وہ

بنی نوع انسان ہے، انسان کے عمومی حقوق پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور قرابت وتعلق کے مختلف پہلوؤں سے خاص خاص لوگوں کے حقوق بھی واضح کئے گئے ہیں، نیز اسلام نے انسان کے بنیادی حقوق کو نسلی، جغرافیائی، لسانی اور مذہبی سرحدوں سے بالاتر رکھا ہے۔

حضرات ! حقیقت یہ ہے کہ انسان کی تاریخ جتنی قدیم ہے اس کے حقوق کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے، قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ حقوقِ انسانی کو تلف کرنے کا جو پہلا واقعہ اس روئے ارض پر پیش آیا، وہ یہ تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں 'قابیل' نامی شخص نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا، جس کا نام 'ہابیل' تھا، اس واقعہ کا ذکر بائبل میں بھی آیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس واقعہ کے سلسلہ میں فرمایا کہ جب بھی کوئی شخص قتل کا مرتکب ہوتا ہے تو قاتل کے گناہ میں قابیل کو شریک رکھا جاتا ہے؛ کیوں کہ اس نے گناہ اور ظلم کے ایک طریقہ کی بنیاد رکھی، (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۰۳) اس سے انسانی حقوق کی اہمیت کا اشارہ ملتا ہے کہ اسلام کی نظر میں ایک انسان کی حق تلفی دراصل پوری انسانیت کے ساتھ حق تلفی ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے ایک شخص کو قتل کیا اس نے گویا پوری انسانیت کو قتل کیا اور جس نے ایک شخص کی زندگی بچائی، اس نے گویا پوری انسانیت کی زندگی بچائی: ''**مَن قَتَلَ نَفساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِيْ الأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعاً وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعاً**'' (المائدۃ: ۳۲) انسانی حقوق کی اہمیت کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ اسلام میں خالقِ کائنات کی تمام تر عظمت کے باوجود حقوق کے باب میں بہ مقابلہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کے، انسانوں کے حقوق کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے، پیغمبر اسلام ﷺ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے حقوق تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کر دیں؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ بے حد رحیم وکریم ہیں؛ لیکن انسانوں کے حقوق معاف نہیں کئے جائیں گے اور انسان کو اس کی سزامل کر رہے گی، (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۴۲۰) اس میں مسلمان اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہیں؛ بلکہ آپ ﷺ نے صاف ارشاد فرمایا کہ اگر کسی غیر مسلم شہری کے ساتھ زیادتی روا رکھی گئی تو قیامت کے دن میں اس کی طرف سے فریق بن کر کھڑا ہوں گا: ''... **أنا حجيجه يوم القيامة**''۔ (أبوداود، حدیث نمبر: ۳۰۳۵)

حضرات ! آج دنیا میں 'انسانی حقوق' کا جو نعرہ ہر سو بلند کیا جا رہا ہے، مغرب کی طرف سے اس کی تاریخ کو بہت مختصر کر کے اور اسلامی تاریخ کو نظر انداز کر کے انقلاب فرانس کے بعد ۱۷۹۱ء میں سترہ دفعات پر مشتمل اعلامیہ کو اس سلسلہ کی پہلی کوشش قرار دیا جاتا ہے اور اس کوشش کا اوجِ کمال

۱۰ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ کی طرف سے پاس ہونے والے ۳۰ر دفعات پر مشتمل انسانی حقوق کے چارٹ کو سمجھا جاتا ہے، جس پر اُس وقت اڑتالیس ممالک نے دستخط کئے تھے اور بعد کو بتدریج بہت سے دوسرے ممالک نے بھی اس کو قبول کیا، یہ یقیناً ایک اہم قدم تھا؛ لیکن یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ یہیں سے انسانی حقوق سے متعلق جدوجہد کا آغاز ہوا ہے۔

انسانی حقوق کا یہ منشور دراصل مغرب کے لئے ایک مجبوری تھی ؛ کیوں کہ بیسویں صدی کا ابتدائی حصہ انسانی خوں آشامی کے لئے نہایت تکلیف دہ اور ناقابل فراموش زمانہ رہا ہے، جس میں معلوم تاریخ کی دو بڑی لڑائیاں ہوئیں، جو 'جنگ عظیم' کے نام سے یاد کی جاتی ہیں، اس جنگ نے نئی دنیا امریکہ سے لے کر مشرقِ بعید جاپان تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور جنگ کا یہ عفریت اس وقت تک آسودہ خاطر نہیں ہوا جب تک کہ اس نے لاکھوں انسانوں کے خون سے اپنی تشنہ لبی کو دور کرنے کا سروسامان نہ کرلیا، کہا جاتا ہے کہ کوئی بھی شئ جب اپنی انتہاء کو پہنچ جاتی ہے تو مائل بہ زوال ہونے لگتی ہے؛ چنانچہ جب یہ جنگی جنون اپنی نہایت پر پہنچ گیا اور انسانیت بلبلا اُٹھی تو درندگی کی اسی شب تاریک سے آدمیت کی ایک کرن طلوع ہوئی، مختلف ممالک میں انسانی حقوق سے متعلق قانون سازی کا عمل شروع ہوا اور دنیا بھر کے سنجیدہ اور انصاف پسند لوگوں نے آواز اُٹھائی کہ کچھ ایسے بنیادی انسانی حقوق ہونے چاہئیں کہ جن کا احترام جنگ وامن ہر دو حالتوں میں ضروری ہو، بالآخر یہ خواب اس طرح شرمندۂ تعبیر ہوا کہ ۱۰ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے انسانی حقوق کا منشور مرتب کرنے اور پاس کرنے میں کامیابی حاصل کی، مگر اب بھی یہ منشور عملاً ایک کھلونے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا؛ کیوں کہ رکن ممالک اول تو اس منشور پر دستخط کرنے اور نہ کرنے کے معاملہ ہی میں آزاد ہیں، دوسرے یہ منشور کسی فرد کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اس سلسلہ میں اپنے مقدمہ کو بین الاقوامی عدالت میں لے جاسکے، تیسرے بڑی طاقتیں کھلے عام اس معاہدہ کو پامال کرتی ہیں اور کوئی ان کے گریباں تھام نہیں سکتا، زیادہ تر کمزور ممالک پر ظلم وزیادتی اور مداخلت کے لئے ان قوانین کو ذریعہ بنایا جاتا ہے، انصاف کے یہ دوہرے پیمانے عملاً انسانی حقوق کی پاسداری کے نام پر انسانی حقوق کے اتلاف کا سبب بنے ہوئے ہیں۔

حضرات ! حقیقت یہ ہے کہ انسانی حقوق کا بنیادی تصور اور اس کی تفصیلات دنیا کی معلوم تاریخ میں سب سے پہلے محمد رسول اللہ ﷺ اور شریعت محمدی کے ذریعہ دنیا کو ملی ہیں، اسلامی نقطۂ نظر سے

دیکھیں تو انسانی حقوق کے سلسلہ میں اسلامی تصورات کی بنیاد چار باتیں ہیں :

اول یہ کہ انسان اپنی ذات سے شرافت وتکریم کا مستحق ہے: ''**وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىٓ آدَمَ**'' (الاسراء:۷۰) اس تکریم کا تقاضہ ہے کہ اس کی جان کی حفاظت ہو، خواہ اس کا تعلق کسی بھی جنس، مذہب یا علاقہ سے ہو، یہاں تک کہ اگر وہ مجرم بھی ہو اور اس کا جرم اس درجہ کا نہ ہو، جس کی وجہ سے وہ واجب القتل ہو جائے تو اس کی جان قابل حفاظت ہے — اس تکریم کا تقاضہ اس کے مال کی حفاظت ہے، تمام انسانوں کا مال یکساں قابل احترام ہے، زور زبردستی اور دھوکہ دے کر کسی کا مال حاصل کرنا جائز نہیں، یہاں تک کہ دشمنوں کا بھی نہیں: ''**وَلاَ تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ**'' (البقرۃ:۱۸۸) انسانی تکریم ہی کا پہلو یہ ہے کہ اس کو ارادہ و اختیار کی آزادی ہو اور جب تک اس کا عمل دوسروں کے لئے نقصان دہ نہ ہو، اس کو اپنی رائے کے مطابق عمل کرنے کی آزادی ہو، یہاں تک کہ قرآن دین و مذہب کے بارے میں بھی دنیوی زندگی میں اسے فیصلہ کا اختیار دیتا ہے: ''**لاَ إِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ**'' (البقرۃ:۲۵۶) اور ''**لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِىَ دِيْنِ**'' (الکافرون:۶) انسانی تکریم ہی میں یہ بات شامل ہے کہ انسان کی عزت و آبرو کا تحفظ ہو، کسی انسان کی نسبی شناخت کو متاثر کرنے کی کوشش نہ کی جائے؛ اسی لئے اسلام کی نظر میں زنا نہایت سنگین جرم سمجھا گیا ہے، ان پہلوؤں کا احاطہ کرنے کے لئے شریعت اسلامی کے ماہرین نے لکھا ہے کہ شریعت کے تمام احکام کے بنیادی مقاصد پانچ ہیں: دین کی حفاظت، جان کی حفاظت، مال کی حفاظت، نسل کی حفاظت اور عقل کی حفاظت، ان پانچوں مقاصد کی حیثیت مرکزی عنوان کی ہے اور ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے جو اُمور مطلوب ہوں، وہ سب اسلام میں مطلوب ہیں اور غور کیا جائے تو یہ پانچ مقاصد تمام بنیادی انسانی حقوق کا احاطہ کرتے ہیں۔

دوسرا بنیادی تصور انسانی وحدت و مساوات کا ہے، قرآن نے یہ تصور پیش کیا کہ شرافت وکرامت کے لئے اتفاقات کو بنیاد نہیں بنایا جاسکتا؛ بلکہ اس کی بنیاد اکتسابات ہے، یعنی انسان کا کسی خاص خاندان میں پیدا ہونا، کسی خاص رنگ ونسل کا حامل ہونا اور کسی خاص علاقہ سے متعلق ہونا وغیرہ، اتفاقی چیزیں ہیں، اس میں انسان کے کسب اور اس کی کوشش کا دخل نہیں ہے؛ اس لئے یہ باتیں وجہ فضیلت نہیں بن سکتیں، انسان کا عمل اور اس کا کردار وجہ فضیلت ہے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''**لا فضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي ولا لأبيض على أسود ولا لأسود**

علی أبیض إن أکرمکم عند اللہ أتقاکم'' (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۲۳۹۱) قرآن نے اس بات کو بھی واضح کر دیا کہ تمام انسانیت کی پیدائش ایک ہی ماں باپ کے ذریعہ ہوئی ہے؛ اس لئے نسلی اعتبار سے وہ ایک ہی جڑ کی شاخیں اور ایک ہی درخت کی ٹہنیاں ہیں، نیز مرد و عورت بھی ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں اور بہ حیثیت انسان ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے: ''**يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا**''۔ (النساء:۱)

تیسری چیز 'وحدت قانون' ہے، یعنی جب تمام انسان ایک ہیں تو اللہ کے احکام بھی ان سبھوں کے لئے ایک ہیں، کسی خاص سبب کے بغیر دو افراد و اشخاص کے درمیان قانون اور اس کی تنفیذ میں کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا، خواہ انسان کا تعلق کسی بھی نسل سے ہو، وہ حاکم ہو یا محکوم، مرد ہو یا عورت اور سرمایہ دار ہو یا غریب و مزدور، ملک کے قوانین کا اطلاق ان پر مساوات و برابری کے ساتھ ہوگا، رسول اللہ ﷺ کو اس کا اس قدر پاس و لحاظ تھا کہ جب فاطمہ نامی ایک قریشی خاتون کی سزا کے بارے میں بعض صحابہ نے سفارش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس کی جگہ فاطمہ بنت محمد ہوتی تو ان پر بھی یہی سزا جاری ہوتی (بخاری، حدیث نمبر: ۳۹۶۵) نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل پر اسی لئے اللہ کا عذاب آیا کہ وہ غریبوں پر تو قانون کو نافذ کرتے تھے اور مال داروں اور سماج کے معزز لوگوں کو قابل عفو سمجھتے تھے۔ (مسلم، حدیث نمبر: ۴۴۱۰)

چوتھے انسانی حریت کا تصور ہے، اسلام کا ایک بنیادی تصور یہ ہے کہ تمام انسان اپنی اصل کے اعتبار سے آزاد ہیں، انھیں کوئی غلام نہیں بنا سکتا، اس سلسلہ میں وہ تاریخی جملہ قابل ذکر ہے، جو ایک صحابی رسول نے رستم یونان کے دربار میں کہا تھا کہ ہم اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ اللہ کے بندوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر صرف خدا کی بندگی میں داخل کریں — انسانی آزادی کا یہ تصور اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا، جب تک انسان کو سوچنے، فکر کرنے اور اپنی رائے کو ظاہر کرنے کی اجازت حاصل نہ ہو، قرآن و حدیث میں بہت سے مواقع پر نہی عن المنکر یعنی برائیوں کو روکنے کی نہ صرف اجازت دی گئی ہے؛ بلکہ اس کا حکم دیا گیا ہے، اس میں یہ بات شامل ہے کہ انسان جس بات کو غلط سمجھے اس پر تنقید کرے اور شائستہ حدود میں اس کے خلاف احتجاج کرے۔

بنیادی انسانی حقوق کے سلسلہ میں پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات کو اگر کوئی شخص ایک جگہ دیکھنا چاہے تو حجۃ الوداع کا خطبہ اس کے سامنے ہونا چاہئے، یہ خطبہ انسانی حقوق کا بنیادی اور اولین منشور

ہے، جس میں انسانی مساوات، جرم وسزا میں یکسانیت، انسانی زندگی کا احترام، معاشی استحصال کی ممانعت، مال وجائداد کا تحفظ، ہر شخص کی دوسرے کے جرم سے براءت، عورتوں کے حقوق، غلاموں کے حقوق اور سیاسی مساوات کا واضح اعلان واظہار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام انسانی حقوق کی پاسداری کا نقیب وترجمان ہے اور بالخصوص ایک تکثیری معاشرہ میں تمام گروہوں کے ساتھ مساویانہ اور منصفانہ سلوک کی اس نے تعلیم بھی دی ہے اور مسلمانوں نے اس کا عملی نمونہ بھی پیش کیا ہے، خود رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں 'میثاق مدینہ' جس میں مسلمان، مشرکین اور یہود شامل تھے، اس کی بہترین مثال ہے؛ اسی لئے جب انسانی حقوق کی بحث عالمی سطح پر ایک اہم موضوع بن گئی اور اسے انسانیت کے لئے مغرب کا بہت بڑا عطیہ سمجھا جانے لگا، نیز یہ غلط فہمی بھی پیدا کی گئی کہ گویا اسلام انسانی حقوق کے بارے میں بخل ونا انصافی سے کام لیتا ہے، تو مختلف اہل علم نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا، جس میں شیخ محمد الغزالی کی ''**حقوق الإنسان وأحكام الشريعة الإسلامية**'' ڈاکٹر صبحی محمصانی کی ''**أركان حقوق الإنسان**'' ڈاکٹر قطب محمد قطب کی ''**الإسلام وحقوق الإنسان**'' ڈاکٹر فتح دریبی کا مقالہ ''**أصول حقوق الإنسان فی التشريع الاسلامی**'' ڈاکٹر محمد احمد مفتی کی ''**حقوق الإنسان فی الفكر السياسی والإسلامی**'' احمد جمال عبد العال کی ''**حقوق الإنسان الإسلام**'' اور محمد عمارہ کی ''**الإسلام وحقوق الإنسان ، ضرورات لا حقوق**'' نیز مشہور صاحب نظر فقیہ ڈاکٹر محمد زحیلی کی ''**حقوق الإنسان فی الإسلام**'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان تحریروں کے علاوہ المجلس الاسلامی کی طرف سے یونسکو میں ۱۹ر ستمبر ۱۹۸۱ء کو ادارہ کے جنرل سکریٹری سید سالم عزام نے حقوقِ انسانی کا عالمی اسلامی چارٹ ''**الإعلام الإسلامی العالمی لحقوق الإنسان**'' بھی پیش کیا، جسے تمام دینی حلقوں کی طرف سے قبول کیا گیا، یہ اعلامیہ ۲۳ر دفعات پر مشتمل ہے اور اپنی جامعیت کے اعتبار سے اسلامی پس منظر میں بنیادی انسانی حقوق کو واضح کرتا ہے۔

دنیا کی مسلم آبادی کا بہت بڑا حصہ برصغیر میں ہے، جو قریب قریب پچاس فیصد مسلمانوں کی نمائندگی کرتا ہے، اس خطہ کے علماء نے ہمیشہ پوری دنیا کے مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے، یہ علاقہ نہ صرف مسلم آبادی کے اعتبار سے؛ بلکہ افرادی وسائل کی کثرت کے لحاظ سے بھی اس وقت پوری دنیا میں امتیازی حیثیت کا حامل ہے؛ لیکن افسوس کہ انسانی حقوق کے سلسلہ میں اسلامی تعلیمات کو

انسانیت کے سامنے پیش کرنے کی جو علمی وفکری کوشش ہونی چاہئے تھی ، بانی اکیڈمی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے محسوس کیا کہ اس جانب توجہ نہیں ہو رہی ہے، اسی پس منظر میں آپ نے انسانی حقوق سے متعلق اسلامی تصورات کو واضح کرنے کے لئے اس عنوان کا انتخاب فرمایا اور ملک بھر کے اصحابِ نظر علماء سے موضوع کے مختلف پہلوؤں پر مقالات لکھوائے ،جس کا مجموعہ اس وقت انشاء اللہ آپ حضرات کے سامنے آئے گا ، قاضی صاحبؒ کی خواہش تھی کہ اس موضوع پر علماء اور اصحابِ دانش جمع ہوں اور اس پر بحث کریں ، یہ بحث ان مسائل کی تحقیق پر بھی مبنی ہو،جن میں اختلاف رائے ہے،ان آراء کی تطبیق بھی پیش نظر ہو،جو فقہاء نے کسی خاص دور میں اس عہد کے سیاسی حالات کے تحت اختیار کی تھیں اور اب حالات بدل چکے ہیں ، یہ مذاکرہ اسلام کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کرے اور اسلام کی روشن تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا ذریعہ بھی بنے ،وہ بہت خواہش مند تھے کہ ان کی زندگی میں یہ اہم پروگرام منعقد ہو؛لیکن عند اللہ یہ بات مقدر نہیں تھی ،تاخیر ہوتی گئی اور تاخیر کا سلسلہ اتنا دراز ہوتا گیا کہ آج یہ پروگرام منعقد ہو رہا ہے، جو انشاء اللہ ''دیر آید درست آید'' کا مصداق ہوگا۔

دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پروگرام کو کامیاب بنائے ،اسے مفید اور نتیجہ خیز فرمائے اور یہ اس کی رضاء وخوشنودی اور اس کے دین کی تائید وتقویت کا ذریعہ ثابت ہو۔

وباللہ التوفیق وھو المستعان ۔

●●●

اقلیتوں کے حقوق ☆

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وأصحابه أجمعين ، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ۔

حضرات ! آج ہم ایک ایسے موضوع پر اکٹھا ہوئے ہیں، جو نہایت اہمیت کا حامل ہے؛ کیوں کہ آج پوری دنیا میں جمہوریت اور سیکولرزم کو سب سے بہتر اور معیاری نظامِ حکومت تصور کیا جاتا ہے اور یہ اس پہلو سے واقعی اہم ہے کہ اس نظام میں ایک شخص یا ایک خاندان کے بجائے عوام کی رائے کو اہمیت حاصل ہوتی ہے اور ان کو اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ چوں کہ جمہوری نظام میں اکثریت کی رائے پر فیصلہ ہوتا ہے؛ اس لئے اقلیت کے حقوق کے تحفظ کا مسئلہ نہایت اہمیت اختیار کر چکا ہے اور اکثر مواقع پر اقلیت کو اپنے بقا اور تشخص کے لئے جدو جہد کئے بغیر چارہ نہیں رہتا؛ اسی لئے جب سے دنیا میں جمہوری نظام کو غلبہ حاصل ہوا ہے، اقلیتوں کے حقوق کو خصوصی اہمیت حاصل ہوگئی ہے، اقلیتوں کے مسائل ہمہ جہت نوعیت کے ہیں، ان کا تعلق سیاست سے بھی ہے، معیشت سے بھی، تعلیم سے بھی اور مذہبی اُمور سے بھی۔

اسلام ایک ایسا مذہب ہے، جو عبادت گاہوں کی چہار دیواری تک محدود نہیں؛ بلکہ وہ پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے اور ہر شعبہ میں انسانیت کی رہنمائی کرتا ہے، مکہ کی سرزمین میں جب اسلام کا سورج طلوع ہوا، تو اس وقت تنہا پیغمبر اسلام ﷺ مسلمان تھے، پھر اسلام کی کرنیں پھیلتی گئیں اور اس کی خوشبو نے روشن ضمیر لوگوں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا، لوگ جس قدر اسلام کی طرف جھکتے، اتنی ہی شدت کے ساتھ عداوتیں بھی اُبھرتی گئیں اور مسلمانوں کے لئے جینا دوبھر ہوگیا، یہاں تک کہ وہ ترک وطن کرنے پر مجبور ہوگئے، تیرہ سال مکہ میں آپ نے زندگی گذاری اور اس پورے عرصہ میں مسلمان ایک ایسی اقلیت کی حیثیت سے مکہ میں مقیم رہے، جو انتہائی جبر و تشدد کا شکار تھی؛ اس لئے پیغمبر

☆ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے ہمدرد کنونشن سنٹر دہلی میں ’اقلیتوں کے حقوق‘ کے موضوع پر ایک اہم پروگرام منعقد کیا تھا، یہ اس موقع پر پیش کیا گیا کلیدی خطبہ ہے۔

اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ اقلیت کے درد اور ان کے مسائل سے اچھی طرح واقف تھے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے آخری عمومی خطبہ میں بھی حجۃ الوداع کے موقع پر مسلمانوں کو اقلیت کے ساتھ حسن سلوک —— جن کو اہل ذمہ کہا جاتا تھا —— کی خاص طور پر تلقین فرمائی۔

اسی لئے اسلام میں اقلیتوں کو وسیع تر حقوق دیئے گئے ہیں ، اسلامی مملکت میں مذہبی اقلیت کو ''اہل ذمہ'' کہا جاتا ہے، ذمہ کے اصل معنی عہد اور امان وغیرہ کے ہیں، (لسان العرب: ۵۹/۵) چوں کہ اہل ذمہ کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ ہے اور مسلمان ان سے عہد کے پابند ہیں، اس لئے ان کو ذمی یا اہل ذمہ کہا جاتا ہے، علامہ ابن اثیر رقم طراز ہیں :

وسمی أهل الذمة لدخولهم فی عهد المسلمین وأمانهم۔ (النہایۃ فی غریب الحدیث: ۱۶۸/۲)

چوں کہ اسلام نے ذات پات، علاقہ اور زبان کی بنیاد پر کوئی تقسیم نہیں کی ہے، اس لئے لسانی اور نسلی اقلیت کا عام طور پر اسلامی قانون کے ماہرین نے ذکر نہیں کیا ہے اور چند صدی پہلے تک عالم اسلام میں اس کی وجہ سے کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا؛ کیوں کہ اسلام اسلامی وحدت اور انسانی وحدت پر بہت زور دیتا ہے ؛ لیکن ہمیں شریعت میں ایسے اُصول ملتے ہیں جو ایسی اقلیتوں کو بھی مساویانہ حقوق فراہم کرنے کے لئے بنیادی ہدایات کا درجہ رکھتی ہیں، قرآن مجید میں صاف طور پر فرمایا گیا ہے کہ خاندانوں اور قبیلوں کی تقسیم محض تعارف کے لئے ہے، تفاخر کے لئے نہیں، اس سے واضح ہوا کہ نسلی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں کی جاسکتی؛ اسی لئے دربار محمدی میں ہمیں جہاں قریش کے ابوبکر وعمر اور عثمان وعلی ملتے ہیں، وہیں حبش کے بلال ، روم کے صہیب ، فارس کے سلمان اور یمن کے ابوموسیٰ اشعری ﷺ بھی اسی عزت ووقار کے ساتھ موجود ہیں۔

اسی طرح اسلام کی نظر میں مقاماتِ مقدسہ کے علاوہ تمام روئے ارض کی حیثیت برابر ہے، علاقہ کی بنیاد پر کوئی تفریق روا نہیں رکھی جاسکتی، جغرافیائی تقسیم انسانوں کی خودساختہ ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھینچی ہوئی سرحدیں نہیں ہیں؛ اس لئے علاقہ کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم کا کوئی تصور نہیں، یہی حال زبان کا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمام زبانیں اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں اور اللہ کی تمام مخلوقات قابل احترام ہیں، اگر اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کچھ مخصوص زبانیں ہی وقعت کی حامل ہوتیں، تو صرف ان ہی زبانوں میں آسمانی کتابیں اُتاری جاتیں؛ لیکن قرآن مجید نے واضح کردیا ہے کہ ہم نے ہر قوم میں ان ہی کی زبان میں اپنا پیغام بھیجا ہے، گویا ہر زبان کو پیغامِ الٰہی کا امین بننے کا شرف حاصل ہے۔

اسلام میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ انسان اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے کسی خاص زبان ہی کو استعمال کرے ، یہی وجہ ہے کہ مسلمان جس علاقہ میں گئے ، انھوں نے پوری فراخدلی کے ساتھ وہاں کی زبان اختیار کر لی ، اگر دنیا کی مختلف زبانوں میں عربی الفاظ کی موجودگی کا تجزیہ کیا جائے تو بہتر طور پر اس کا اندازہ ہوسکتا ہے ؛ اسی لئے ہمیں اسلامی فقہ میں مذہبی اقلیتوں کا ذکر تو ملتا ہے اور بعض احکام میں مسلمانوں کے اور ان کے درمیان فرق کی نشاندہی ملتی ہے ؛ لیکن نسلی ، لسانی اور علاقائی اقلیتوں کے جداگانہ احکام نہیں ملتے ہیں ؛ کیوں کہ شریعت اسلامی میں اسلامی وحدت اور اسلامی اُخوت کے جو آفاقی تصورات ہیں ، ان کی روشنی میں جغرافیائی ، لسانی اور نسلی بنیاد پر حقوق واختیارات کے اعتبار سے اکثریت اور اقلیت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔

حضرات ! موضوع کی مناسبت سے یہ بات مناسب محسوس ہوتی ہے کہ اس وقت مسلم ملک میں غیر مسلم اقلیت کے حقوق کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے ، اسلام کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے ، توحید کے معنی اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات وصفات ، اختیارات اور بعض حقوق ، عبادت و بندگی کے استحقاق میں یکتا ماننے کا نام ہے ، اس بنیادی تصور سے جہاں خدا کی عظمت دل میں گھر کرتی ہے ، وہیں اس سے خود انسان کا مقام ومرتبہ بھی معلوم ہوتا ہے اور اس نسبت سے تین باتیں بہت اہم ہیں ، اول یہ کہ جب خدا ہی تنہا معبود ہے اور تمام انسان اس کے بندے ہیں ، تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بحیثیت انسان تمام انسان برابر ہیں ، قرآن مجید نے اس کو صاف لفظوں میں بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسان کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے '' **خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ** '' (**النساء**:۱) یہ وحدتِ انسانیت کا واضح اعلان ہے ، تصور توحید سے جو دوسرا تصور اُبھرتا ہے ، وہ یہ ہے کہ بحیثیت عبد و معبود ، خدا اور انسان کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے ، ایسا نہیں کہ کسی خاص انسان یا مخصوص انسانی گروہ کے بغیر انسان خدا کی خوشنودی کو نہیں پا سکتا ؛ بلکہ ہر شخص خدا سے براہ راست مانگ سکتا ہے ، اس کے سامنے ہاتھ پھیلا سکتا ہے اور اس کی بندگی کر سکتا ہے ، اس لئے کہ وہی قادر مطلق ہے اور باقی سب عاجز ہیں ، قرآن مجید کی پہلی سورت ، سورۂ فاتحہ میں '' **إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ** '' (**الفاتحہ**:۴) کے فقرہ میں بندہ کی زبان سے یہ بات کہلائی گئی ہے کہ : خداوندا ! ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد کے خواستگار ہیں ، یہ اس بات کا صریح و بے غبار اعلان ہے کہ بندہ براہ راست اپنے رب سے مربوط ہے۔

ان دو تصورات کے ساتھ جو تیسرا تصور سامنے آتا ہے، وہ ہے انسانی کرامت وشرافت کا؛ کہ چوں کہ بحیثیت انسان سارے لوگ برابر ہیں اور کائنات انسان ہی کے لئے پیدا کی گئی ہے؛ اس لئے وہ اس کائنات کی سب سے زیادہ معزز اور قابل احترام مخلوق ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلاً۔ (بنی اسرائیل: ۷۰)

ہم نے بنی آدم کو عزت عطا کی ، انھیں خشکی اور سمندر میں سوار کیا، ان کو پاک رزق عطا کی اور ہم نے اپنی پیدا کی ہوئی بہت سی مخلوقات پر ان کو فضیلت دی۔

یہ انسان کے بارے میں اسلام کے بنیادی تصورات ہیں، جو بحیثیت انسان ہر ابن آدم سے متعلق ہیں، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، پس اسلام کی نگاہ میں غیر مسلم بھی ہمارے انسانی بھائی ہیں اور بحیثیت انسان قابل احترام ہیں، اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کے حقوق انھیں تصورات پر مقرر کئے گئے ہیں، جن کے بنیادی نکات اس طرح ہیں :

۱- غیر مسلموں کی جان کی اسی طرح حفاظت کی جائے گی، جیسے مسلمان کی؛ کیوں کہ قرآن مجید نے کسی بھی انسان کے قتل ناحق کو منع فرمایا ہے: ''**وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلاَّ بِالْحَقِّ**'' (**بنی اسرائیل**: ۳۳) چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے کسی معاہد کو قتل کردیا، وہ جنت کی بُو سے بھی محروم رہے گا ''**من قتل معاهداً لم يرح رائحة الجنة**'' (بخاری، حدیث نمبر: ۳۱۶۶)

غرض کہ ایک غیر مسلم شہری کی جان کی وہی اہمیت ہے، جو ملک کے مسلمان شہری کی ہے؛ چنانچہ :

(الف) اگر مسلمان کسی غیر مسلم کو ظلماً قتل کردے تو وہ مسلمان قصاص کے طور پر قتل کیا جائے گا، اس لئے کہ قرآن مجید نے قصاص کا یہی اُصول بتایا ہے کہ نفس انسانی کے بدلہ قاتل قتل کیا جائے گا ''**اَلنَّفْسَ بِالنَّفْسِ**'' (**المائدۃ**: ۴۵) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مسلمان کو غیر مسلم معاہد کے بدلہ قتل کیا اور فرمایا: ''**أنا أكرم من وفى بذمته**'' (سنن بیہقی: ۱۲/۴۰، حدیث نمبر: ۱۶۳۴۵) اسی پر صحابہ کا عمل رہا ہے، اہل حیرہ میں سے ایک عیسائی یا یہودی کو کسی مسلمان نے قتل کردیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمان سے اس کا قصاص لیا، (مصنف عبدالرزاق: ۱۰/۱۰۲، حدیث نمبر: ۱۸۵۱۸) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ایک ذمی کو قتل کرنے کے جرم میں مسلمان قاتل کے قتل

کئے جانے کا فیصلہ کیا؛لیکن ذمی کے ورثہ نے خود ہی قصاص معاف کر دیا،اس موقع پر حضرت علیؓ نے اُصولی بات کہی کہ ذمیوں کا خون اور خون بہا مسلمانوں کے برابر ہے''**من كان له ذمتنا فدمه كدمنا وديته كديتنا**''(سنن بیہقی: ۴۶/۱۲،حدیث نمبر: ۱۶۳۶۳) صحابہؓ کے بعد بھی اسی پر عمل رہا، چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا،انھوں نے بھی اپنے گورنر کو مسلمان قاتل پر قصاص جاری کرنے کا حکم دیا۔(مصنف عبدالرزاق: ۱۰/ ۱۰۲،حدیث نمبر: ۱۸۵۱۸)

(ب) اسی طرح غیر مسلم کی دیت وہی ہے جو مسلمان کی ہے،اس سلسلہ میں حضرت علیؓ کی روایت اوپر گذر چکی ہے،حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ذمی کی دیت مسلمان ہی کی طرح ادا فرمائی،(دارقطنی،کتاب الحدود: ۳۴۳،نیز دیکھئے: نصب الرایۃ: ۳۶۶/۴)حضرت اسامہ بن زیدؓ سے بھی یہی روایت ہے،جس کے الفاظ ہیں:''**جعل دية المعاهد كدية المسلم**''(دارقطنی،کتاب الحدود: ۲۴۹)امام ابوحنیفہؒ نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر،حضرت عمر اور حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ جو دیت مسلمان کی ہے،وہی معاہد کی ہے، (کتاب الآثار للامام محمد،حدیث نمبر: ۵۸۷)حضرت ابوہریرہؓ نے نقل کیا ہے کہ عہد نبوی ﷺ سے حضرت علیؓ کے عہد تک مسلمان،یہودی اور عیسائی کی دیت برابر سمجھی جاتی تھی،حضرت معاویہؓ نے ذمی کی دیت نصف کر دی،حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے پھر دونوں کی دیت برابر کر دی،(نصب الرایۃ: ۳۶۶/۴)اور ربیعہ بن عبدالرحمن نے نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے ابتدائی عہد میں بھی ذمی کی دیت وہی تھی،جو مسلمانوں کی ہے،(مراسیل أبی داود: ۱۳،باب دیۃ الذمی) چنانچہ فقہاء احناف کے نزدیک ذمی کی وہی دیت ہوتی ہے،جو مسلمان کی،(دیکھئے: ہدایہ: ۵۸۵/۲،کتاب الدیات،ط: دیوبند،البحر الرائق: ۷۹/۹)اور یہی نقطۂ نظر مشہور فقیہ اور محدث سفیان ثوریؒ اور بعض دوسرے اہل علم کا بھی ہے۔(ترمذی: ۲۶۱/۱،باب ماجاء لایقتل مسلم بکافر)

۲- غیر مسلم شہریوں کے مال اسی طرح قابل احترام ہیں اور ان کو تحفظ حاصل ہے،جیسے مسلمانوں کے مال،اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جبری طور پر کسی کا بھی مال لینے سے منع کیا ہے،اس میں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی تفریق نہیں''**وَلاَ تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ**''(**البقرة:۱۸۸**) حضرت علیؓ نے اُصولی بات فرمائی ہے کہ اہل ذمہ کے مال بھی مسلمانوں کے ہی مال کی طرح ہیں ''**دمائهم كدمائنا وأموالهم كأموالنا**''(دیکھئے: نصب الرایۃ: ۳۶۹/۴) چنانچہ رسول اللہ ﷺ جب غیر مسلموں سے معاہدہ کرتے تو جان و مال دونوں کے لئے امان منظور فرماتے۔(ابوداود،حدیث نمبر: ۳۰۴۷)

مال کے تحفظ میں بنیادی طور پر یہ اُمور شامل ہیں :

(الف) مالک ہونے کا حق ، غیر مسلموں پر جوٹیکس عائد کیا جاتا ہے، وہ خود ان کی املاک پر ان کے حق کو تسلیم کرنے کی دلیل ہے۔

(ب) اپنے مال میں تصرف کا حق۔

(ج) غیر مسلموں کے مال کی چوری پر وہی سزا دی جائے گی ، جو مسلمان کا مال چوری کرنے پر دی جاتی ہے، اگرچہ خود چوری کرنے والا مسلمان ہو" **ویقطع المسلم بسرقة مال المسلم والذمی** "(المغنی لابن قدامۃ: ۱۲/ ۴۵۱، مع تحقیق: عبداللہ بن عبدالمحسن وغیرہ) اختیار کرنے کا حق حاصل ہے، یہ حق مسلمانوں کی طرح غیر مسلم شہریوں کو بھی حاصل ہوگا ، زراعت ، تجارت ، صنعت اور مختلف طرح کے کاروبار غیر مسلموں کا کرنا خود رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کے عہد میں ثابت ہے؛ البتہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اگر وہ کوئی ایسا پیشہ اختیار کرے ، جس کی اہلیت اس میں نہیں ہے اور اس کی نااہلی سے دوسروں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو اس کو اس پیشہ کے اختیار کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی ؛ چنانچہ جو شخص فن طب سے واقفیت کے بغیر علاج و معالجہ کرے تو آپ نے اس کو مریض کو پہنچنے والے نقصان کا ضامن قرار دیا ؛ چنانچہ ارشاد ہے :"**من تطبب ولم يعلم منه قبل ذلک الطب فهو ضامن**"۔ (أبوداود: ۲/ ۲۳۰)

۳- غیر مسلم شہریوں کی عزت و آبرو کا اسی طرح تحفظ کیا جائے گا، جس طرح مسلمانوں کی، اسی لئے قرآن نے مطلقاً نگاہ کو پست رکھنے کا حکم دیا، اس میں مسلم و غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں، (**النور**: ۳۱-۳۰) اسی طرح زنا کی سزا مطلق ہے، چاہے کسی مسلمان عورت سے ہو یا غیر مسلم عورت سے۔

۴- غیر مسلموں کو بھی تعلیم و تعلم کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے، مدینہ میں یہودیوں کا اپنا مدرسہ "بیت المدراس" قائم تھا، آپ ﷺ نے کبھی اس سے تعرض نہیں فرمایا، آپ ﷺ نے باندیوں کو تعلیم دینے کی ترغیب دی، (بخاری: ۱/ ۲۰) جو عام طور پر غیر مسلم ہوا کرتی تھیں۔

۵- اسلام میں وضع قانون اصل میں اللہ تعالیٰ کا حق ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "**وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ**" (**الشوریٰ**: ۱۰) اس لئے اسلامی مملکت میں پارلیمنٹ کے کام دو نوعیت کے ہوں گے، ایک تو قرآن و حدیث کے دیئے ہوئے قوانین کی تشریح و توضیح ، دوسرے انتظامی اُمور جیسے ٹریفک ، ریلوے وغیرہ کے بارے میں قانون سازی ، تو پہلی قسم کے

پارلیمانی کام میں غیر مسلموں کا کوئی حصہ نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ وہ اس قانون پر یقین ہی نہیں رکھتے؛ البتہ انتظامی نوعیت کے قوانین میں ان سے رائے لی جائے گی، اسی طرح غیر مسلم اپنے سماجی قوانین وضع کر سکتے ہیں، پس مسلم مملکت کی پارلیمنٹ میں غیر مسلم ارکان ہوسکتے ہیں؛ لیکن شرعی قوانین کی توضیح ان کے دائرۂ عمل سے باہر ہوگی؛ البتہ ان کے مفادات کی پوری رعایت ملحوظ رہے گی۔

۶- غیر مسلموں کو اسلامی مملکت میں ملازمت کے مواقع دیئے جائیں گے، رسول اللہ ﷺ کا بدر کے قیدیوں سے مسلمان بچوں کو تعلیم دلانا ثابت ہے، (دیکھئے: مسند أحمد، حدیث نمبر: ۲۲۱۵، عن ابن عباسؓ) اس سے معلوم ہوا کہ شعبۂ تدریس میں ان سے مدد لی جاسکتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے موقع پر ایک مشرک کو دلیل بنایا ہے، اس سے علامہ ابن قیمؒ نے ثابت کیا ہے کہ غیر مسلم ملازم رکھے جاسکتے ہیں، (أحکام أہل الذمۃ: ۱/ ۲۰۷، لابن القیم) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن غیر مسلموں سے ملک کی سلامتی اور اس کی فکری سمت کو خطرہ نہ ہو، ان کو حساس عہدوں پر بھی مامور کیا جاسکتا ہے اور ان سے فوجی مدد بھی لی جاسکتی ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ غزوۂ خیبر میں آپ ﷺ نے بنو قینقاع کے یہودیوں سے بھی مدد لی تھی، (نصب الرایۃ: ۳/ ۴۲۲) اسی لئے فقہاء کا ایک بڑا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ قابل بھروسہ مشرکین سے عسکری مدد بھی لی جاسکتی ہے۔ (**کتاب الإعتبار للحازمی: ۲۱۷**)

۷- غیر مسلموں کو کچھ خاص حدود کے ساتھ مذہبی آزادی بھی حاصل ہوگی؛ البتہ اس سلسلہ میں چند نکات قابل لحاظ ہیں:

(الف) غیر مسلموں کو عقیدہ کی مکمل آزادی ہوگی، قرآن مجید کا ارشاد بالکل واضح ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں ''**لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ**'' (**البقرۃ: ۲۵۶**) اس لئے کسی غیر مسلم کو تبدیلئ مذہب پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

(ب) ایسی بات کہنا جو ان کے لئے مذہبی دل آزاری کا باعث ہو اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی اہانت کے دائرہ میں آتا ہو جائز نہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے معبودان باطل کو برا بھلا کہنے سے منع فرمایا، ارشاد ہے: ''**وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ**'' (**الانعام: ۱۰۸**) پھر یہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ '' اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں ان کی زبان میں رسول بھیجے ہیں'' (**ابراھیم: ۴**) پس غیر مسلم حضرات جن خود ساختہ معبودوں کی پرستش کرتے ہیں، یہ بات ممکن ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے پیغمبر رہے ہوں اور کسی بھی پیغمبر کی اہانت باعث کفر ہے؛ اس لئے اسلام سے پہلے جو مذاہب گذرے ہیں، ان کے پیشواؤں کی بے احترامی کسی طور روا نہیں۔

(ج) غیر مسلم اقلیت کو اپنے مذہبی طریقہ پر عبادت کرنے کی آزادی ہوگی اور وہ اپنے معاشرتی قوانین میں بھی اپنے مذہب پر عمل کرنے میں مختار ہوں گے، حضرات صحابہؓ کے دور میں جہاں کہیں جنگ کے بعد صلح ہوئی تو اس میں اپنے مذہب کے مطابق عبادت کے حق کو تسلیم کیا گیا، علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ مسلمان شوہر کی یہودی عیسائی بیوی کو اس کا شوہر بھی عبادت اور اس کے مذہبی فرائض سے نہیں روک سکتا اور نہ اس کو ایسی چیزوں کے کھانے پر مجبور کر سکتا ہے، جو اس کے مذہب میں حرام ہو۔ (أحکام أہل الذمة: ۱/۳۱۶)

چنانچہ غیر مسلموں کو خنزیر کھانے کی اجازت ہوگی، ان کو شراب کی خرید و فروخت کی بھی اجازت ہوگی، (ہدایۃ، باب نکاح أہل الشرک) یہاں تک کہ مجوسیوں کے یہاں ماں، بیٹی اور محرم رشتہ داروں سے بھی نکاح کی اجازت تھی، فقہاء نے لکھا ہے کہ جب تک وہ دونوں یا ان میں سے ایک مسلمان نہ ہوں، ہم ان کے معاملہ میں دخل نہیں دیں گے، (ہدایۃ، باب وصیۃ الذمی) رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی حضرت عرفہ بن حارث ؓ ذمیوں کے حقوق پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں: ''**وأن یخلی بینھم وبین أحکامھم**''۔ (مجمع الزوائد، حدیث نمبر: ۹۱۸۰۳)

(د) غیر مسلموں کو اپنی عبادت گاہوں کی حفاظت کا بھی حق حاصل ہوگا، قرآن مجید نے اس بات کو ناپسند کیا ہے کہ فاتحین، مفتوحین کی عبادت گاہوں کو منہدم کر دیں ''**وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُم بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْراً**'' (**الحج: ۴۰**) رسول اللہ ﷺ نے اہل نجران سے جو معاہدہ فرمایا، اس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ ان کی عبادت گاہیں منہدم نہیں کی جائیں گی، ان کے مذہبی پیشوا سے تعرض نہیں کیا جائے گا اور نہ انھیں ان کے دین سے ہٹایا جائے گا ''**لا یھدم لھم بیعة ولا یخرج لھم قس ولا یفتن عن دینھم**'' (أبوداود، حدیث نمبر: ۳۰۴۱) اسی طرح کی تحریریں حضرت خالد بن ولید ؓ سے بھی مختلف صلح ناموں میں مروی ہیں، (کتاب الخراج لأبی یوسف: ۱۴۳) حضرت ابوبکر ؓ نے اہل نجران سے معاہدہ کی تجدید میں بھی اس دفعہ کو شامل رکھا ہے، (**کتاب السیر والخراج والعشر للشیبانی: ۲۵۰**) حضرت خالدؓ کے صلح ناموں میں صراحت ہے کہ وہ اوقات نماز کو چھوڑ کر جس وقت بھی چاہیں ناقوس بجانے کا حق رکھیں گے اور اپنے تیوہاروں میں صلیب بھی نکالیں گے، (کتاب الخراج: ۱۴۶) فقہاء کے یہاں یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ ان کی جو عبادت گاہیں ٹوٹ جائیں، وہ ان کو دوبارہ تعمیر کرنے کا

حق رکھتے ہیں؛ چنانچہ علامہ ظہیر الدین مرغینانی فرماتے ہیں: ''**إن انهدمت البيع والكنائس القديمة أعادوها**''۔ (ہدایۃ، باب الجزیۃ)

جہاں تک نئی عبادت گاہوں کی تعمیر کی بات ہے تو قرآن وحدیث میں صراحتاً کہیں اس کی ممانعت وارد نہیں ہوئی ہے اور بعض فقہاء کے یہاں اس کے جائز ہونے کی صراحت ملتی ہے کہ وہ اپنی زمین میں عبادت گاہ تعمیر کرلیں ''**ولا يمنعون أن يجعلوا فى أراضيهم بيعا ولا صوامع ولا كنائس**'' (**كتاب السير والخراج والعشر للشيبانى : ۲۵۳**) اسی طرح غیر مسلم اپنی عبادت گاہوں کے لئے وقف بھی کرسکتے ہیں، بعض فقہاء کی عبارت سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے، ''**إذا تبنىٰ داره بيعة أو كنيسة فهو جائز من الثلث**''۔ (ہدایۃ، باب وصیۃ الذمی)

(ہ) غیر مسلموں کو اس بات کا حق ہوگا کہ وہ مسلمانوں کے سوا دوسری اقوام پر اپنے مذہب کی تبلیغ کریں، اگر وہ رضا کارانہ اپنا مذہب بدل لیں، جیسے یہودی عیسائی، یا عیسائی ہندو بن جائے تو اس سے حکومت کو کوئی سروکار نہیں ہوگا، امام مالکؒ نے اس کی صراحت کی ہے، (مؤطا امام مالک: ۳۰۸، القضاء فیمن ارتد عن الاسلام) البتہ اس بات کی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ مسلمانوں کو اپنے مذہب میں آنے کی دعوت دیں، اگر دار الاسلام میں کوئی مسلمان مرتد ہوجائے تو اس کی سزا قتل ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**من بدل دينه فاضربوا عنقه**'' (ابوداؤد: ۲/۵۹۸، ترمذی: ۲/۲۷۰)؛ کیوں کہ دار الاسلام میں اسلام سے ارتداد بغاوت کے مترادف ہے اور دنیا کے ہر قانون میں بغاوت کی سزا قتل یا اس کے مماثل ہے۔

۸- غیر مسلم شہریوں کو بھی احتجاج کا حق اور اظہار رائے کی آزادی ہوگی؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلاَّ مَن ظُلِمَ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعاً عَلِيْماً**'' (**النساء**: ۱۴۸) غیر مسلموں کو مسلمان اور ان کے افکار پر سنجیدہ اور شائستہ تنقید کا بھی حق ہوگا؛ جیسا کہ قبیلۂ بنی نجران سے آپ کا مباحثہ ومناقشہ ہوا، فقہاء نے تو یہ بھی لکھا ہے: ''**ومن امتنع من الجزية أو قتل مسلماً أو سب النبى صلى الله عليه وسلم أو زنى بمسلمة لم ينتقض عهده**'' (ہدایۃ، باب الجزیۃ) لیکن ظاہر ہے کہ ایسی تنقید جو بدتمیزی اور بے ادبی کے دائرہ میں آتی ہو، کی اجازت نہیں ہوگی اور رسول اللہ ﷺ کی اہانت کی وجہ سے چاہے عہد ذمہ ختم نہ ہو، لیکن بطور سرزنش وہ لائق قتل ہوگا۔

۹- غیر مسلموں کے ساتھ عمومی حسن سلوک اور مالی اعانت نہ صرف جائز؛ بلکہ مستحسن ہوگی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ'' (الممتحنہ:۸) اہل ذمہ تو کیا رسول اللہ ﷺ نے ان اہل مکہ کی بھی مدد فرمائی، جو اسلام سے برسر جنگ مگر قحط سے دو چار تھے، آپ نے ان کی مدد کے لئے پانچ سو دینار ابوسفیان بن حرب اور صفوان بن امیہ کو بھیجے کہ اسے اہل مکہ پر تقسیم کر دیں، (ردالمحتار: ۳/۳۰۲، باب المصرف) اسی لئے فقہاء حنفیہ کے نزدیک زکوٰۃ کے سوا تمام صدقات واجبہ، نیز صدقۃ الفطر غیر مسلموں کو دیا جا سکتا ہے اور صدقات نافلہ تو بدرجۂ اولیٰ، (دیکھئے: درمختار مع الرد: ۳/۳۰۱) پس غیر مسلم اقلیت کو تمام معاشی سہولتیں دی جائیں گی، خاص طور پر بیمار، معذور، آفت زدہ، مفلس اور قدرتی مصائب سے دو چار ملک کے تمام شہریوں کی انسانی بنیادوں پر مدد کی جائے گی۔

۱۰- غیر مسلموں پر شخصی حیثیت سے ایک خاص ٹیکس جزیہ کا اور زرعی پیداوار پر خراج کا لیا جائے گا، عورت، نابالغ بچہ، فاتر العقل، سن رسیدہ بوڑھا، اپاہج اور دائم المریض اشخاص نیز معاشی اعتبار سے کمزور افراد پر جزیہ کا ٹیکس عائد نہیں ہوگا، (أحکام أہل الذمۃ: ۱/۴۸، ۵۲، ۵۳، ہدایۃ، باب الجزیۃ) جزیہ کی مقدار بہت ہی معمولی ہے، جزیہ کے عوض حکومت ان کی حفاظت کا ذمہ لیتی ہے اور چوں کہ مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے، اگر ان سے بھی زکوٰۃ لی جاتی تو یہ ان کو ایک اسلامی عبادت پر مجبور کرنے کے مترادف ہوتا؛ اس لئے ان پر ایک خصوصی ٹیکس عائد کیا گیا ہے، جو پہلے سے ایران وغیرہ کے علاقہ میں مروج تھا۔

جیسے مسلمانوں سے ان کی زرعی پیداوار میں عشر لیا جاتا ہے، جو ایک طرح کی عبادت ہے، اسی طرح غیر مسلموں سے بجائے عشر کے خراج لیا جاتا ہے، جس کی مقدار معمولی ہے اور جو سیلاب یا سوکھا پڑ جانے کی صورت میں معاف ہو جاتا ہے، (ہدایۃ، باب العشر والخراج) یہ ٹیکس غیر مسلموں کی تذلیل نہیں؛ بلکہ ملک کی انتظامی ضرورتوں کو اس طرح پورا کرنا ہے کہ ان پر زکوٰۃ و عشر جیسی خالص اسلامی عبادتیں لازم قرار نہ دی جائیں؛ کیوں کہ یہ مذہبی آزادی کے مغائر ہوتا۔

بزرگانِ محترم! اسلام کی ان ہی تعلیمات کا اثر ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ اپنے زیر اقتدار غیر مسلم اقلیت یا اکثریت کے ساتھ بہتر سلوک کیا ہے اور آج بھی مسلم ممالک میں غیر مسلم بھائی پوری

آزادی اور سہولتوں کے ساتھ مقیم ہیں، اسرائیل میں صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے گھر پر بلڈوزر چلا دیئے جاتے ہیں اور بغیر کسی سبب کے انھیں جلاوطن کر دیا جاتا ہے؛ لیکن اسرائیل ہی کے پڑوس میں مصر اور شام کو دیکھئے اور ذرا آگے بڑھ کر ایران وعراق پر نظر ڈالیے کہ وہاں یہودی اور بعض قدیم عیسائی فرقے پوری راحت اور سکون کے ساتھ مقیم ہیں، انڈونیشیا سب سے بڑی مسلم آبادی کا ملک ہے وہاں عیسائیوں کو نہ صرف آزادی حاصل ہے؛ بلکہ یہ آزادی بعض اوقات مسلمانوں پر زیادتی کی شکل اختیار کر لیتی ہے، ہندوستان کے مختلف خطوں میں تقریباً ایک ہزار سال مسلمانوں نے حکومت کی؛ لیکن ہندوؤں اور بدھسٹوں کے بڑے بڑے تاریخی مندروں کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچا؛ بلکہ مسلمان حکومت نے ان کے لئے بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں اور مذہبی پیشواؤں کے لئے خصوصی مراعات رکھی گئیں، ہندو مؤرخین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔

مگر بڑے افسوس کے ساتھ عرض کیا جاتا ہے کہ آج پوری دنیا میں مسلمان اقلیتوں کے ساتھ نامنصفانہ رویہ اختیار کیا جاتا ہے اور مغربی معاشرہ میں ''اسلاموفوبیا'' کی ایسی مہم برپا کی گئی ہے کہ ہر شخص اسلام اور مسلمانوں سے خوف زدہ ہو جائے اور اسلامی شعائر وعلامات سے لوگوں کے دلوں میں نفرت بیٹھ جائے، جو ممالک جمہوریت وسیکولرزم کا نام لیتے ہیں اور اپنے آپ کو حقوقِ انسانی کا علمبردار کہتے ہیں، ان کے یہاں حال یہ ہے کہ مذہبی شعائر اور مذہبی شخصیتوں کے احترام میں امتیاز برتا جاتا ہے، انبیاء بنی اسرائیل کی توہین تو قانوناً ممنوع ہے اور یقینا ہونی چاہئے؛ لیکن پیغمبر اسلام اور دوسرے مذاہب کے پیشواؤں کے معاملہ میں گستاخانہ رویہ کو اظہارِ خیال کی آزادی کا نام دیا جاتا ہے، لوگوں کو بے لباس تو چلنے کی اجازت ہے؛ لیکن مسلمان عورت کو حجاب یا نقاب پہننے اور مردوں کو داڑھی رکھنے کی اجازت نہیں ہے، یہاں تک کہ مسجد کے مینارے بھی ان کی آنکھوں کا تیر بن گئے ہیں، کیا یہی انسانی حقوق کی پاسداری ہے اور یہی اقلیت کے حقوق کی رعایت ہے؟ پھر ہمارے ملک ہندوستان میں صورت حال یہ ہے کہ ممبئی کے فرقہ وارانہ فسادات میں جو مسلمان مارے گئے، ان کے سلسلہ میں سری کرشنا رپورٹ کو دبا دیا گیا اور کوئی کارروائی نہیں ہوئی؛ حالاں کہ اس کے ردعمل میں ہونے والے بم بلاسٹ کے مرتکبین کو کیفرِ کردار تک پہنچایا گیا، ہم ان کے خلاف کارروائی کے مخالف نہیں ہیں؛ لیکن انصاف کے دو پیمانے نہیں ہونے چاہئیں، بابری مسجد دوپہر کی دھوپ میں اور الیکٹرانک میڈیا کے سامنے شہید کی گئی اور مسجد پر حملہ کرنے والوں کی تصویریں بھی شائع ہوئیں

اور اس جرم میں شریک ہونے والوں نے علی الاعلان اس کا اعتراف کیا اور اس پر فخر کا اظہار بھی کیا ؛ لیکن اس پر کوئی کارروائی نہیں ہوئی، گودھرا کے واقعہ میں ملوث لوگوں پر تو بلا تحقیق جنگل کا قانون ''پوٹا'' نافذ کیا گیا؛ لیکن گجرات میں شہید ہونے والے دو ہزار مسلمانوں کی آہ کسی نے نہیں سنی اور حکومت نے اس پر کوئی کارروائی نہیں کی ، یہ ایک واضح مثال ہے مسلمان اقلیت کے حقوق کو تلف کرنے کی اور مظلوم کو ظالم کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کی ، جس پر آج مغرب سے مشرق تک پوری دنیا کا عمل ہے۔

حضرات ! اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا عصر حاضر میں پیدا ہونے والے فقہی مسائل کو حل کرنے ، نوجوان نسل کی علمی وفکری تربیت کرے اور اس دور میں پیدا ہونے والے سماجی ، اقتصادی اور سیاسی مسائل میں رہنمائی کے لئے کوشاں ہے، اس نے اب تک اٹھارہ سیمینار کئے ہیں ، جس میں تقریباً ڈیڑھ سو فقہی فیصلے کئے گئے ، ان سیمیناروں سے ہٹ کر تربیتی وفکری نوعیت کے چوبیس پروگرام منعقد کئے جاچکے ہیں ، اہم علمی وفقہی موضوعات پر تقریباً سو کتابیں شائع ہو چکی ہیں ، کویت سے شائع ہونے والی عظیم الشان فقہی انسائیکلو پیڈیا ''الموسوعۃ الفقہیۃ'' کی پوری پینتالیس جلدوں کا اُردو میں ترجمہ کیا گیا ہے ہے اور اکیڈمی کے سیمیناروں میں پیش ہونے والے مقالات کے تقریباً تیس مجموعے شائع ہو چکے ہیں ، جو اُردو زبان میں نئے مسائل پر ہونے والی فقہی کاوشوں کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ نہ صرف ملک میں ؛ بلکہ بیرونِ ملک بھی اکیڈمی کی علمی و تحقیقی کاوشوں کو قدر وقعت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔

حضرات ! اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ سیمینار ہے، اس وقت پوری دنیا میں اقلیتوں کے حقوق زیر بحث ہیں ، اقوام متحدہ بھی اس سلسلہ میں مختلف فیصلے کرتی اور رکن ممالک کو توجہ دلاتی رہی ہے ؛ کیوں کہ جمہوری نظام میں اگر اکثریت انصاف کا دامن چھوڑ دے اور اپنی عددی طاقت کا ہتھیار ظلم و جبر کے لئے استعمال کرنے لگے ، تو پھر یہ جمہوریت اکثریت کی آمریت اور استبداد کا روپ اختیار کر لیتی ہے اور اقلیت کے لئے اپنی شناخت کو باقی رکھنا دشوار ہو جاتا ہے ؛ بلکہ کسی قوم کا غالب حصہ اگر کم تعداد اقلیت پر ظلم و زیادتی کے لئے کمربستہ ہو جائے تو اس کا زخم شخصی آمریت اور استبداد سے بھی زیادہ گہرا ہو جاتا ہے اور اقلیت نہ صرف دکھ اُٹھاتی ہے ؛ بلکہ اس کی مصیبت پر آنسو بہانے والی کوئی آنکھ بھی میسر نہیں ہوتی ، اس وقت دنیا کے مختلف ملکوں میں مسلمان اور دوسری مذہبی ، لسانی اور جغرافیائی اقلیتیں اسی صورتِ حال سے دو چار ہیں ، انشاء اللہ یہ سیمینار اقلیتوں کے حقوق کو

واضح کرنے ، اس نسبت سے اکثریت کے ضمیر کو جھنجھوڑنے ، نیز اقلیتوں کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کو پیش کرنے میں مفید و معاون ثابت ہوگا، خدا کرے یہ سیمینار ان مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو۔

وباللہ التوفیق وھو المستعان۔

●●●

اسلام کا سیاسی نظام☆

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين ، وعلى آله وأصحابه اجمعين ، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين۔

صدر عالی قدر، علماء کرام، دانشوران ذی احترام اور اساتذہ وطلباء! اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ایسی جاندار اور ذی شعور مخلوق بنایا ہے، جس کی فطرت میں تمدن ہے، اس کی ضروریات ایک دوسرے سے متعلق ہیں اور اس کے مزاج میں یہ بات داخل ہے کہ وہ مختلف لوگوں کے ساتھ مل کر زندگی گذارے اور مسائل کو حل کرے، مسائلِ زندگی کی تنظیم کے بنیادی طور پر دو دائرے ہیں، ایک دائرہ اپنے گھر اور خاندان کا ہے، اس کی تنظیم کو علماء فلسفہ نے 'تدبیر منزل' سے تعبیر کیا ہے، دوسرا دائرہ ایک پورے شہر یا ملک کو شامل ہے، جس کی تنظیم کو 'سیاست مدن' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ کہنا دشوار ہے کہ انسانی تمدن میں پہلی بار کوئی سلطنت کب وجود میں آئی اور کسی سیاسی نظام نے کب عملی شکل اختیار کی؛ لیکن زمانۂ قدیم سے سیاست کو ایک علمی وفنی شکل دینے کی جو کوشش ہوتی رہی ہے، اس کا سراغ ضرور ملتا ہے اور اس سلسلے میں سب سے پہلے 'سقراط' کا نام لیا جاتا ہے، جس نے گرچہ اس موضوع پر قلم نہیں اُٹھایا؛ لیکن اس نے اپنے شاگرد 'افلاطون' کو زبانی تعلیم دی، پھر افلاطون نے اپنے استاذ کی فکر کو لے کر اور اس میں اپنے افکار کا اضافہ کر کے ''جمہوریہ'' (Republic) تالیف کی، جو چار سو سال قبل مسیح کی کتاب بتائی جاتی ہے اور جسے سیاست کے موضوع پر اولین کتاب مانا گیا ہے، پھر افلاطون کے شاگرد ارسطو آئے اور اپنے استاذ کے سائنسی اور فکری افادات کو مختلف شعبوں میں مرتب کیا، جس میں ایک کتاب سیاست کے موضوع پر ''سیاست'' ہی کے نام سے ہے، اس لئے علم سیاست کے ماہرین قریب قریب اس پر متفق ہیں کہ علم سیاست پر بعد میں جو کچھ لکھا گیا یا سوچا گیا، اس کا سرچشمہ افلاطون اور خاص طور سے ارسطو کی یہی تالیف ہے۔

☆ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ قانون کے اشتراک سے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے ''اسلام کا سیاسی نظام'' کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد کیا تھا، یہ اس کا کلیدی خطبہ ہے۔

یہ بات اس لحاظ سے تو قابل تسلیم ہے کہ خاص اس موضوع پر جو قدیم ترین فکری ماخذ اہل علم کے سامنے موجود ہے، وہ یہی ہے؛ لیکن یہ سمجھنا درست نہیں ہوگا کہ اس سے پہلے انسان علم سیاست سے بالکل بے بہرہ تھا؛ کیوں کہ پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام ہی سے وحی کا نزول شروع ہو چکا تھا، انبیاء پیدا ہوتے رہے اور آسمانی کتابیں بھیجی جاتی رہیں، اللہ کی طرف سے انسان کو جو دین عطا کیا گیا ہے، وہ زندگی کے تمام انفرادی واجتماعی مسائل کا احاطہ کرتا رہا ہے، ان آسمانی کتابوں میں قدیم زمانہ سے بہت سے عادل اور ظالم حکمرانوں کا بھی ذکر آیا ہے، بعض ایسے فرمانرواؤں کا بھی ذکر آیا ہے، جن کو اللہ کی طرف سے حکومت کی ذمہ داری سونپی گئی، گرچہ انسانی زندگی کے اس طویل دورانیہ میں نظام حکومت کی تفصیل نہیں ملتی؛ لیکن حکومتوں کا وجود اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس دور میں بھی کوئی نظام ضرور موجود تھا اور یقیناً ان آسمانی کتابوں اور پیغمبروں کے ذریعہ نظام سیاست سے متعلق اساسی افکار اور بنیادی خدوخال واضح کئے گئے ہوں گے۔

دنیا میں اس وقت جو مذاہب موجود ہیں، ان میں سے اکثر پر ایک ایسا دور گذر چکا ہے، جب سیاست کو مذہب کے تابع بنا دیا گیا تھا، مگر بدقسمتی سے اس کو زیادہ تر مذہبی گروہوں نے عوام کے استحصال کے لئے استعمال کیا، ہندوستان میں ذات پات کی بنیاد پر تفریق کا اصل مقصد یہی تھا کہ چھتری عوام پر حکومت کریں، برہمن ان حکمرانوں کے حکمراں ہوں اور بقیہ لوگوں کا کام خدمت کرنا ہو، اس طرح برہمن پوری قوم کا استحصال کیا کرتے تھے اور انھوں نے مذہب کو آلۂ کار بنا کر اپنے لئے تقدس اور تفوق کا مقام حاصل کر لیا تھا، یہودی ربّیوں کا حال یہ تھا کہ جن علوم کے بارے میں تورات میں صراحت موجود نہیں ہوتی، وہ ان میں اپنے مفادات کے مطابق قانون بناتے اور اس کی نسبت خدا کی طرف کرتے کہ ''یہووا'' (خدا) نے انھیں بتایا ہے، عیسائیت میں مذہبی رہنماؤں نے بتدریج اپنی ایک متوازی حکومت قائم کر لی تھی، وہ ایک طرف حکمرانوں کے واسطہ سے عوام پر حکومت کرتے تھے، دوسری طرف لوگوں سے مغفرت نامے فروخت کرتے تھے، یہاں تک کہ کلیسا اور حکومت کی وہ سرد جنگ پیش آئی، جو بالآخر کلیسا کی شکست پر منتج ہوئی، اسی پس منظر میں قرآن مجید نے کہا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے علماء کو رب کا درجہ دے دیا ہے: ''**اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللهِ**''۔ (التوبۃ: ۳۲)

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اُمت محمدیہ دنیا میں وہ واحد مذہبی گروہ ہے، جس کے پاس محفوظ شکل

میں آسمانی کتاب بھی موجود ہے اور نبی کا اُسوہ بھی، جو زندگی کے دوسرے مسائل کی طرح نظام سیاست کے بارے میں بھی ہماری رہنمائی کرتا ہے، اسلام نے ہمیں دو بنیادی تصورات دیئے، اول یہ کہ اصل میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کا حق ہے: ''إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ'' (الانعام: ۵۷) اور اس کی وجہ بھی بتائی گئی کہ انسان سمیت اس کائنات کا خالق اللہ ہے اور جو خالق ہوگا؛ چوں کہ وہ اپنی تمام مخلوقات کے نفع وضرر اور مصالح ومفاسد سے واقف بھی ہوگا؛ اس لئے وہی اس لائق ہوسکتا ہے کہ ان کے لئے احکام بھی جاری کرے: ''أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ''۔ (الاعراف: ۵۴)

اسی لئے قرآن مجید میں حکمراں کو 'خلیفہ' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا؛ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا: ''إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ'' (ص: ۲۶) یہاں خلیفہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ کی زمین پر اللہ کے احکام کو نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ کے نائب ہیں؛ پس اسلام کی نظر میں قانون کا اصل سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، ہاں! جن احکام کے بارے میں کتاب وسنت میں کوئی ہدایت نہیں ملتی یا جن احکام کا تعلق ملک کے انتظامی اُمور سے ہے، ان میں انسان کے لئے قانون سازی کی گنجائش ہے؛ بشرطیکہ وہ شریعت کے بنیادی اُصول ومقاصد کے موافق ہو، اس سے متصادم نہ ہو، یہاں تک کہ قرآن کے بیان کے مطابق اللہ کے نبیوں اور پیغمبروں کو بھی، اپنی طرف سے کسی بات کو حلال وحرام کرنے کا حق نہیں تھا: ''لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ''۔ (التحریم: ۱)

بہ قول شاعر حق شناس علامہ اقبالؒ :

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی ، باقی بتانِ آزری

دوسرے: شریعت اسلامی میں حکومت کا مقصود صرف یہی نہیں ہے کہ ملک کے تمام شہریوں کو ایک نظم کے تحت لے آیا جائے، عوام کے لئے معاشی وسائل فراہم کئے جائیں، امن وامان قائم کیا جائے اور ملک کی سرحدوں کی حفاظت کی جائے؛ بلکہ اسلامی حکومت کا بنیادی مقصد بھلائیوں کی ترویج اور برائیوں کا سدباب ہے :

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۔ (الحج: ۴۱)

نیکی کی ترویج اور برائی کی روک تھام میں ایک حکمراں کے لئے بنیادی اہمیت عدل وانصاف قائم کرنے کی ہے؛ چنانچہ حضرت داوٗد علیہ السلام سے فرمایا گیا کہ انھیں خلیفہ اس لئے بنایا جارہا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کریں:

يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ۔ (صٓ:۲۶)

رسول اللہ ﷺ نے اس کا عملی نمونہ پیش فرمایا، عرب کی ایک معزز خاتون کے خلاف آپ نے چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ دیا، بعض رفقاء نے ایک معزز قبیلہ سے تعلق رکھنے کی بنا پر سزا کی تبدیلی کے لئے سفارش کی تو آپ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: خدا کی قسم! اگر بالفرض فاطمہؓ بنت محمد ﷺ نے بھی چوری کی ہوتی تو اس پر بھی یہی سزا نافذ کی جاتی: ''**واللہ لو أن فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها**''۔(بخاری، قبیل کتاب المناقب، حدیث نمبر:۳۴۷۵)

غرض کہ اسلام کے نظام سیاست میں حکومت کا بنیادی مقصد احکام خداوندی کو نافذ، عدل قائم کرنا، ظلم کو روکنا، بھلائیوں کو رواج دینا اور برائیوں کو مٹانا ہے؛ چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ:''**وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُم بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ**''۔(المائدۃ:۴۲)

حضرات! یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ اگر چہ کہ قرآن وحدیث اور خلفاء راشدین کے طرز عمل میں ایک عادل حکومت کے لئے واضح اُصول اور بہترین معیارات کی نشاندھی کردی گئی ہے؛ لیکن اسلام کا معیاری نظام خلافت رسول اللہ ﷺ کے بعد تیس سال کے مختصر عرصہ سے زیادہ نہیں رہ سکا؛ اگرچہ بہت سے منصف مزاج اور خدا ترس سلاطین بھی پیدا ہوئے اور انھوں نے بڑی حد تک قرآن وحدیث کے منشاء کے مطابق حکومت کرنے کی کوشش کی؛ لیکن خزاں کے درمیان بہار کے یہ جاں فزا جھونکے ایک مستحکم سیاسی نظام کا نتیجہ نہیں تھے؛ بلکہ شخصی صلاح اور اخلاقی تعلیمات سے متاثر ہونے کا اثر تھا؛ اسی لئے ایسے بہت سے عدل پرور حکمراں گذرے ہیں کہ جن کے جانشیں اسی درجہ ظالم وجابر واقع ہوئے تھے۔

اس کا دوسرا نقصان یہ ہوا کہ نظام سیاست کے بارے میں فقہی کاوشیں بھی نسبتاً کم انجام پائیں، جہاں ہمیں عبادات کے موضوع پر بے شمار کتابیں ملتی ہیں اور خاندانی نظام اور مالی معاملات

کے بارے میں دقت نظر کے ساتھ تمام امکانات پر غور کیا گیا ہے اور ان ممکنہ صورتوں سے متعلق احکام متعین کئے گئے ہیں ، وہیں نظام سیاست پر بمشکل انگلیوں پر گنی جانے والی چند کتابیں ملتی ہیں ، اور اس شعبہ سے متعلق فقہاء کے اجتہادات میں تسلسل نہ پائے جانے کی وجہ سے مختلف گوشوں میں تشنگی کا احساس بھی ہوتا ہے ۔

حضرات ! شریعت اسلامی میں سیاسی نظام کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ شریعت کے بہت سے احکام کا نفاذ ایک اسلامی حکومت کے وجود پر موقوف ہے ، نہ صرف حدود و تعزیرات ، نظام قضاء ، احتساب ، دفع مظالم ، مذہبی اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ ، بین قومی تعلقات وغیرہ جیسے اہم اُمور حکومت سے متعلق ہیں ؛ بلکہ عبادات میں بھی حکومت کو بہت کچھ دخل ہے ، جمعہ وعیدین کی نمازیں اذنِ سلطان کے ساتھ مشروط ہیں ، رمضان وعید اور حج کے لئے رؤیت ہلال کا اعلان سلطان یا اس کا نمائندہ کرے گا ، اموال ظاہرہ جانوروں وغیرہ کی زکوٰۃ اور عشر وصول کرنا حکومت کا حق ہے ، حج سلطان یا اس کے نائب کی امارت میں انجام دیا جائے گا ، نماز اور نماز جنازہ کی امامت کا اولین مستحق سلطان ہے ، اوقاف کی تولیت ، نکاح کی ولایت اور زوجین میں تفریق وغیرہ کی ذمہ داری بھی بعض صورتوں میں سلطان سے متعلق ہوگی ، غرضیکہ نہ صرف سلطنت کے انتظام ، تعزیرات کے نفاذ ، دفاع ، خارجہ تعلقات اور داخلی امن وسلامتی وغیرہ میں حکومت کا بنیادی رول ہے ؛ بلکہ عبادات اور خاندانی زندگی میں بھی حکومت کا دخل ہے ، ان سب کے باوجود چوں کہ عملی طور پر اسلامی خلافت کو پنپنے کا موقع نہیں ملا اور نظام سیاست کی جزئیات پر کام کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی ، اس لئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان فقہاء نے اس جانب نسبتاً کم توجہ دی ، ضرورت ہے کہ موجودہ دور کے علماء اس کمی کی تلافی کریں اور عصر حاضر کے تناظر میں ایک آئیڈیل اسلامی نظام کا عملی خاکہ پیش کریں ۔

جب رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی ، اس وقت دنیا پر بادشاہی کا نظام مسلط تھا ، جزیرۃ العرب کے چاروں طرف روم وایران اور یمن میں یہی نظام کارفرما تھا ، اس کے علاوہ اس عہد میں جن ملکوں کی تاریخ ملتی ہے ، جیسے ہندوستان اور چین ، وہاں بھی یہی شاہی نظام قائم تھا ، اسلام نے ملوکیت کے اس نظام کو قبول نہیں کیا اور خلافت کا تصور پیش کیا ، جس میں توارث کی بنیاد پر حکمرانی کا استحقاق تسلیم نہیں کیا گیا ؛ بلکہ لیاقت ، اخلاق وکردار اور عام مسلمانوں کے انتخاب کی بنیاد پر خلیفہ منتخب کئے جانے

کا حکم دیا گیا، خود رسول اللہ ﷺ نے قیصر و کسریٰ کی سنت پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور ملوکیت کے تصور کو ختم کرنے کے لئے نہ آپ نے اپنے خاندان کے کسی فرد کو آئندہ کے لئے خلیفہ نامزد فرمایا اور نہ کسی اور رفیق کو، آپ ﷺ نے بعض اشارے ضرور دیئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نماز کی امامت پر مقرر فرمایا، مگر آپ ﷺ نے صریح ہدایت نہیں دی اور اس کو اپنے رفقاء کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد صحابہ کے مشورہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نامزد فرمایا تھا؛ لیکن اپنی اولاد میں سے کسی کو اس ذمہ داری پر مقرر نہیں کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے بعض لوگوں نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو سربراہ حکومت بنانے کا مشورہ بھی پیش کیا؛ کیوں کہ وہ ورع وتقویٰ میں امتیازی شان رکھتے تھے؛ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے قبول نہیں فرمایا اور چھ افراد کے نام پیش کئے کہ مسلمان ان میں سے کسی کو اپنا امیر منتخب کرلیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اکابر صحابہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی، حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو آئندہ کے لئے حکمراں نامزد کر سکتے تھے اور وہ اپنی شرافت اور نسبی وجاہت کے اعتبار سے اکابر صحابہ کے لئے سب سے زیادہ قابل قبول بھی تھے؛ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسا نہیں کیا اور آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد لوگوں نے اپنی مرضی سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی، غرض کہ تمام خلفاء راشدین کا اُسوہ یہی رہا ہے کہ انھوں نے اپنے بعد اپنی اولاد میں سے کسی کو جانشیں مقرر نہیں فرمایا، اس طرح یہ بات واضح کردی گئی کہ اسلام میں ملوکیت کا نظام قابل قبول نہیں ہے، علامہ ابن حزم نے لکھا ہے کہ اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ حکمرانی میں توارث جائز نہیں: ''**ولا خلاف بین أحد من أهل الإسلام فی أنه لا یجوز التوارث فیها**''۔ (**الفصل فی الملل والنحل**: ۵؍ص: ۱۲، **قبیل ''الکلام فی عقد الامامة بماذا یصح''**)

بعض حضرات کو غلط فہمی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کو حکمراں بنایا، اس سے ملوکیت کا جواز معلوم ہوتا ہے؛ لیکن ظاہر ہے کہ امر الٰہی پر امر انسانی کو قیاس نہیں کیا جاسکتا، حضرت سلیمان علیہ السلام کو حضرت داؤد علیہ السلام نے حکمراں نامزد نہیں کیا تھا؛ بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے اس منصب پر فائز فرمایا تھا، اس کے علاوہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی لیاقت کے اعتبار سے بھی تمام لوگوں پر فائق تھے؛ کیوں کہ وہ نبی تھے اور نبی علم وفضل اور عمل واخلاق کے اعتبار سے تمام لوگوں پر فائق ہوتا ہے اور اس کی حیثیت زمین پر اللہ کے نمائندہ کی ہوتی ہے۔

اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد چھ افراد کو جو

نامزد فرمایا، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیشہ نامزدگی کے ذریعہ حکمراں منتخب کیا جائے، اگر اس نامزدگی میں توارث نہیں ہو، تب بھی اس سے آمریت جنم لیتی ہے، اس وقت دنیا میں جتنے امراء اور ڈکٹیٹر موجود ہیں، سب ایسے ہی ہیں کہ یا تو انھوں نے اپنے کسی قرابت دار سے اقتدار حاصل کیا ہے یا انھیں سابق حکمراں فوج یا خود ساختہ حکمرانوں کی ٹولی نے کرسئ اقتدار پر فائز کیا ہے، پھر تاریخی روایات کا جائزہ لیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے صرف اپنی رائے سے حضرت عمرؓ کو نامزد نہیں کیا؛ بلکہ صحابہ کے مشورہ سے کیا اور صرف اس نامزدگی کی وجہ سے نامزد شخص کو خلافت حاصل نہیں ہوئی، اگر ایسا ہوتا تو بیعت کی ضرورت نہیں پڑتی؛ بلکہ جب حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھوں پر بیعت کی گئی، تب وہ خلیفہ قرار پائے، گویا نامزدگی کی حیثیت مشورہ کی تھی نہ کہ واجب الطاعۃ حکم کی؛ کیوں کہ کسی امیر کا حکم اس کی زندگی میں ہی واجب العمل ہوتا ہے، اس کی وفات کے بعد واجب العمل باقی نہیں رہتا: ''**إن إمامة معهود إليه تنعقد بعد موته باختيار أهل الوقت**''۔ (الاحکام السلطانیۃ لأبی یعلی: ۲۶)

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت اسلام کے سیاسی تصورات سے ہم آہنگ نہیں ہے؛ البتہ امن عامہ اور روزمرہ کے مسائل کے حل کے لئے نظم مملکت کا قائم رہنا ضروری ہوتا ہے؛ ورنہ معاشرہ بدامنی اور شر وفساد کا شکار ہوجائے گا، اس لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص زور زبردستی سے اقتدار پر مسلط ہوجائے اور اس کے خلاف بغاوت کرنے کی صورت میں اندیشہ ہو کہ یہ مہم ناکام ہوجائے گی اور اس سے مزید فتنہ وفساد پھیلے گا تو ایسی صورت میں اس اقتدار کو تسلیم کر لینے کی گنجائش ہے، اسی کو بعض فقہاء نے 'امارت قاہرہ' سے تعبیر کیا ہے، اسی بنیاد پر علماء نے بادشاہوں کی اطاعت کی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ آئیڈیل طرز حکومت ہے اور اسلام کی نظر میں قابل قبول ہے؛ بلکہ اس کا منشاء صرف ایک ضرورت کی تکمیل اور فتنہ وفساد کو روکنا ہے، اس کی بنیاد پر زور زبردستی سے لائی گئی ملوکیت یا آمریت کو جائز نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

حضرات ! موجودہ دور میں جو سیاسی نظام سکہ رائج الوقت بن چکا ہے، جسے مقبول نظام حکومت کا درجہ حاصل ہے اور جو اس وقت عالم اسلام اور عالم عرب پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے مرحلہ میں ہے، وہ ہے جمہوریت، یہ یقیناً اسلام کے سیاسی نظام سے چند جہتوں میں بے حد مختلف ہے، اول یہ کہ اس نظام میں کسی اُمیدوار کے صرف عددی اکثریت حاصل کرنے کو ہی کافی سمجھا جاتا ہے؛

لیکن اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کسی ذمہ داری کے حوالہ کئے جانے میں ضروری ہے کہ وہ اس کا اہل بھی ہو، اور اہلیت میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، ایک یہ کہ وہ مفوضہ کام کی صلاحیت رکھتا ہو، صاحب علم و دانش ہو، دوسرے اس سے اپنی ذمہ داریوں کے بارے امانت و دیانت کی اُمید رکھی جاسکتی ہو: ''إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِيْنُ'' (القصص:۲۶) اور حکمراں بھی اپنی ذمہ داری کے اعتبار سے رعایا کا اجیر ہی ہوتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِيْنَ'' (البقرۃ:۱۲۴) پس اسلامی نظام میں یہ ضروری ہے کہ حکمرانوں اور عوامی نمائندوں کے لئے علم و عمل اور اخلاق و کردار کے اعتبار سے ایک معیار مقرر ہو، صرف 51% تائید حاصل کرلینا کافی نہیں۔

دوسرا اہم فرق یہ ہے کہ جمہوری نظام میں ایک شخص اپنے آپ کو اُمیدوار بناتا ہے؛ لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے اپنے آپ کو عہدہ و اقتدار کے لئے اُمیدوار بنانا جائز نہیں، رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع کیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ جو عہدہ کا اُمیدوار ہوگا، اسے میں عہدہ نہیں دوں گا۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ جمہوریت میں قانون کا سرچشمہ عوام کو مانا گیا ہے، مثلاً اگر 51% فیصد عوام چاہتے ہوں کہ شراب کے کارخانے بنائے جائیں اور شراب پر کوئی پابندی نہ ہو تو شراب کی تمام تر اخلاقی اور طبعی مضرتوں کے باوجود اس کی اجازت دی جائے گی، اسلام کی نظر میں قانون کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، انسان کا کام قانون کی تشریح و توضیح ہے نہ کہ قانون سازی؛ اس لئے کتاب وسنت کے مقابلہ میں کوئی قانون سازی نہیں ہوسکتی۔

تاہم جمہوری نظام چوں کہ ایک بندھا، ٹکا اور متعین و محدود نظام نہیں ہے؛ بلکہ مختلف ملکوں نے اپنے اپنے مصالح اور عوامی رجحانات کے اعتبار سے اس کو اختیار کرنے میں فرق بھی کیا ہے؛ اس لئے اسے اسلام سے ہم آہنگ بھی کیا جاسکتا ہے، مثلاً سربراہوں اور پارلیمنٹ کے ممبروں کے لئے ایک معیار مقرر کیا جاسکتا ہے کہ اس معیار کے حامل لوگ ہی منتخب کئے جاسکتے ہیں، ایسا ہوسکتا ہے کہ لوگ خود اپنے آپ کو اُمیدوار نہ بنائیں، پارٹیاں ان کو اُمیدوار بنائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ دستور میں کتاب وسنت کو بنیاد قرار دیتے ہوئے پارلیمنٹ کو صرف ایسے اُمور میں قانون سازی کی اجازت دی جائے، جو انتظام و انصرام سے متعلق ہوں نہ کہ حلال و حرام سے، اس طرح یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ موجودہ جمہوری نظام اسلام کے تصور خلافت سے قریب تر ہے، آج اگر کسی خطہ میں اسلامی طرز حکومت کو وجود میں لانے کا موقع میسر ہو تو اس کی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ رائے عامہ سے شوریٰ کے

ارکان منتخب ہوں اور یہ ارکان سربراہ حکومت کا انتخاب عوامی نمائندوں کی حیثیت سے کریں یا یہ کہ عوام شوریٰ کے لئے ارکان کا بھی انتخاب کریں اور براہ راست صدر مملکت کا بھی ؛ تاکہ ملوکیت اور آمریت کے چنگل سے عالم اسلام کو آزادی نصیب ہو۔

حضرات ! اسلام کے نظام سیاست سے مربوط بعض مسائل فقہی نوعیت کے ہیں، جن پر موجودہ حالات کے تناظر میں غور کرنے کی ضرورت ہے اور علماء کو چاہئے کہ ایک ایسے وقت میں جب کہ عالم اسلام میں انقلاب کی لہریں موجزن ہیں، ان کو فرضی مسئلہ تصور نہ کریں، ان پر گہری بصیرت کے ساتھ غور کریں اور وہ احکام جو کسی خاص زمانہ کے احوال اور مصالح کے تناظر میں فقہاء نے دیئے ہیں، بدلے ہوئے حالات میں شریعت کے بنیادی مقاصد اور اُصول کو سامنے رکھ کر ان کے بارے میں فیصلہ کریں۔

جیسے سربراہ مملکت کے قریشی ہونے کا مسئلہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے بے شک فرمایا ہے : ''**الأئمة من قريش**'' لیکن اس میں اختلاف رہا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی تھی کہ قریش ایک عرصہ تک سربراہِ مملکت ہوتے رہیں گے یا یہ ارشاد بطور حکم کے تھا؟ اور اگر یہ حکم کے طور پر تھا تو یہ ایک خاص مصلحت کے تحت وقتی حکم تھا؛ کیوں کہ عربوں میں قریش کو تفوق کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور اس وقت قریشیوں کے علاوہ کسی اور کی قیادت پر لوگ متفق نہیں ہوسکتے تھے، یا قیامت تک کے لئے یہی حکم ہے؟ یہ بات قابل غور ہے؛ کیوں کہ ہمیں حضور ﷺ کا یہ ارشاد بھی ملتا ہے کہ اگر کوئی ناک کٹا حبشی غلام بھی تم پر امیر بنا دیا جائے تو اس کی بھی اطاعت کرو، اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت اظہار حسرت کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ اس وقت زندہ ہوتے تو میں انھیں خلیفہ بنا دیتا اور ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام سالم رضی اللہ عنہ ہوتے تو انھیں خلیفہ بنا دیتا؛ حالاں کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ انصار میں تھے اور سالم موالی میں، نیز عباسیوں اور فاطمیوں کے بعد عجمی نژاد فرماں روا ہوئے اور سبھوں نے ان کی خلافت کو تسلیم کیا؛ اسی لئے فقہاء نے قریشی ہونے کی شرط کو مختلف فیہ قرار دیا ہے اور خود امام ابوحنیفہؒ کا ایک قول نقل کیا گیا ہے کہ ان کے نزدیک قریشی ہونا شرط کے درجہ میں نہیں تھا: ''**لا يشترط في صحة تولية السلطان أن يكون قريشياً**''۔ (شرح الحموی علی الأشباہ والنظائر: ۲/ ۲۶۶، الفن الثالث)

موجودہ دور میں لوگوں کی سوچ گذشتہ ادوار سے بالکل مختلف ہوگئی ہے، یعنی اُس زمانہ میں حکمرانوں کو قبول کرنے کے لئے خاندانی نسبت کو بے حد اہمیت حاصل تھی؛ لیکن ہمارے اِس عہد میں

حکمرانی کو کسی خاندان میں محدود کردینا لوگوں کے لئے نا قابل قبول ہے۔

دوسرا مسئلہ مدتِ حکومت کی تحدید کا ہے، خلافتِ راشدہ کے عہد میں جن شخصیتوں کو امیر منتخب کیا گیا، وہ تا وفات اپنی اس ذمہ داری پر قائم رہے، اگر واقعی ابوبکر وعمر، عثمان وعلی رضی اللہ عنہم جیسے لوگ اُمت کو ہر دور میں ملتے رہیں تو ان کی حیات کتنی بھی دراز ہو، اُمت کے لئے ان کی امارت قائم رہنے میں ہی خیر ہے؛ لیکن ہر حکمراں کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی، عام طور پر اقتدار کا تسلسل مزاج میں بگاڑ پیدا کردیتا ہے، قرآن مجید میں جن ظالم حکمرانوں کا ذکر آیا ہے، ان کا معاملہ یہی تھا کہ طویل حکمرانی کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو عوام کا مالک یہاں تک کہ 'خدا' تصور کرنے لگے تھے، موجودہ دور میں کسی شخص کو پوری زندگی کے لئے فرماں روا بنادیا جائے تو ظن غالب یہی ہے کہ وہ اپنے عہد کے حسنی مبارک، معمر قذافی، بشارالاسد اور صدام حسین بن جائیں اور پوری قوم کو اپنی زرخرید ملکیت تصور کرنے لگیں؛ اس لئے موجودہ عہد میں عوامی نمائندوں اور منتخب سربراہوں کے لئے بھی مدت کی تحدید ضروری ہے، اسکی فقہی اصل یہ ہے کہ اصل میں حکمراں کی حیثیت عوام کے وکیل کی ہوتی ہے، عوام انھیں انتظامی اُمور کی ذمہ داری سونپتے ہیں — اسی بنیاد پر امیر کو ولایت عامہ حاصل ہوتی ہے — اور مؤکل کو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ اپنے وکیل کے لئے ایک مدت کار مقرر کردے یا اس کے اختیارات کی تحدید کردے۔

اسی طرح ایک مسئلہ 'صدرِ مملکت' کے اختیارات کا بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے امیر کو لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا ہے: ''وَشَاوِرْهُمْ فِي الأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ'' (آل عمران:۱۵۹) لیکن مشورہ کی کیا حیثیت ہوگی، امیر مشورہ کا پابند ہوگا یا خود فیصلہ کرے گا؟ اس کی وضاحت نہیں کی گئی، ایسی مثالیں بھی مل جاتی ہیں کہ امیر نے تنہا اپنے مشورہ پر عمل کیا ہے، جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مانعین زکوٰۃ سے جہاد کرنا، اور ایسی مثال بھی موجود ہے کہ امیر نے اپنے آپ کو اکثریت کے مشورہ کا پابند رکھا جیسا کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے نوجوانوں کی رائے پر مدینہ سے باہر نکل کر جہاد کرنے کا فیصلہ کیا۔

عام طور پر فقہاء کا رجحان یہی محسوس ہوتا ہے کہ امیر شوریٰ کے مشورہ کا پابند نہیں ہے؛ یہ کہنا مشکل ہے کہ فقہاء کی یہ رائے مجبور کن حالات پر مبنی تھی؛ کیوں کہ اس زمانہ میں حکمراں باضابطہ کوئی شوریٰ رکھتے ہی نہیں تھے، جس کے مشورہ پر عمل ہو، اور بادشاہ کے منشاء کے خلاف کوئی مشورہ پیش

کرنے میں بھی جان کا جوکھم ہوتا تھا، یا ان کے یہاں بنیادی حکم ہی یہی تھا؛ لیکن بہر حال موجودہ دور میں کسی فرماں روا کو ایسا مطلق العنان بنا دینا قوم کے گلے میں غلامی کا طوق پہنا دینے کے مترادف ہوگا، جس کا تجربہ خلافت راشدہ کے بعد مسلم حکومتوں کی طویل تاریخ میں کیا جا چکا ہے، جہاں امارت نے آمریت کی شکل اختیار کر لی اور جس کے منفی اثرات آج بھی مسلم ملکوں میں دیکھے جا سکتے ہیں؛ اس لئے جیسے دوسرے معاملات میں مؤکل اپنے وکیل کے اختیارات کو محدود کر سکتا ہے، اس معاملہ بھی اس کی گنجائش ہونی چاہئے کہ سربراہ مملکت کے اختیارات کو محدود رکھا جائے اور وہ عوام کے منتخب نمائندوں کے مشورہ کا پابند رہے۔

ایک اہم اور قابل غور مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے فقہاء تو پوری دنیا میں ایک ہی خلیفہ اور امیر کا تصور رکھتے تھے، یعنی مسلم مملکت کی حدود چاہے دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ جائیں؛ لیکن وہ ایک ہی حکمراں کے تحت رہیں گے، اسلام کے قرن اول میں مسلمانوں کی حکومت ایشیاء سے نکل کر یورپ و افریقہ تک پہنچ چکی تھی؛ لیکن یہ وسیع و عریض مملکت ایک ہی فرماں روا کے زیر سایہ قائم تھی اور اب تو مواصلات اور ابلاغ کے ذرائع اس قدر ترقی کر گئے ہیں کہ یہ بات نسبتاً آسان ہوگئی ہے۔

تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غالباً عباسی دور سے ہی مملکت اسلامیہ کی وحدت ختم ہوگئی تھی اور اس سے پہلے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں شام و عراق کی دو الگ الگ مملکتیں بن گئی تھیں اور دونوں سلطنتوں کو بعض اکابر صحابہ کی تائید حاصل تھی، غالباً اسی لئے ابتدائی دور سے ہی ایک گروہ ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ مسلم مملکتوں اور ہر مملکت کے لئے الگ الگ سربراہوں کا قائل تھا، اگرچہ علامہ ماوردی نے اپنی معروف کتاب 'الاحکام السلطانیہ' میں اسے قول شاذ قرار دیا ہے، ایک اور تصور بھی تھا کہ اگر مملکت کی وسعت نظم و نسق میں حارج ہو تو سلطنت کے انتظامات اور دفاع کے اُمور کو آسان بنانے کے لئے ایک سے زیادہ حکومتیں اور ان کے الگ الگ سربراہ ہو سکتے ہیں؛ چنانچہ علامہ عبدالقادر بغدادی فرماتے ہیں کہ ایک وقت میں دو سربراہ نہیں ہونے چاہئیں، سوائے اس کے کہ ان دونوں خطوں کے درمیان ایسا سمندر حائل ہو کہ ایک طرف کے لوگ دوسری طرف کے لوگوں کو اپنی مدد نہ پہنچا سکیں، ایسی صورت میں دونوں علاقوں کے لوگوں کے لئے الگ الگ امیر منتخب کئے جا سکتے ہیں:

... إلا أن يكون بين البلدين مانع من وصول نصرة أهل كل واحد منهما إلى الآخر فيجوز حينئذ لأهل كل واحد منهما عقد الإمامة لواحد من أهل ناحيته۔ (اصول الدین: ۲۷۴)

اور یہی بات اسلامی نظام سیاست کے سب سے بڑے ماہر اور نامور مفکر امام الحرمین علامہ جوینیؒ نے بھی لکھی ہے۔ (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۱/ ۲۷۳)

اس لئے ایک آئیڈیل اور مثالی اسلامی مملکت تو وہی ہوگی، جو پوری ملت اسلامیہ کو ایک لڑی میں پرودے؛ لیکن آج کی دنیا کا پھیلاؤ اور قومی عصبیتوں کے مرض کی وجہ سے عملاً یہ بات ممکن نہیں ہے، اگر ایسی کوشش کی گئی تو خطرہ ہے کہ عالم اسلام میں ایک نہ ختم ہونے والی خونریز جنگ شروع ہو جائے گی، جو بعض خطوں میں پہلے ہی سے جاری ہے، جیسے بعض فقہاء نے ایک ہی شہر میں تعدد جمعہ کو منع کیا تھا؛ لیکن بعد میں بڑھتی ہوئی آبادی کے پس منظر میں اس کی اجازت دی گئی، اسی طرح موجودہ حالات میں تعدد مملکت کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

موجودہ دور میں خواتین کے حقوق کی بازیابی اور ان کی آزادی کے پُرفریب نعرہ کی بازگشت پوری دنیا میں سنی جارہی ہے اور جن لوگوں نے عورتوں کے ناموس کو سامان تجارت بنادیا ہے، بدقسمتی سے وہی خواتین کے حقوق کے سب سے بڑے پاسدار سمجھے جارہے ہیں، اس تحریک نے جو مادی مقاصد کے لئے شروع کی گئی ہے، پوری دنیا کو متاثر کیا ہے، مسلمان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، اس پس منظر میں یہ سوال کھڑا ہوتا ہے کہ کیا خواتین کسی مسلمان حکومت میں رکن پارلیمنٹ ہوسکتی ہیں؟ اگرچہ اس سلسلے میں دورائیں ہوسکتی ہیں؛ لیکن موجودہ صورت حال میں کہا جاسکتا ہے کہ فی الجملہ اس کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ شریعت میں اس بات کو تو منع کیا گیا ہے کہ فیصلے کے تمام تر اختیارات عورتوں کے حوالہ کردیئے جائیں: ''**لن يفلح قوم ولوا أمرهم امرأة**'' (بخاری، کتاب الفتن، باب الفتنة التی تموج کموج البحر، حدیث نمبر: ٦٦٨٦) لیکن مشورہ دینا فیصلہ کرنا نہیں ہے اور خواتین سے مشورہ لینے میں کوئی مانع نہیں ہے؛ بشرطیکہ وہ ایسی مجلسوں میں شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ شرکت کریں؛ چنانچہ یہ بات تاریخ کے صفحات پر موجود ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کی وفات کے بعد خلیفہ کے انتخاب کے سلسلے میں حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے خواتین سے بھی مشورے کئے تھے۔

اسی طرح اس دور میں ایک اہم مسئلہ پارلیمنٹ میں مذہبی اقلیتوں کی نمائندگی کا بھی ہے، اس

سلسلے میں بھی یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ پارلیمنٹ کا ہر رکن اپنی انفرادی حیثیت میں صرف مشورہ دینے کا مجاز ہوتا ہے، فیصلہ کرنے کا نہیں، فیصلہ تو غلبہ آراء سے ہوگا، پس اگر مسلمان ملکوں میں مجلس شوریٰ میں غیر مسلم نمائندے ہوں، وہ اقلیتوں کے مسائل پر بحث میں حصہ لیں اور عام انتظامی اور مالیاتی مسائل میں مشورہ دیں تو اس میں کوئی حرج نظر نہیں آتا؛ البتہ جو شرعی مسائل احکام قطعیہ کے درجہ میں ہوں، ان میں تو مشورہ کی گنجائش ہی نہیں ہے اور جو اجتہادی مسائل ہیں، ان میں بھی فیصلہ کرنے کے مجاز علماء وفقہاء ہیں، صرف ان کی تنفیذ کے طریقہ کار پر مجلس شوریٰ میں بحث ہوسکتی ہے، ایسے مسائل میں ان کا ووٹ مؤثر نہیں مانا جائے گا؛ کیوں کہ یہ مذہب سے مربوط مسلمانوں کے مسائل ہیں، اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ عصر حاضر کے پس منظر میں اسلامی نظام سیاست کی تشکیل کرتے ہوئے حکومت میں اقلیتوں کو بھی حصہ دار بنایا جاسکتا ہے؛ بلکہ بنایا جانا چاہئے۔

حضرات ! اس عہد میں ایک طرف ماہرین علم سیاست نے یہ تصور کرلیا کہ اسلام کے سیاسی تصورات موجودہ ترقی یافتہ دور میں قابل عمل نہیں ہیں، دوسری طرف علماء اور اصحابِ افتاء نے اس کو علم وفکر کی دنیا کا ایک بند باب سمجھ کر اس پر غور کرنا چھوڑ دیا؛ حالاں کہ جب رسول اللہ ﷺ پر نبوت کا سلسلہ تمام ہوچکا اور آپ کی ہدایات قیامت تک انسانیت کے لئے زندگی کے تمام مسائل میں رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی رہیں گی تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اجتماعی زندگی کا ایک ایسا شعبہ جس سے ہر فرد اپنی انفرادی اور اجتماعی حیثیت میں مربوط ہے اور جس پر بہت سے احکام شریعت کی تنفیذ موقوف ہے، پر غور وفکر نہ کیا جائے، یہاں تک کہ اس پر تبادلہ خیال کرنے سے بھی گریز کیا جانے لگے۔

اسی لئے اسلامک فقہ اکیڈمی نے اس اہم موضوع کو آپ اہل دانش اور اصحابِ فکر ونظر کی بارگاہ میں پیش کیا ہے؛ تاکہ اس فراموش کردہ موضوع پر شریعت اسلامی کے ماہرین متوجہ ہوں، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس سیمینار میں مطلوبہ اسلامی نظام سیاست پر گفتگو کی جارہی ہے، جس کی عملی طور پر مسلم اکثریت خطہ ہی میں تطبیق ہوسکتی ہے؛ لیکن اکیڈمی اس سے پہلے اپنے 'چودھویں سالانہ فقہی سمینار' میں ان سیاسی مسائل کو زیر بحث لاچکی ہے، جو مسلمان اقلیتوں کو درپیش ہیں، جو غالباً برصغیر میں اس موضوع پر پہلا نمائندہ سیمینار تھا اور اس کے فیصلوں کو توازن اور واقعیت کی وجہ سے ہر جگہ پزیرائی حاصل ہوئی۔

اس وقت جو سیمینار منعقد ہورہا ہے، انشاء اللہ اس میں بڑے اہم موضوعات زیر بحث آئیں

گے، جیسے یہ کہ ملوکیت کے بارے میں اسلامی تصور کیا ہے اور کیا اسلام موروثی نظام حکومت کو قبول کرتا ہے؛ تاکہ اس بات کا تجزیہ کیا جاسکے کہ مسلم ممالک میں بادشاہت کا طویل عہد دوسری اقوام سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے، یا شریعت اسلامی نے ان کو یہی تعلیم دی ہے؟ اسی طرح شوریٰ کی رائے کو اختیار کرنے کا مسئلہ ہے، جس کی طرف اس حقیر نے ابھی اشارہ کیا ہے، یہ موضوع بھی بڑا اہم ہے کہ موجودہ جمہوری نظام کے اصولوں پر کس طرح ایک اسلامی حکومت کی تشکیل عمل میں آسکتی ہے، اس طرح کے متعدد مسائل —— انشاء اللہ —— آپ کے مقالات اور مناقشات میں زیر بحث آئیں گے، جو عصری تناظر میں بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔

حضرات ! علی گڑھ میں اس پروگرام کے انعقاد کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہم نے جدید وقدیم اور علماء ودانشوروں کے درمیان جو مصنوعی دیوار کھڑی کردی ہے اور جو بہ تدریج اتنی اونچی ہوتی جارہی ہے کہ ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتے، اسے 'دیوار برلن' کی طرح گرادیا جائے، ہم ایک دوسرے سے فائدہ اُٹھائیں اور باہمی اشتراک کے ساتھ ملت کو سربلند کرنے کی کوشش کریں، مجھے اس موقع پر شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے وہ فقرے یاد آرہے ہیں، جو انھوں نے ۲۹/ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ ہی میں فرمائے تھے، جس کا ایک ایک حرف دردوسوز میں ڈوبا ہوا ہے اور خونِ جگر میں قلم ڈبو کر لکھا گیا ہے :

> اے نونہالانِ وطن ! جب میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں، خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔

افسوس کہ شیخ الہند کی یہ تحریک کما حقہ آگے نہ بڑھ سکی، تاہم 'آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ' کے قیام نے عوامی سطح پر اور 'اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا' کے قیام نے فکری سطح پر جدید وقدیم کے درمیان خلیج کو کم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، اُمید ہے کہ یہ اور اس طرح کے پروگرام اس کو مزید تقویت پہنچائیں گے کہ ہم سب اُمت کا اثاثہ ہیں اور ہم سب کا کعبۂ مقصود اللہ کی رضاء وخوشنودی اور اسلام کی سرفرازی وسربلندی ہے۔

میں بے حد شکر گزار ہوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور بالخصوص اس کے شعبہ سیاسیات کا، جس نے اسلامک فقہ اکیڈیا کے اشتراک سے یہ اہم سیمینار منعقد کیا، مجھے اُمید ہے کہ یہ سیمینار نہ صرف اسلام کے سیاسی نظام کے خد وخال واضح کرنے میں معاون ثابت ہوگا اور اس پر غور وفکر اور بحث وتحقیق کا محرک بنے گا؛ بلکہ علماء اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کے درمیان فاصلوں کو سمیٹنے اور علمی وفکری مسائل میں ایک دوسرے سے افادۂ واستفادہ کو وسعت دینے میں بھی ایک اہم رول ادا کرے گا، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سیمینار کو صحیح نتائج پر پہنچنے کا ذریعہ بنائے۔

وباللہ التوفیق وھو المستعان۔

● ● ●

اسلام میں آزادی کا تصور
اور
فقہ اسلامی میں اس کی تطبیق ☆

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ وصحبہ أجمعین ، ومن تبعھم بإحسان إلی یوم الدین ، أما بعد۔

صدر عالی قدر، بزرگان محترم، برادرانِ عزیز! اس وقت ایک ایسے موضوع پر غور وفکر کے لئے ہم جمع ہوئے ہیں جو ہر دور میں انسانی آبادی کا بڑا اہم مسئلہ رہا ہے اور اس کی گونج اس وقت خاص طور پر عالم اسلام اور عالم عرب میں سنی جارہی ہے، شخص حکمرانی کی بساطیں لپیٹی جارہی ہیں، جہاں زبان کھولنے کی بھی اجازت نہیں تھی، وہاں آزادی کے نعرۂ مستانہ نے فرزانوں کو دیوانہ بنادیا ہے، اس لیلائے مقصود کو حاصل کرنے کے لئے جو قربانیاں دی جارہی ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہیں؛ لیکن مغرب کے اور اسلام کے تصور آزادی میں یقیناً فرق ہے، اسلام ایک ایسی آزادی کا قائل ہے جس میں نہ اکثریت کی غلامی، نہ نفس کی، نہ مختلف طبقات کے لوگوں کے لئے انصاف کے الگ الگ پیمانے ہوں، اور نہ وہ مذہب واختلاف سے آزاد ہو۔

اس لئے اسلامک فقہ اکیڈمی نے اس موضوع پر غور وفکر کا راستہ کھولنے کے لئے یہ اہم پروگرام منعقد کیا ہے اور مقامِ مسرت ہے کہ یہ پروگرام ایک ایسی درسگاہ میں منعقد ہورہا ہے، ہندوستان کی جنگ آزادی کے سورماؤں نے آزادی کی تحریک کو آگے بڑھانے اور شمع آزادی کی لَو کو تیز کرنے کے لئے جس کی بنیاد رکھی تھی، جس کی جڑوں میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر ذاکر حسین، حکیم مختار احمد انصاری اور ان جیسے ملک کے نامور رہنماؤں اور بے غرض فداکاروں کی تخم اُمید پنہاں ہے۔

☆ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے جامعہ ملیہ کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے تعاون سے ۲۵-۲۷/ ذیقعدہ ۱۴۳۳ھ، مطابق ۱۲-۱۴/ اکتوبر ۲۰۱۲ء کو سیمینار کا اہتمام کیا تھا، یہ اس سیمینار کا کلیدی خطبہ ہے۔

میں اس موقع پر جامعہ کی انتظامیہ بالخصوص پروفیسر اختر والواسع صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اکیڈمی کے اس پروگرام کی میزبانی قبول فرمائی اور اس طرح ایک ایسی جگہ یہ سیمینار منعقد ہو رہا ہے کہ شاید اس پروگرام کے لئے اس سے زیادہ کوئی اور جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔

حضرات ! اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں تین طرح کی مخلوقات پیدا کی ہیں، جمادات، نباتات اور حیوانات، جمادات سے مراد ایسی چیزیں ہیں جن میں نمو اور حرکت کی صلاحیت نہیں ہوتی جیسے پتھر، زمین، لوہا، نباتات سے مراد پودے ہیں جن میں بڑھوتری اور افزائش تو ہوتی ہے، لیکن وہ نقل وحرکت کی صلاحیت سے محروم اور بظاہر احساس وشعور سے عاری ہیں، حیوانات سے مراد جاندار مخلوق ہیں جن میں شعور واحساس ہے، کسی میں کم اور کسی میں زیادہ ادراک کی صلاحیت اور نقل وحرکت کی قوت ہے ـــــ جمادات اور نباتات دراصل اسی تیسری مخلوق کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، پتھر جہاں نصب کر دیئے جائیں، نصب رہتے ہیں، لوہے کو آپ جس سانچے میں چاہیں ڈھال لیں، لکڑی کو آپ جس مقصد کے لئے چاہیں استعمال کریں، درخت آپ جہاں چاہیں لگا دیں، انھیں کوئی انکار نہیں اور نہ ان کی طرف سے کوئی احتجاج سامنے آئے گا، گویا یہ جاندار مخلوقات کے لئے قدرت ہی کی طرف سے خادم اور اپنی اعلیٰ تر مخلوق کے غلام ہیں، اس غلامی پر انھیں کوئی اعتراض نہیں۔

لیکن جو جاندار مخلوقات ہیں، ان کا معاملہ ان سے مختلف ہے، شیر اور ہاتھی سے لے کر چیونٹی اور مکھی تک اگر آپ کسی کو بھی اپنی قید میں لانا چاہیں تو وہ ضرور احتجاج کریں گے، انکار کا رویہ اختیار کریں گے، اپنی طاقت وصلاحیت کے مطابق وار کرنے یا راہِ فرار اختیار کرنے سے نہیں چوکیں گے اور کسی طور آپ کی گرفت میں آنا پسند نہیں کریں گے، گویا فطری طور پر ان کو غلامی سے انکار ہے اور یہ آزادی کے طلبگار ہیں، جاندار مخلوقات میں سب سے عظیم ترین مخلوق انسان ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ نے عقل وشعور اور فہم وادراک کی ایسی صلاحیت ودیعت کی ہے کہ کسی اور جاندار مخلوق کو شاید اس کا سوواں حصہ بھی حاصل نہ ہو، اس لئے انسان میں آزاد رہنے کا جذبہ زیادہ ہے اور اس کی فطرت غلامی سے اباء کرتی ہے، انسان کے نومولود شیر خوار بچہ کو بھی اس کے مزاج اور طبیعت کے خلاف کوئی بات پیش آجائے، تو اس کی طرف سے ضرور ہی احتجاج اور ردعمل کا اظہار ہوتا ہے، وہ روتا ہے اور بے تحاشہ آنسو بہا کر اپنی ناگواری کا اظہار کرتا ہے، یہ اسی صدائے آزادی کی بازگشت ہے، جو انسانی فطرت میں رکھی گئی ہے، جس کی وجہ سے انسان پتھر اور لکڑی کی طرح ہر عمل پر خاموش اور ردعمل سے عاری نہیں

رہ سکتا اور مزاج و مذاق کے خلاف پیش آنے والی بات پر ناگواری کے اظہار کے لئے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے اور یہ اس کے بے چین دل کے لئے کسی قدر سکون وطمانینت کا باعث بنتا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے اور وہ سلیم فطرت کے تقاضوں کو پورا کرنے آیا ہے، نہ کہ اس کو دبانے اور اس کا گلا گھونٹنے، اسلام کا پورا نظامِ حیات اسی بنیادی تصور پر مبنی ہے، اس میں کہیں قانونِ فطرت سے تصادم اور ٹکراؤ نہیں، اس نے انسان کے آزاد رہنے کے اس فطری حق کو تسلیم کیا ہے، اس کی بہترین ترجمانی ان کلمات سے ہوتی ہے جو عالم اسلام کے سفیر صحابیٔ رسول ربعی بن عامر ﷺ نے رستمِ ایران کے دربار میں کہے تھے اور ان پر اپنا مقصد ومنشاء واضح کیا تھا کہ ہم اس لئے آئے ہیں کہ اللہ کے بندوں کو انسان کی بندگی اور غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کریں: **"الله ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادة العباد الى عبادة الله"** (البدایۃ والنہایۃ: ۷/ ۳۹) —— انسان کے اسی فطری حق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عمر ﷺ نے اپنے ایک گورنر کو فرمایا کہ ان کو ان کی ماؤں نے تو آزاد جنا تھا تم نے ان کو کب سے غلام بنالیا ہے؟ یہ آزادی کے اسی فطری حق کا اعلان واظہار ہے جو اسلام کی بنیادی تعلیمات کا ایک حصہ ہے، اس لئے آزادی ایک انسانی اور اسلامی حق ہے۔

سامعین کرام! آزادی کے تصور کو طاقت پہنچانے کی غرض سے اسلام نے سب سے پہلے انسانی مساوات کا تصور دیا کہ تمام انسان ایک ہی آدم کی اولاد ہیں، محض رنگ ونسل، خاندان ونسب اور علاقہ و وطن کی بنیاد پر ان میں ایک دوسرے سے بڑا نہیں، بہتری اور کہتری انسان کے عمل اور کردار سے متعلق ہے: **"إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللهِ أَتْقَاكُمْ"** (الحجرات: ۱۳) —— یہ وہ بنیادی تصور ہے جس کے بعد ایک انسان کا پیدائشی طور پر حکمراں اور دوسروں کا محکوم ہونا غلط قرار پاتا ہے، اسلام سے پہلے قریب قریب پوری دنیا میں بادشاہتیں قائم تھیں، روم، ایران، حبش، یمن، ہندوستان، غرض اس وقت کی معلوم دنیا میں ہر جگہ شاہانہ طرزِ حکومت مروج تھا اور مخصوص خاندانوں کو حکومت کا اہل سمجھا جاتا تھا، اس کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ اس آمرانہ طرزِ حکومت کو مذہبی رنگ دے دیا گیا تھا، ایران میں لوگ شاہی خاندان کو خدا کا کنبہ تصور کرتے تھے، مغرب میں رفتہ رفتہ کلیسا نے انسان کو اپنا مکمل غلام بنالیا تھا، وہ نہ صرف اپنے آپ کو لوگوں کی آخرت کا ٹھیکیدار تصور کرتے تھے؛ بلکہ دنیا میں بھی اپنے فیصلہ کو خدائی فیصلہ باور کرتے تھے، اور یہی عقیدہ لوگوں کے ذہن میں راسخ کردیا گیا تھا، ایک طرف وہ مغفرت نامے تقسیم کرتے اور لوگوں کے لئے جنت کی رجسٹری کرتے اور دوسری

طرف مملکت کے نظام کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھ کر نہایت جابرانہ طرزِ عمل اختیار کرتے اور جو ان کی رائے سے سرمو انحراف کرتا ان کو لرزا دینے والے عقوبت خانوں میں تختۂ مشق بنایا جاتا اور زندہ جلا دینے کی سزا دی جاتی، بالآخر ۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس پر یہ ظالمانہ کلیسائی نظام یورپ سے ختم ہوا، گویا ایک آمریت تھی جو مذہب اور خدا کے نام پر روا رکھی گئی تھی، اس لئے یورپ میں جو انقلابی تحریکیں اُٹھیں ان کا خمیر مذہب کی مخالفت اور عناد سے تیار ہوا۔

اسلام نے اس طرح کی خاندانی بادشاہت کو سند جواز عطا نہیں کیا اور ایک ایسی آزاد طرزِ حکومت کا تصور پیش کیا، جس میں رنگ و نسل کے بجائے صلاحیت اور کردار کی بنیاد پر فرمانرواں کا انتخاب عمل میں آئے اور پھر یہ بھی بتا دیا کہ حکمراں کوئی مافوق العادت حیثیت کا حامل نہیں ہوتا؛ بلکہ وہ بھی عام لوگوں ہی میں کا ایک شخص ہوتا ہے، اس کے فیصلے غلط بھی ہو سکتے ہیں، اس کی ذات تنقید سے بالاتر نہیں ہوتی اور عوام کو ان کے احتساب کا پورا حق حاصل ہوتا ہے، یہ بات کہ حق حکمرانی قدرتی اور غیر اختیاری اتفاقی سبب سے متعلق نہیں کہ کوئی شخص کسی خاندان میں پیدا ہو جائے تو وہ حکمرانی کا حقدار ہے؛ بلکہ یہ حق انسان کے کردار اور اکتساب سے متعلق ہے، یہ ایک انقلابی فکر ہے جس سے آزادی کا تصور اُبھرتا ہے اور غلامی کی نفی ہوتی ہے۔

یہ مذہبی خوش عقیدگی اور مبالغہ آرائی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے کہ گذشتہ چند صدیوں میں انسان کے حق آزادی اور مساوات و برابری کا جو تصور ابھرا ہے، وہ دراصل اسلامی تعلیمات ہی کا اثر ہے، اسلام جس وقت دنیا میں آیا اس وقت بادشاہت اور ملوکیت کا تصور ذہنوں پر چھایا ہوا تھا، اس وقت دنیا میں جتنی قابل ذکر حکومتیں تھیں وہ سب خاندانی بادشاہت کے نظام پر مبنی تھیں، ایران و روم کی حکومتیں اسی تصور پر قائم تھیں، ہندوستان اور چین میں بھی ایسی ہی چھوٹی بڑی ریاستیں تھیں، لوگ اس کے اس قدر خوگر ہو چکے تھے کہ جمہوریت اور آزادی کے تصور سے بھی وہ محروم تھے۔

یورپ افلاطون اور اس کے شاگرد ارسطو کو جمہوری طرز فکر کا بانی تصور کرتا ہے اور افلاطون کی کتاب ''جمہوریت'' (Republic) کو اس موضوع پر پہلی کتاب خیال کیا جاتا ہے؛ لیکن افلاطون کے جمہوری تصور کا حال یہ ہے کہ اس کے نزدیک صرف فلاسفہ کو حکمرانی کا حق حاصل ہے اور وہ سماج کے بقیہ افراد کو فوجیوں، کاشتکاروں اور غلاموں میں تقسیم کرتا ہے، اس کے نزدیک ان سب کی تخلیق کا خمیر بھی الگ الگ ہے، فلاسفہ کو خدا نے سونے سے بنایا ہے، ان کے معاونین کو چاندی سے، پھر

کاشتکار اور دستکار وغیرہ کو لوہے اور پیتل سے، یہ ہے جمہوریت اور انصاف کا وہ تصور جو افلاطون نے پیش کیا ہے۔

افلاطون کے بعد مشہور فلسفی اور افلاطون کے شاگرد ''ارسطو'' کو نظام جمہوری کا مفکر تصور کیا جاتا ہے، ارسطو کے یہاں سماج کی طبقاتی تقسیم اتنی نمایاں ہے کہ ایک دانشور سے ایسے غیر منصفانہ خیالات کا صدور حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے، ارسطو کا خیال ہے کہ ''غریب امیروں کے پیدائشی غلام ہیں، وہ بھی، ان کی بیویاں بھی اور ان کے بچے بھی'' ارسطو کو مساوات اور حکومت میں غریبوں کی شرکت نہایت ناگوار خاطر ہے، جب فلاسفہ روزگار اور دانشورانِ عصر کے فکر ونظر کا یہ حال ہو تو عام لوگوں کی سوچ کا اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

یہ اسلام ہے جس نے انسانی وحدت اور تکریم آدمیت کا انقلابی پیغام دیا اور اس کو برت کر دکھایا اور آج پوری دنیا میں آزادی کے تصور نے جو تقویت پائی ہے وہ یقیناً اسی انقلابی فکر کی بازگشت ہے، انسانی وحدت کا تصور مسلم سماج میں ایک عقیدہ کی طرح رچ بس گیا تھا اور ایک معمولی سے معمولی انسان فرماں روائے وقت کے خلاف اپنی زبان کھولنے اور اپنا مقدمہ پیش کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتا تھا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ہم لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تھے کہ مصر کے ایک قبطی نے فریاد کی، آپ رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا تو اس نے کہا: عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مصر میں گھوڑ دوڑ کرائی، جس میں میرا گھوڑا آگے نکل گیا اور لوگوں نے اسے دیکھا بھی، مگر محمد بن عمرو بن العاص کہنے لگے کہ بخدا! یہ میرا گھوڑا ہے، وہ جب قریب آئے تو میں نے انھیں پہچان کر کہا کہ نہیں بخدا وہ میرا گھوڑا ہے، اس پر مجھے کوڑوں سے مارنے لگے، انھوں نے کہا کہ جانتے نہیں کہ میں ''ابن الاکرمین'' (شریف زادہ) ہوں۔

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: اچھا، بیٹھو! پھر عمر بن العاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ میرا خط دیکھتے ہی تم اور تمہارے بیٹے محمد حاضر ہو جائیں، راوی کہتا ہے کہ عمر بن العاص رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو بلا کر پوچھا کہ کیا تم نے کوئی جرم کیا ہے؟ اس کے بعد وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہو گئے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے پاس تھے کہ عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ کو ایک لنگی اور چادر میں آتے دیکھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ دیکھنے لگے کہ انکا بیٹا بھی ساتھ ہے یا نہیں، جوان کے پیچھے پیچھے آرہا تھا،

حضرت عمرؓ نے مصری کو بلایا اور حکم دیا کہ درّہ لے کر ابن الاکرمین (شریف زادہ) کی خبر لو، راوی کہتا ہے کہ اس نے اسے اچھی طرح مارا، پھر حضرت عمرؓ نے کہا کہ عمرو کے سر پر بھی گھماؤ، کیوں کہ انھیں کے سہارے پر اس نے تمھیں مارا تھا، مصری کہنے لگا کہ میں مارنے والے کو مار چکا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر تم انھیں مارتے تو میں بیچ میں نہ پڑتا، جب تک کہ تم ہی نہ انھیں چھوڑ دیتے، پھر فرمایا عمرو! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنایا، حالاں کہ ان کی ماؤں نے تو انھیں آزاد جنا تھا؟ پھر مصری کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ اطمینان سے جاؤ، اگر کوئی بات پیش آئے تو مجھے لکھنا۔ (سیرت عمر لابن جوزی: ۹۷-۸۶)

دنیا نے بہت بعد کو آزادی کی لذت چکھی ہے، روسو تو ۱۷۵۰ء میں بھی شکوہ سنج تھا کہ ”انسان آزاد پیدا ہوا تھا؛ لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے“ یہ عجیب بات ہے کہ مغربی اقوام جو آج حقوقِ انسانی، حق آزادی اور جمہوریت کا سہرا اپنے سر باندھے ہوئی ہیں، نصف صدی پہلے تک انھوں نے ہی نصف دنیا سے زیادہ حصہ کو اپنا غلام بنایا تھا اور اب بھی دنیا کے بعض خطوں کو وہ اپنی نو آبادی بنائے ہوئے ہیں، ۳۰ر نومبر ۱۹۷۳ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے نسل پرستی کو قانونی جرم قرار دینے کے سلسلے میں ایک قرارداد منظور کی، تو چار ملکوں نے اس کی مخالفت کی اور حیرت کے کانوں سے سنئے کہ ان چار ملکوں میں جنوبی افریقہ اور پرتگال کے ساتھ امریکہ اور برطانیہ بھی تھے، یہ ہیں آزادی اور انسانی حقوق کے عالمی ٹھیکیدار!!

محترم حضرات! پھر اسلام نے تفصیل کے ساتھ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق انسان کے بنیادی حقوق کو متعین کیا، قرآن نے کہا: کہ ہر شخص کو جینے کا حق ہے اور کسی بھی نفس انسانی کو زندہ قتل کر دیا جائے تو اس کے وارث کو قاتل سے بدلہ لینے کا پورا پورا حق حاصل ہے (الاسراء: ۳۳) گویا انسان اپنی زندگی کے لئے کسی کے رحم و کرم کا محتاج نہیں، ہر شخص کو اپنے مال پر ملکیت کا حق ہے، دوسروں کو حق نہیں کہ وہ ناروا طریقہ پر اس کی رضامندی کے بغیر اس کے مال پر قابض ہو جائے، (النساء: ۲۹) —— پھر کسبِ معاش کے لئے ہر شخص آزاد ہے، کہ وہ جس پیشہ کو چاہے اختیار کرے، اس کو اس بات پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ اگر اس کے خاندان میں پہلے سے کوئی ایسا پیشہ آرہا ہو جسے لوگ کمتر سمجھتے ہوں، تو وہ وہی پیشہ اختیار کرے، ہاں! اگر کوئی شخص کسی کام کا اہل نہیں، جیسے اس نے میڈیکل تعلیم حاصل نہ کی ہو اور لوگوں کا علاج کرنے لگے تو عام لوگوں کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے اس سے روکا جا سکتا ہے، خود حدیث نبوی میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔

عزت وآبرو کا تحفظ ایک بنیادی حق ہے اور کسی قوم کے لئے گنجائش نہیں کہ وہ دوسری قوم کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کرے: ''لَا یَسْخَرْ قَومٌ مِّن قَوْمٍ'' (الحجرات:۱۱) عدل وانصاف ہر شخص کا حق ہے، اسلام نے اس کا شفاف اور مساوات پر مبنی نظام دیا ہے اور انصاف کے معیارات بھی یکساں رکھے ہیں، اس میں حکمران ومحکوم اور سماج کے باوجاہت اور معمولی لوگوں کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا، یہاں تک کہ اگر مسلمانوں کی کسی قوم سے عداوت ہو تب بھی حکم دیا گیا کہ پیمانۂ انصاف میں کوئی فرق نہ ہونے پائے: ''وَلاَ یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَی أَلاَّ تَعْدِلُوْا'' (المائدہ:۸) ہر شخص کو رائے اور ضمیر کی آزادی عطاء کی گئی اور وہ جس چیز کو غلط سمجھے اس کے اظہار کی اجازت دی گئی، جسے قرآن کی زبان میں نہی عن المنکر کہا جاتا ہے (آل عمران:۱۰) ملک کے ہر شہری کو احتجاج اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق دیا گیا ہے: ''لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ''۔ (النساء:۱۴۸)

اسلام ملک کے تمام شہریوں کو مذہبی آزادی عطا کرتا ہے، کہ وہ اپنے ضمیر واعتقاد کے مطابق خود زندگی گذاریں: ''لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَد تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ''۔ (البقرۃ:۲۵۶)

قرآن مجید نے صاف طور پر حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے مشرکین مکہ کو کہلایا: ''لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَ لِیَ دِیْنِ'' (الکافرون:۶) ''تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین'' ایک اور موقع پر ارشاد ہے: ''لَنَا اَعْمَالُنَا وَ لَکُمْ اَعْمَالُکُمْ'' (الشوریٰ:۱۵) ''ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال'' رسول اللہ ﷺ کی رواداری کا حال یہ تھا کہ نجران کے عیسائیوں کا وفد بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے ان کو ان کے مذہب کے مطابق اور ان کے قبلہ کی طرف رخ کر کے مسجدِ نبوی ﷺ میں نماز ادا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی، فقہاء نے لکھا ہے کہ :

> اگر کسی مسلمان کی بیوی یہودی یا عیسائی ہو اور اس کے عقیدہ کے مطابق کسی خاص دن روزہ رکھنا واجب ہو تو مسلمان شوہر اسے روزہ رکھنے سے روک نہیں سکتا ہے، گو اس کی وجہ سے وہ جنسی استفادہ کے حق سے محروم ہوتا ہے۔ (احکام أہل الذمۃ:۱/۳۱۶)
>
> اسی طرح اگر وہ اپنے عقیدہ کے مطابق صلیب پہنے، یا مسلمان شوہر کے گھر میں صلیب رکھے تو اسے یہ حق ہے اور شوہر اس کو روک نہیں سکتا۔ (احکام أہل الذمۃ:۱/۳۱۶)

یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے مذہبی گروہوں کے مذہبی جذبات کو مجروح نہ کیا جائے اور دوسری قومیں جن دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرتی ہوں، ان کو برا بھلا نہ کہا جائے؛ حالاں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام خدا کی ذات وصفات میں کسی کی شرکت کو جائز نہیں سمجھتا؛ کیوں کہ یہ سچائی اور واقعہ کے خلاف ہے؛ لیکن پھر بھی مذہبی رواداری کے تحت ان معبودانِ باطل کے بارے میں ناشائستہ باتیں کہنے سے منع کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔(الانعام:۱۰۸)

وہ اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہیں، تم ان کو برا بھلا نہ کہو۔

اسی طرح عبادت گاہوں کے معاملات میں بھی تمام اہل مذاہب کے جذبات کو ملحوظ رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے، قرآن مجید نے جہاں عبادت گاہوں کے منہدم کرنے کی مذمت کی ہے، وہاں مسلمانوں کی مسجدوں سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کے گرجوں کا ذکر فرمایا ہے، (الحج: ۴۰) اس سے ظاہر ہے کہ عبادت گاہیں —— خواہ کسی مذہب کی ہوں —— ان کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے، رسول اللہ ﷺ نے بنونجران سے جو معاہدہ کیا، اس میں یہ صراحت فرمائی کہ ان کی عبادت گاہیں منہدم نہیں کی جائیں گی اور نہ مذہبی اُمور میں کوئی مداخلت کی جائے گی، (ابوداود، حدیث نمبر: ۳۰۴۱) عہدِ صدیقی میں حضرت خالد بن ولید ؓ کے ذریعہ حیرہ کا علاقہ فتح ہوا، اہل حیرہ کے لئے انھوں نے جو دستاویز تیار فرمائی، اس میں بھی یہ صراحت موجود ہے کہ ان کے چرچ اور گرجے منہدم نہیں کئے جائیں گے، امام ابویوسفؒ نے اسے نقل کیا ہے۔ (موسوعۃ الخراج: ۱۴۳)

اس سلسلہ میں خلافتِ راشدہ اور بعد کے مسلم عہد میں بہت سی مثالیں موجود ہیں، جن کا ذکر اس وقت درازیٔ تحریر کا باعث ہوگا؛ لیکن اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام عقیدۂ توحید کی حفاظت اور اپنی شناخت کی بقاء کے سلسلہ میں جس قدر حساس ہے، غیر مسلموں کے مذہبی اور سماجی مسائل میں اسی قدر کشادہ قلب، سیر چشم اور رَوادار بھی ہے، افسوس کہ اس پر غلط فہمیوں کے تہ در تہ دبیز پردے ڈال دیئے گئے ہیں۔

سزا کے نظام میں بھی مساوات وبرابری اور ہر بالغ ومکلف کے لئے یکساں سزا رکھی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے قریش کی ایک معزز خاتون کا ہاتھ چوری کے جرم میں کٹوایا اور اس سلسلہ میں اپنے قریب ترین لوگوں کی سفارش کو رد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: کہ اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ بھی اس کی مرتکب

ہوتی تو اسے بھی یہی سزا دی گئی ہوتی، اسلام نے ایک ایسے نظامِ مملکت کا تصور دیا جو شورائیت پر مبنی ہو: ''**وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ** ''۔(الشوریٰ:۳۸)

اسی طرح ہر شخص کو اظہار خیال کی آزادی ہے، قرآن مجید نے اس کو ''نہی عن المنکر'' سے تعبیر کیا ہے؛ لیکن آزادی اسی حد تک ہے کہ دوسرے کے جذبات اس سے مجروح نہ ہوں، آپ فضاء میں لاٹھی گھما سکتے ہیں؛ لیکن یہ احتیاط ضروری ہے کہ آپ کی لاٹھی کسی اور کے سر سے نہ ٹکرائے، کسی شخص کے لئے بہر حال اس کی گنجائش نہیں، کہ وہ شخص آزادی کے نام پر دوسروں کا سر پھوڑے اور راہ چلتے لوگوں کو زخمی کر دے، اس کا نام آزادی نہیں؛ بلکہ بے راہ روی اور آوارگی ہے۔

غرض اسلام ایک ایسے سیاسی نظام کا نقیب و ترجمان ہے جو غلامی کے بجائے آزادی پر مبنی ہو، جو انسانی تفریق کے بجائے مساوات پر قائم ہو، جس میں رنگ و نسل کے بجائے اخلاق و کردار کو تولا جاتا ہو، جس میں انصاف کا ایک ہی پیمانہ ہو، جس میں اصحاب اقتدار کے احتساب کی اسی قدر گنجائش ہو، جتنی ایک ادنیٰ رعایا کی، اور جو انسانی کرامت و شرافت کے بنیادی تصور پر استوار ہو۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ آزادی کے لئے بھی کچھ حدود و قیود ضروری ہیں، سڑک پر ہر شخص کو چلنے کا حق ہے؛ لیکن اگر لوگ یہ سمجھیں کہ یہ آزادی ان کو ٹریفک کے قواعد سے بھی آزاد کرتی ہے تو یقیناً یہ آزادی پروانۂ ہلاکت بن جائے گی، اس لئے آزادی کے بھی دائرے ہیں اور یہ دائرہ اخلاقی اقدار کا ہے، آزادی ایسی نہ ہو کہ جس سے اخلاق کے بندھن ٹوٹ جائیں، جو شرم وحیاء کے الفاظ کو انسانی ڈکشنری سے مٹا کر رکھ دے، جو انسان کو ظلم و استبداد کے لئے آزاد کر دے، جو فطرتِ انسانی کی تسلیم شدہ حقیقتوں پر بھی خط نسخ پھیر دے، یہ آزادی رحمت نہیں؛ بلکہ زحمت ہے اور سامان عافیت نہیں؛ بلکہ ابتلاء و مصیبت ہے، افسوس کہ مغرب میں کلیسائی نظام کے خلاف جو بغاوت ہوئی، اس نے مذہب بے زاری کی ایسی برقی رو دوڑا دی کہ جس نے فکر و نظر کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے اور لوگوں نے سمجھا کہ آزادی یہ ہے کہ انسان مادر و پدر سے آزاد ہو جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمہ اخلاقی قدروں کو بھی غلامی کی علامت سمجھ لیا گیا، مخرب اخلاق اسباب کو بھی آزادی کا پروانہ دیدیا گیا اور انسان کے لئے یہ بات مشکل ہو گئی کہ وہ اپنے پیکر آزادی پر اخلاق و شرافت کی قید و بند کا کوئی تارِ لباس باقی رہنے دے۔

اسلام ایسی بے قید آزادی کا قائل نہیں، اسی لئے اس نے انتظام و تدبیر انسان کے ہاتھ میں

رکھا اور قانون کی لگام خدا کے ہاتھ میں دی: ''اِنِ الحُکْمُ اِلاَّ لِلّٰہِ'' (یوسف: ۴۰) کیوں کہ انسان کے خالق سے بڑھ کر انسان کی آزادی کی حدود اور اس کی بھلائی کے لئے مطلوب پابندیوں اور قیود کو کوئی اور ذات نہیں سمجھ سکتی، یہ آزادی کا ایک متوازن، معتدل تصور ہے، جس میں نہ صرف آخرت کی فلاح ہے؛ بلکہ دنیا کی بھی بھلائی ہے، کہ خدا کی غلامی ہی اصل میں انسان کی آزادی ہے، جو شخص خدا کا غلام بننے کو تیار نہ ہو تو اسے ضرور مخلوق کا غلام بنا پڑے گا، اگر وہ دوسروں کا غلام نہ بنے، تو کم سے کم خود اپنے نفس کی غلامی اسے قبول کرنی ہوگی، اسی کو مردِ حق آگاہ شاعر اسلام علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ :

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

حضرات ! اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا بنیادی طور پر جدید شرعی مسائل کے لئے پروگرام منعقد کرتی ہے اور اس کے لئے ملک و بیرونِ ملک سے معتبر علماء وفقہاء کو جمع کر کے مسائل کو حل کرتی ہے؛ لیکن موجودہ دور میں جو فکری مسائل پیدا ہوئے ہیں ان پر بھی اپنے پروگرام منعقد کرتی ہے؛ تا کہ یہ جہت لوگوں کے سامنے آسکے اور یہ ان موضوعات پر وسیع تر غور وفکر کے لئے ذریعہ بن سکے؛ چنانچہ اب تک اس طرح کے بیس سے زیادہ سیمینار منعقد ہو چکے ہیں، دُعاء ہے کہ یہ پروگرام اپنے مقصد میں کامیاب ہو اور اُمت کے لئے نفع کا ذریعہ بنے۔

میں اخیر میں جامعہ کے ذمہ داران، اساتذہ وطلبہ، مقالہ نگاران، دور دراز سے آئے والے مہمانان اور خود اکیڈمی کے رفقا و کارکنان کا بے حد شکر گزار ہوں اور اُمید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی اکیڈمی کو ان حضرات کا تعاون حاصل رہے گا۔

● ● ●

دعوتِ دین ـــ ملت کے موجودہ مسائل کا حل ☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلىٰ آله وصحبه اجمعين ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين۔

حضرات گرامی قدر! دعوت دین کی اہمیت وضرورت اور اس سلسلے میں مسلمانوں کی ذمہ داری دو بنیادی عقیدوں سے متعلق ہے، ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر نبوت کا سلسلہ مکمل ہو چکا ہے، آپ ﷺ کے بعد کسی قسم کی کوئی نبوت باقی نہیں رہی؛ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ (الاحزاب: ۴۰)

محمد تم میں سے کسی مرد کے والد نہیں ہیں؛ البتہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے سلسلہ پر مہر لگانے (یعنی ختم کرنے والے) ہیں۔

خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے متعدد ارشادات میں اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے۔

عقیدۂ ختم نبوت کے لوازم میں سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت قیامت تک کے لئے ہے اور پوری انسانیت آپ کی نبوت کے سایہ میں ہے، قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ۔ (سباء: ۲۸)

اور ہم نے آپ کو پوری انسانیت کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے۔

غرض کہ آپ ﷺ کی نبوت کے دائرہ میں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پوری انسانیت ـــ بلا امتیاز رنگ ونسل وبلا فرق زبان وعلاقہ اور بلا تفریق مکان وزمان ـــ داخل ہے۔

☆ جامعہ دار السلام عمر آباد کی دعوہ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس، بتاریخ: ۳۰ر محرم، یکم صفر ۱۴۳۷ھ، مطابق: ۱۴، ۱۵ر نومبر ۲۰۱۵ء کو کلیدی خطبہ پڑھا گیا۔

دوسرا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات انسانیت کے لئے رحمٰن ورحیم ہے؛ اس لئے جیسے اس نے انسان کی دوسری ضروریات کا انتظام کیا ہے، ویسے ہی انسان کی ہدایت اور اس کی ابدی نجات کا بھی سروسامان فرمایا ہے؛ چنانچہ اس نے انسانیت کی ہدایت کی غرض سے انبیاء کو بھیجا اور ان کے ذریعہ اپنی کتابیں انسانیت کے لئے نازل فرمائیں، جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے وقت میں سرچشمۂ ہدایت اور روشنی تھی، چنانچہ تورات کے بارے میں فرمایا گیا :

اِنَّا اَنْزَلْنَا التَّوْرٰاةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۔ (المائدۃ:۴۴)

بے شک ہم نے تورات اُتاری ہے، جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔

اور قرآن مجید کے بارے میں ارشاد ہے کہ یہ حق کی تلاش کرنے والوں کے لئے ہدایت کا ذریعہ ہے: ''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ''۔ (البقرۃ:۲)

نیز دنیا میں وسائل ہدایت کا باقی رہنا اللہ تعالیٰ کے رب العالمین ہونے کا لازمی تقاضہ ہے، جب انسانیت کے لئے ہدایت کی ضرورت قیامت تک باقی رہنے والی ہے اور نبوت کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ پر تمام ہو چکا ہے، تو سوال یہ ہے کہ انسانیت تک خدا کا پیغام ہدایت کیوں کر پہنچے گا؟ —— قرآن مجید میں اس سوال کا جو جواب ملتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے لئے ایک طرف قرآن مجید قیامت تک محفوظ رہے گا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت خود اپنے ذمہ رکھی ہے، ''اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ'' (الحجر:۹) دوسری طرف جیسے انبیاء اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوا کرتے تھے، اسی طرح یہ اُمت پوری انسانیت کی طرف مبعوث کی گئی ہے :

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ (آلِ عمران:۱۱۰)

تم بہترین اُمت ہو، جو لوگوں کے لئے بھیجے گئے ہو؛ تاکہ بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔

قرآن مجید میں اس بات کو بار بار واضح کیا گیا ہے، گویا رسول اللہ ﷺ جس طرح اس اُمت کی طرف مبعوث فرمائے گئے، اسی طرح یہ اُمت پوری انسانیت کی طرف مبعوث کی گئی ہے :

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطاً لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۔ (البقرۃ:۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تم کو میانہ رو اُمت بنایا ہے؛ تا کہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور رسول تم پر گواہ بنے۔

اگر کوئی مسلمان اسلام کے اقرار کے باوجود دعوتِ دین کی طرف سے بے توجہ ہے، تو گویا وہ ایک طرح کے نفاق میں مبتلا ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

اَلْمُنَافِقُوْنَ وَ الْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ ... وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (التوبۃ:۶۷،۷۱)

منافق مرد و عورت ایک دوسرے کے دوست ہیں، جو برائی کا حکم دیتے ہیں اور نیکی سے منع کرتے ہیں اور مومن مرد و عورت ایک دوسرے کے دوست ہیں، جو بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں۔

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے علامہ فخر الدین رازیؒ (م: ۶۰۴ھ) فرماتے ہیں :

واعلم انه تعالیٰ لما وصف المومنين بكون بعضهم اولياء بعض ذكر بعده ما يجري مجرى التفسير والشرح له، فقال تعالیٰ : يامرون بالمعروف وينهون عن المنكر ويقيمون الصلوٰة ويوتون الزكوٰة ويطيعون الله ورسوله، فذكر هذه الامور الخمسة التي بها يتميز المومن من المنافق۔ (مفاتیح الغیب:۸/۹۴،نیز دیکھئے:تفسیر قرطبی:۴/۴۷)

جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے جب مومن کے ایک دوسرے کے دوست ہونے کی صفت بیان فرمائی تو اس کے بعد ایسی بات ذکر کی، جو اس کی شرح و تفسیر کے درجہ میں ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتے ہیں'' غرض کہ ان پانچ باتوں کا ذکر فرمایا، جن سے مسلمان اور منافق کے درمیان امتیاز قائم ہوتا ہے۔

دعوت کا نفع جہاں ان لوگوں کو پہنچتا ہے، جن کو دعوت دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت سے سرفراز فرماتے ہیں، وہیں اس کا نفع خود دعوت دینے والوں کے لئے بھی ہے؛ یہاں تک کہ مدعو دعوت کو قبول کرے یا نہیں کرے اور وہ قبول واعتراف کا راستہ اختیار کرے یا جحود وانکار کا، داعی بہرحال فائدہ سے محروم نہیں ہوتا؟ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۔ (البقرۃ:۶)

''ان'' کے لئے برابر ہے، آپ انھیں ڈرائیں یا نہیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

یوں نہیں فرمایا :

سَوَاءٌ عَلَيْكَ ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ ۔

''آپ'' کے لئے برابر ہے کہ انھیں ڈرائیں یا نہیں۔

دعوت کے فوائد

داعی کو دعوت سے جو دنیوی اور اخروی فوائد پہنچتے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں :

(۱) اس کی شرعی ذمہ داری ادا ہوتی ہے اور وہ عند اللہ جواب دہی سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

(۲) آخرت میں اسے بے حد اجر وثواب حاصل ہوتا ہے؛ کیوں کہ جو شخص جس آدمی کی کوشش سے ایمان کے دائرہ میں آئے اور صراط مستقیم کو اختیار کرے، اس کی نیکیوں میں وہ عند اللہ شریک سمجھا جاتا ہے؛ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**الدال على الخير كفاعليه**''۔(۱)

(۳) ترکِ دعوت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا عذاب متوقع ہے اور من جملہ اس کے یہ بھی ہے کہ ایسے شخص یا گروہ کی دُعاء قبول نہیں ہوتی، فریضۂ دعوت ادا کر کے مسلمان اس سے اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں، چنانچہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

والذی نفسی بیده لتأمرن بالمعروف ولتنهون عن المنکر اولیوشکن الله ان یبعث علیکم عقاباً من عنده ثم لتدعنه فلا یستجیب لکم ۔ (۲)

---

(۱) سنن ترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء الدال علی الخیر کفاعلہ، حدیث نمبر: ۲۶۷۰۔

(۲) رواہ الترمذی، کتاب الفتن، باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر، حدیث نمبر: ۲۱۶۹۔

اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو، یا قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف سے عذاب نازل کریں، پھر تم دُعاء کرو اور تمہاری دُعاء قبول نہ کی جائے۔

(۴) جو گروہ دعوت کا کام کرتا ہے، من جانب اللہ دشمنوں سے اس کی حفاظت ہوتی ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا :

یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ ۔ (المائدۃ: ۶۷)

اے رسول! آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی جانب سے جو دین اُتارا گیا ہے، اسے پہنچا دیجئے، اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو حق رسالت ادا نہیں کیا اور لوگوں سے تو اللہ آپ کی حفاظت کریں گے۔

— یہ آیت واضح کرتی ہے کہ تبلیغ رسالت سے ''**عصمت من الناس**'' (لوگوں سے حفاظت) متعلق ہے، معلوم ہوا کہ جب اُمت تبلیغ رسالت کے فریضہ سے غافل ہوجائے گی، تو اللہ کی طرف سے عصمت وحفاظت سے بھی محروم ہوجائے گی، یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ قرآن مجید میں اکثر مواقع پر ''ناس'' کا لفظ کفار ومشرکین کے لئے بولا گیا ہے، گویا دعوت کفار ومشرکین سے حفاظت کا ایک غیبی نسخہ ہے۔

(۵) دعوتِ دین کی خدمت جب بھی انجام دی جائے گی، دو باتوں میں سے ایک بات ضرور سامنے آئے گی، یا تو گم گشتہ راہ لوگوں کو ہدایت حاصل ہوگی اور یہی مقصود ہے، یا ان پر حجت تمام ہوجائے گی، پھر اللہ کی طرف سے مسلمانوں کی مدد ہوگی اور وہ عذاب الٰہی کے مستحق قرار پائیں گے؛ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا کہ فریضۂ دعوت سے گریز کی وجہ سے دُعائیں رد کردی جائیں گی اور لوگ اللہ کی مدد سے محروم کردیئے جائیں گے، چنانچہ حضرت عائشہ سے مروی ہے :

رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے، میں نے آپ کے چہرۂ انور پر تفکر محسوس کیا کہ کوئی بات پیش آئی ہے؛ چنانچہ آپ نے وضوء فرمایا اور کسی سے گفتگو نہیں کی، پھر حضور ﷺ کی بات سننے کے لئے میں

حجرہ سے لگ گئی، آپ منبر پر بیٹھے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی اور فرمایا ''اے لوگو! اللہ تم سے فرماتے ہیں: نیکی کا حکم کرتے رہو اور برائی سے روکتے رہو، اس سے پہلے کہ تم دُعاء کرو اور میں تمہاری دُعاء قبول نہ کروں اور تم مانگو اور میں عطا نہ فرماؤں اور تم مدد چاہو اور میں تمہاری مدد نہ کروں'' اس سے زیادہ آپ نے کچھ نہیں فرمایا اور منبر سے اُتر گئے۔(۱)

غور کیا جائے تو اس وقت دنیا کے بہت سے علاقوں میں صورت حال یہ ہے کہ اُمت مسلمہ پر ظالم حکومتوں کا تسلط ہے، جس کی سب سے بڑی مثال سرزمین قدس ہے، دنیا کے بہت سے علاقوں میں مسلمان غیر محفوظ ہیں، وہ اپنے مذہب، تمدن، جان و مال اور عزت وآبرو کے سلسلے میں عدم تحفظ سے دو چار ہیں، حرمین شریفین سے لے کر پوری دنیا کی مسجدوں تک ہر جگہ دُعائیں ہوتی ہیں اور خدا سے مدد مانگی جاتی ہے، مگر صورت حال یہ ہے کہ دن بدن مسلمانوں کے حالات بگڑتے ہی جاتے ہیں، جو آیات واحادیث اوپر ذکر کی گئی ہیں، وہ ہمیں بتاتی ہیں کہ اس صورتِ حال کا حقیقی سبب خدا کے غیبی نظام کے تحت یہ ہے کہ ہم نے بہ حیثیت اُمت دعوتِ دین کے کام سے منھ موڑ لیا ہے؛ اسی لئے دعوتِ دین وہ اہم فریضہ ہے، جس کی طرف مسلمانوں کو پوری یکسوئی کے ساتھ متوجہ ہونا ضروری ہے اور خدا کے غیبی نظام میں یہی ان کے تحفظ کا راستہ ہے۔

دعوتِ دین فرض عین ہے یا فرض کفایہ؟

اسی لئے فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ دعوتِ دین محض کوئی مباح یا مستحب عمل نہیں ہے؛ بلکہ یہ اس اُمت پر فرض ہے، اختلاف اس میں ہے کہ یہ فرض عین ہے یا فرض کفایہ؟ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ دعوت فرض عین ہے، یعنی ہر شخص پر انفرادی حیثیت میں فرض ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے پوری اُمت مسلمہ کو کارِ دعوت کا حکم دیا ہے؛ چنانچہ امام فخر الدین رازیؒ (م: ۲۰۴ھ) ''**وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُوْلٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ**'' (آلِ عمران: ۱۰۴) کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''**منکم**'' میں دو قول ہیں: پہلا قول یہ کہ ''**من**'' یہاں ''بعض'' کے

(۱) ابن حبان، کتاب البر والاحسان، باب الصدق والامر بالمعروف والنہی عن المنکر، حدیث نمبر: ۲۹۰۔

معنی میں نہیں ہے، اور اس کی دو دلیلیں ہیں اول : یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قول "**کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ الخ**" (آل عمران:۱۱۰) میں پوری اُمت پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب قرار دیا ہے، دوسرے یہ کہ ہر مکلف پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے، چاہے ہاتھ سے کرے، یا زبان سے یا دل سے، ...... جب یہ بات ثابت ہوگئی تو ہم کہیں گے کہ اس آیت کے معنی ہیں کہ بھلائی کا حکم دیتے ہوئے اور برائی سے روکتے ہوئے خیر کی طرف داعی بن جاؤ، لہٰذا "**من**" یہاں بیان کے لئے ہے نہ کہ بعض کے معنی میں، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد — "**فَاجْتَنِبُوْا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ**" (الحج:۳۰) "بتوں کی نجاست سے بچو" — میں، (یعنی بعض بتوں سے بچنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے؛ بلکہ تمام بتوں سے بچنے کا حکم فرمایا گیا ہے)۔

اس نقطۂ نظر کے مطابق تو ہر مسلمان پر اپنی صلاحیت اور طاقت واستطاعت کے مطابق دعوتِ دین کا کام فرض ہے؛ اسی لئے اہل سنت والجماعت نے داعی کے لئے عادل ہونے کی شرط نہیں لگائی ہے، اگر کوئی مسلمان فاسق ہو، تب بھی اسے دعوت کا کام کرنا چاہئے؛ چنانچہ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں :

وليس من شرط الناهي ان يكون عدلاً عند اهل السنة، خلافاً للمبتدعة، حيث يقول : لا يغيره إلا عدل، وهذا ساقط ؛ فأن العدالة محصورة في القليل من الخلق والامر بالمعروف والنهي عن المنكر عام في جميع الناس۔ (تفسیر قرطبی: ۴/۴۷)

اہل سنت والجماعت کے نزدیک برائی سے روکنے والے کے لئے شرط نہیں ہے کہ وہ عادل بھی ہو، بخلاف مبتدعین کے، کہ وہ کہتے ہیں : عادل ہی برائی کو بدل سکتا ہے اور اس قول کا اعتبار نہیں؛ اس لئے کہ عدالت تو کچھ لوگوں میں محدود ہے، جب کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمام لوگوں میں عام ہے۔

یہی بات امام رازیؒ (م: ۶۰۴ھ) اور علامہ ابن کثیرؒ نے بھی لکھی ہے۔(۱)

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دعوت فرض کفایہ ہے، یعنی اُمت میں ایک گروہ کو بہر حال فریضۂ دعوت کو ادا کرنا چاہئے؛ لیکن ہر شخص پر انفرادی حیثیت میں دعوت واجب نہیں، امام رازیؒ (م: ۶۰۴ھ) اس نقطۂ نظر کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

القول الثاني ان ''من'' هنا للتبعيض ، والقائلون بهذا القول اختلفوا ايضاً على قولين : احدهما : ان فائدة كلمة ''من'' هي أن في القوم من لا يقدر على الدعوة ولا على الامر بالمعروف والنهي عن المنكر مثل النساء ، والمرضٰى والعاجزين : وثانيهما ، ان هذا التكليف مختص بالعلماء ۔ (۲)

دوسرا قول یہ ہے کہ ''من'' یہاں ''بعض'' کے معنی میں ہے، پھر جو حضرات اس کے قائل ہیں، ان کے بھی دو قول ہیں: ایک یہ کہ ''من'' (بہ معنی بعض) کا فائدہ یہ ہے کہ قوم میں کچھ ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو دعوت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر قادر نہ ہوں، جیسے: ''عورتیں، بیمار، عاجز حضرات'' دوسرا قول یہ ہے کہ ''دعوت کے مکلف صرف علماء ہیں''۔

فرض کفایہ سے مراد

بہر حال جمہور کے نزدیک دعوت فرض کفایہ ہے، اس سے بعض حضرات کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اگر پوری اُمت میں سو دو سو آدمی بھی دعوت کا کام کرتے ہوں، تو پوری اُمت کی طرف سے فریضۂ دعوت ادا ہو جائے گا؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ غلط فہمی پر مبنی ہے، فرض کفایہ سے مراد یہ ہے کہ اتنے لوگ اس فریضہ کو ادا کرنے والے موجود ہوں، جو اس کی ادائیگی کے لئے کافی ہو جائیں، جیسے میت کو غسل دینا فرض کفایہ ہے اور غسل کے لئے ایک آدمی کافی نہ ہو سکے، دو یا چار آدمی کی ضرورت ہو، تو جب تک

(۱) دیکھئے: مفاتیح الغیب: ۳۷۸/۴، تفسیر ابن کثیر: ۳۹۰/۱۔

(۲) مفاتیح الغیب: ۳۷۶/۴۔

اتنے افراد مہیا نہ ہوجائیں ،فرض کفایہ ادا نہیں ہوگا،اسی طرح عام حالات میں جہاد فرض کفایہ ہے، ظاہر ہے کہ دو چار آدمی جہاد نہیں کرسکتے ، جہاد کے لئے دشمن کی طاقت کے اعتبار سے ایک فوج مطلوب ہے، جب تک اتنے افراد مہیا نہ ہوجائیں ،فرض کفایہ باقی رہے گا۔

چنانچہ علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ فرماتے ہیں :

ومعنی الکفایة فی الجهاد ان ینهض للجهاد قوم یکفون فی قتالهم ، إما ان یکونوا جندا لهم دواوین من اجل ذلک ، أو یکونوا قد اعدوا انفسهم له تبرعاً بحیث إذا قصدهم العدو ، حصلت المنعة بهم ۔ (۱)

جہاد کے فرض کفایہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ جہاد کے لئے اتنے لوگ تیار ہوں جو جنگ کی ضرورت پوری کرنے کے لئے کافی ہوں ، یا تو باضابطہ درج رجسٹر (تنخواہ دار) فوجی ہوں ، یا تبرعاً انھوں نے اپنے آپ کو جہاد کے لئے تیار رکھا ہو؛ بہر حال وہ اس موقف میں ہوں کہ دشمن حملہ کریں تو یہ دفاع کے لئے کافی ہوجائیں۔

فرض کفایہ کی تعریف میں اس حقیقت کی طرف اشارہ موجود ہے اور بعض اہل علم نے اس کو زیادہ وضاحت وصراحت کے ساتھ بھی لکھا ہے، جیسے موجودہ عہد کے اہل علم میں ڈاکٹر عبد الکریم بن علی ''واجب کفائی'' کا حکم بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

وحکمه أنه إذا قام به من یکفی من المکلفین سقط عن الباقین وإذا لم یؤده احد لحق الإثم جمیع المکلفین ۔ (۲)

اس کا حکم یہ ہے کہ جب مکلف لوگوں میں سے اس ذمہ داری کے لئے کفایت کرنے کے بہ قدر لوگ اس کو انجام دیں تو باقی لوگوں سے ذمہ داری ساقط ہوجائے گی اور کوئی بھی اس ذمہ داری کو ادا نہ کرے تو سبھوں کو گناہ ہوگا۔

---

(۱) المغنی: ۸/۱۳۰۔

(۲) المهذب فی علم اصول الفقه: ۱/۲۱۵۔

دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ اگر کسی فرض کفایہ کی ادائیگی اس وقت تک نہ ہو پائے، جب تک سارے لوگ اس میں نہ لگ جائیں، تو اس وقت وہ فرض عین کا درجہ حاصل کر لیتا ہے، جیسا کہ جہاد کے سلسلے میں فقہاء کی تصریحات موجود ہیں۔

غرض کہ فرض کفایہ ہونے کا مقصد یہ ہے کہ اس کام میں اتنے لوگ لگ جائیں، جو اس کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے کافی ہو جائیں، اب موجودہ دور میں صورتِ حال یہ ہے کہ پوری دنیا نے ایک گاؤں کی صورت حاصل کر لی ہے، جس میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد بیس فیصد یا اس سے کچھ زیادہ ہے، تقریباً مسلمانوں کی آبادی کا یہی تناسب خود ہمارے ملک ہندوستان میں بھی ہے، ان میں وہ لوگ بھی ہیں، جو پوری طرح صراط مستقیم پر قائم ہیں اور وہ لوگ بھی ہیں، جو فکری و عملی انحراف میں مبتلا ہیں، اب اگر صرف غیر مسلم بھائیوں تک ہی دعوت پہنچانے کی بات ہو تو ان کی تعداد اسّی فیصد ہے، گویا ہر مسلمانوں کو کم سے کم چار انسانی بھائیوں تک دعوتِ دین پہنچانی ہے، ظاہر ہے کہ اگر ہزار دو ہزار افراد، مسلمانوں کی کوئی ایک دو تنظیم یا کسی خاص علاقہ کے مسلمان اس کے لئے جدوجہد کریں، تو پوری انسانیت تک اسلام کی دعوت کیوں کر پہنچ سکتی ہے؟ — لہٰذا صرف فرض کفایہ کے لفظ سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے۔

علاقوں کے اعتبار سے دعوت کی اہمیت

مسلمان دنیا کے جن ملکوں میں آباد ہیں، وہ بنیادی طور پر دو طرح کے ہیں: ایک وہ جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے، دوسرے وہ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں یا اکثریت میں ہونے کے باوجود محکوم ہیں، اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس وقت پچاس فیصد سے زیادہ مسلمان ایسے ملکوں میں ہیں، جہاں اقتدار کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے، چنانچہ انڈونیشیا کے بعد سب سے زیادہ مسلمان ہندوستان میں بستے ہیں، چین اور روس میں مسلمانوں کی آبادی اتنی کثیر ہے کہ ان کی تعداد بیشتر مسلمان ملکوں سے زیادہ ہے، ان حالات میں ہمیں دونوں طرح کے حالات میں زندگی بسر کرنے والے مسلمانوں کے بارے میں طے کرنا ہوگا کہ دعوتی نقطۂ نظر سے ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

دعوتِ دین اور غیر مسلم ممالک

یہاں ہم ان ممالک کے مسلمانوں کا ذکر کرتے ہیں، جو اقلیت میں ہیں یا محکوم ہیں، — ایسے مسلمانوں کے لئے بنیادی طور پر تین ہی راستے ہو سکتے ہیں: جہاد، ہجرت، دعوت۔

جہاد اور غیر مسلم ممالک

جہاں تک جہاد کی بات ہے تو یہ ایک قانونی عمل ہے اور قرآن وحدیث کی روشنی میں فقہاء نے اس کے لئے کچھ شرطیں ذکر کی ہیں، جب تک یہ شرطیں نہیں پائی جائیں، جہاد کرنا درست نہیں، اس سلسلہ میں ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ جہاد ان ہی قوموں سے جائز ہے، جن تک اسلام کی دعوت پہنچ چکی ہو، یہاں اس سلسلے میں بعض روایات کا نقل کرنا مناسب ہوگا :

عن ابن عباس قال : ما قاتل رسول الله صلى الله عليه وسلم قوماً حتى دعاهم ۔ (۱)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے کسی قوم سے اس وقت تک جہاد نہیں کیا، جب تک کہ ان کو دعوت نہ دیدی۔

اس کے علاوہ دیکھئے حضرت علیؓ، (۲) اور فروہ بن مسیک کی روایت۔ (۳)

اسی لئے محدثین نے اپنی کتاب میں ''**باب الدعوة قبل الجهاد**'' کا باب قائم کیا ہے، اسی طرح فقہاء نے جہاد سے پہلے تبلیغ دین کو واجب قرار دیا ہے؛ چنانچہ علامہ برہان الدین بخاری (م:۶۱۶ھ) فرماتے ہیں :

يجب ان يعلم بأن شرط جواز القتال مع الكفرة على الخصوص اشياء ثلاثة ، احدها : امتناعهم عن قبول الاسلام ... حتى أنه إذا لم تبلغهم الدعوة إلى ذلك لامن حيث الحقيقة ولا من حيث الاعتبار ، لا يباح قتالهم إلا بعد تقديم الدعوة ۔ (۴)

یہ جاننا ضروری ہے کہ خاص طور پر غیر مسلموں کے ساتھ جنگ کے جائز ہونے کے لئے تین شرطیں ہیں: ان میں سے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کردیں، ...... یہاں تک کہ جب تک ان کو

---

(۱) مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۰۵۳، ۲۱۰۵، سنن دارمی، حدیث نمبر: ۲۴۴۴۔

(۲) مصنف عبدالرزاق، کتاب الجہاد، باب دعاء العدو، حدیث نمبر: ۹۴۲۴۔

(۳) **المعجم الکبیر للطبرانی**، حدیث نمبر: ۸۳۴۔ (۴) المحیط البرہانی: ۷/۹۴۔

اسلام کی دعوت نہ پہنچ جائے ، نہ حقیقتاً اور نہ تقدیراً، ان کو دعوت پیش کئے بغیر ان سے جہاد جائز نہیں۔

یہی بات علامہ علاء الدین کاسانیؒ (م: ۵۸۷ھ) نے بدائع الصنائع : ۶/ ۶۱ میں علاء الدین حصکفی نے درمختار اور ابن عابدین شامی نے الدرالمختار ورد المحتار:۶/ ۲۰۸ میں کہی ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ (م: ۶۲۰ھ) نے بھی صراحت کی ہے کہ جن لوگوں تک دعوت اسلام نہیں پہنچی ہو، ان تک دعوت پہنچائے بغیر ان سے جہاد کرنا جائز نہیں۔ (المغنی: ۱۳/ ۲۹)

ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے لکھا ہے کہ یہی نقطۂ نظر جمہور فقہاء اور سلف صالحین کا ہے۔ (۱)

غرض کہ جس گروہ سے جہاد کیا جائے ، ضروری ہے کہ پہلے اسے اسلام کی دعوت پہنچائی جائے ، خواہ پہلے سے دعوت پہنچائی گئی ہو یا عین میدانِ جنگ میں ان کو دعوت پیش کی جائے ؛ بلکہ جن لوگوں پر پہلے دعوت پیش کی جاچکی ہو، ان پر بھی اس وقت دوبارہ دعوت اسلام پیش کرنا مستحب ہے ، جس وقت فوجوں کا سامنا ہو؛ تا کہ پوری طرح حجت تمام ہو جائے۔ (۲)

جہاد کی شرطوں میں سے دوسری ضروری شرط امیر کا ہونا ہے ؛ کیوں کہ جہاد ایک اجتماعی عمل ہے نہ کہ انفرادی؛ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے :

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : الجهاد واجب عليكم مع كل أمير برا كان أو فاجرا ، والصلاة واجبة عليكم خلف كل مسلم برا كان أو فاجرا وإن عمل الكبائر۔ (۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم پر امیر کی اطاعت واجب ہے، چاہے وہ نیکوکار ہو یا بدکار اور ہر مسلمان کے پیچھے نماز واجب ہے، چاہے نیک ہو یا برا، اگرچہ کبیرہ گناہوں کا مرتکب کیوں نہ ہو؟

اس سلسلے میں علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ فرماتے ہیں :

وامر الجهاد موكول إلى الامام واجتهاده ، ويلزم الرعية طاعته فيما يراه من ذلك۔ (۴)

---

(۱) الفقہ الاسلامی وادلتہ:۶/ ۲۱۹، ۲۲۰۔ (۲) **المحیط البرھانی:۷/ ۹۵۔**

(۳) ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی الغزو مع ائمۃ الجور، حدیث نمبر: ۲۵۳۳۔ (۴) المغنی: ۱۳/ ۱۶۔

جہاد کا معاملہ امام اور اس کی رائے پر موقوف ہے اور وہ جو مناسب سمجھے
رعایا کے لئے اس کی اطاعت لازم ہے۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی مذکورہ روایت پر گفتگو کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ امیر سے کس صلاحیت اور قوت کی شخصیت مراد ہے؟ یعنی یہ کافی نہیں ہے کہ چند افراد اپنے طور پر کسی کو امیر مقرر کر لیں ؛ بلکہ باضابطہ ایسا امیر مراد ہے، جو احکام کی تنفیذ ،مظلوم کی انصاف رسانی اور لشکر کی تیاری وغیرہ پر قادر ہو اور اسے ولایت عامہ مطلقہ حاصل ہو۔ (اعلاء السنن: ۱۲/ ۵)

جہاد بالسیف کی شرطوں میں ایک یہ بھی ہے کہ اسباب و وسائل کے اعتبار سے بہ ظاہر مسلمانوں کا کامیاب ہونا متوقع ہو؛ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کو مکی زندگی میں جہاد کی اجازت نہیں دی گئی ؛ بلکہ ہجرت سے پہلے بیعت عقبہ میں شریک صحابہ نے جہاد کرنا چاہا، تب بھی رسول اللہ ﷺ نے انھیں جہاد کی اجازت نہیں دی۔ (دیکھئے: تفسیر ابن کثیر: ۳/ ۳۳۵)

اسی طرح فقہاء نے جہاد پر قدرت واستطاعت کی تشریح میں انفرادی قدرت کا ذکر کیا ہے، جیسے صحت مند ہونا، معذور نہ ہونا وغیرہ ؛ لیکن موجودہ دور میں جنگ ٹکنالوجی کا مقابلہ بن گئی ہے، کوئی شخص کتنا بھی صحت مند ہو؛ لیکن وہ آتشیں ہتھیار کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتا ؛ اس لئے موجودہ دور میں قدرت واستطاعت میں جنگ کی ٹکنالوجی کے اعتبار سے دشمن کے مقابلہ کی صلاحیت کا حامل ہونا بھی داخل ہے، جس میں ہتھیار، دشمن کے وسائل واہداف سے واقف ہونے کی صلاحیت، جاسوسی کا نظام وغیرہ سب شامل ہیں ؛ کیوں کہ موجودہ دور کی جنگ محض افرادی قوت اور چست طاقتور فوجیوں کے ذریعہ جیتی نہیں جاسکتی۔

حاصل یہ ہے کہ جہاد کے واجب ؛ بلکہ جائز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ :

(الف) جس قوم سے جہاد کیا جائے، اس پر اسلام کی دعوت پہنچائی اور دین کی حجت تمام کی جائے۔

(ب) جہاد ایک قانونی اور اجتماعی عمل ہے، جو ضروری ہے کہ امیر المسلمین کے تحت ہو، اپنے طور پر لوگ کسی گروہ پر حملہ بول دیں، یہ جہاد نہیں۔

(ج) جہاد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وسائل جہاد مہیا ہوں اور اس میں کامیابی حاصل ہونے کا غالب گمان ہو۔

(د) جہاد کافروں کے خلاف ہو نہ کہ مسلمانوں کے خلاف یا مسلمان حکومتوں کے خلاف۔
غور کیا جائے تو غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کے حق میں پہلی تینوں شرطیں نہیں پائی جاتیں۔

غیر مسلم ممالک اور ہجرت

غیر مسلم حکومت کے زیر اقتدار مسلمانوں کے لئے دوسرا امکانی راستہ 'ہجرت' کا ہوسکتا ہے، ہجرت بنیادی طور پر اپنے دین کو بچانے کے لئے ترکِ وطن کرنے کا نام ہے، اسی صورتِ حال کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کے درمیان مسلمانوں کے قیام کو ناپسند فرمایا ہے۔(۱)

خود قرآن مجید میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے، جو فتح مکہ سے پہلے ہجرت پر قادر تھے؛ لیکن انھوں نے ہجرت نہیں کی، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے :

إِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَا ئِكَةُ ظَالِمِيْ اَنْفُسِهِمْ ، قَالُوْا : فِيْمَ كُنْتُمْ ؟ قَالُوْا : كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ، قَالُوْا : أَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؟ فَأُوْلٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَائَتْ مَصِيْراً ، إِلاَّ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلاً ، فَأُوْلٰئِكَ عَسَى اللهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ، وَكَانَ اللهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۔ (النساء:۹۷-۹۹)

جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے، ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں، تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انھوں نے جواب دیا: ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے، فرشتوں نے کہا: کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ یہ وہ لوگ ہیں، جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانہ ہے، ہاں! جو مرد عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے، بعید نہیں کہ اللہ انھیں معاف کردے، اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگذر کرنے والا ہے۔

(۱) ابو داؤد و سکت علیہ، کتاب الجہاد، باب فی الاقامۃ بارض الشرک، حدیث نمبر: ۲۷۸۷، ترمذی، کتاب السیر، باب کراہیۃ المقام بین اظہر المشرکین، حدیث نمبر: ۱۶۰۴۔

اس آیت اور مذکورہ احادیث کی روشنی میں فقہاء نے ہجرت سے متعلق تین ضروری نکات اخذ کئے ہیں :

اول : یہ کہ اگر کسی علاقہ میں مسلمانوں کے لئے احکام دین پر عمل کرنا ممکن نہیں رہے، تو اب بھی ان کے لئے وہاں سے کسی مسلمان ملک کو ہجرت کر جانا واجب ہے، چنانچہ علامہ بدر الدین عینیؒ فرماتے ہیں :

واما الهجرة عن المواضع التی لا یتاتی فیها امر الدین فهی واجبة اتفاقاً ۔ (عمدۃ القاری:۱۰/۷۸)

جہاں احکام دین پر عمل نہیں کر سکتے، وہاں سے ہجرت کرنا واجب ہے۔

دوسرے : ہجرت ان لوگوں پر واجب ہے، جو اپنے وطن میں اپنے دین کے بارے میں خود کو مامون نہیں پاتے ہوں، چنانچہ حافظ ابن حجر (م:۸۵۲ھ) کا بیان ہے :

وهذا محمول علی من لم یامن علی دینه ۔ (۱)

یہ اس شخص سے متعلق ہے، جو اپنے دین کے بارے میں مطمئن نہ ہو۔

ابن حجرؒ نے ایک اور موقعہ پر اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ماوردی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اگر غیر مسلم ملک میں اپنے دین پر عمل کرنا ممکن ہو تو وہاں اپنے قیام کو باقی رکھنا زیادہ بہتر ہے؛ تاکہ وہ وہاں داعیانہ کردار ادا کر سکے، ممکن ہے کہ اس کے ذریعہ دوسروں کو ہدایت حاصل ہو۔ (۲)

تیسری بات جو قرآن مجید کی مذکورہ آیات سے صراحتاً ثابت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ لوگ ہجرت کرنے پر قادر بھی ہوں، جو لوگ ہجرت پر قادر ہی نہ ہوں، ظاہر ہے کہ ان پر ہجرت واجب ہی نہیں ہوگی :

لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۔ (البقرۃ:۲۸۶)

اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کی وسعت کے بقدر ہی مکلف بناتا ہے۔

پہلے زمانہ میں لوگوں کے لئے دشمنوں کے درمیان سے نکلنے کا مسئلہ دشوار تھا، اپنے ہم فکر لوگوں کے درمیان بسنے کا مسئلہ چنداں دشوار نہیں تھا؛ کیوں کہ آج کی طرح ویزا اور پاسپورٹ کا لزوم

(۱) فتح الباری:۶/۴۶، کتاب الجہاد والسیر۔

(۲) فتح الباری:۷/۲۰۷، کتاب مناقب الانصار۔

نہیں تھا، لوگ اپنی مرضی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جایا کرتے تھے، موجودہ دور میں ہجرت پر قادر ہونا اس وقت متحقق ہوگا، جب کہ وہ اپنے وطن سے نکلنے پر بھی قادر ہو اور کسی مسلمان ملک کی پناہ حاصل ہونے کا بھی اسے یقین ہو، اگر دوسرے ممالک اسے پناہ دینے اور اپنے یہاں اسے اقامت کا حق دینے کو تیار نہیں ہوں، تو وہ بھی ہجرت سے عاجز سمجھے جائیں گے۔

موجودہ دور میں جو مسلمان غیر مسلم حکومتوں کے زیر حکومت ہیں، ان کے سلسلے میں دو نکات قابل توجہ ہیں: اول یہ کہ آج کل زیادہ تر ملکوں میں جمہوری نظام قائم ہے، جس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ مذہب لوگوں کا نجی معاملہ ہے اور ہر گروہ کو اپنے عقیدہ اور اپنے مذہب کے مطابق عمل کرنے کی گنجائش ہے، دنیا کے اکثر ممالک وہ ہیں، جنھوں نے انسانی حقوق کے بین الاقوامی چارٹ کو قبول کیا ہے اور اس بنیاد پر وہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کرنے پر پابند ہیں؛ بلکہ بہت سے غیر مسلم اکثریت ممالک وہ ہیں، جہاں دعوتِ دین کے وسیع مواقع ہیں اور مسلمان اقلیتوں کی کوششوں سے اسلام دوسرا بڑا مذہب بن چکا ہے اور عام طور پر مسلمانوں کو اپنی جان و مال اور عزت وآبرو کے معاملہ میں قانونی تحفظ حاصل ہے؛ بلکہ بہت سے مسلمان، مسلم ممالک سے زیادہ ان ملکوں میں اپنے لئے امن وعافیت محسوس کرتے ہیں، ظاہر کہ ان حالات میں مسلمانوں کے لئے وہاں سے ہجرت کرنا واجب نہیں؛ بلکہ اگر وہ داعیانہ جذبہ کے ساتھ وہاں مقیم رہیں، تو علامہ ماوردی کے بہ قول ان کا اسی ملک میں مقیم رہنا مستحب ہے —— دوسرا قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ مغرب نے مسلمانوں کے درمیان کچھ اس طرح قومیت کا فتنہ اُبھارا ہے، نیز نسلی، لسانی اور جغرافیائی عصبیتوں کو جنم دیا ہے کہ اب مسلمان اپنے اپنے علاقوں کی سرحدوں کو خدا کی طرف سے کھینچی ہوئی لکیر تصور کرنے لگے ہیں اور اسلامی اخوت کا جذبہ کمزور پڑ گیا ہے، ان حالات میں غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے لئے یہ بات ممکن نہیں ہے کہ وہ مسلم ممالک کی طرف ہجرت کر سکیں؛ لہٰذا موجودہ دور میں علی العموم مسلمان اقلیتیں ہجرت کا راستہ اختیار نہیں کر سکتیں۔

دعوتِ دین —— واحد راستہ

تیسرا راستہ جو مسلمان اقلیتوں کے لئے موجودہ حالات میں واحد راستہ ہے، وہ ہے دعوتِ دین اور تبلیغ اسلام کا راستہ، ظاہر ہے کہ اس کے لئے زمان ومکان کی کوئی قید نہیں، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ عہد نے دعوت کے وسیع مواقع پیدا کر دیئے ہیں اور خاص طور پر مسلمانوں کے لئے اسلام کی تبلیغ واشاعت کا نیا راستہ کھل گیا ہے، اس سلسلے میں چند نکات خاص طور پر قابل توجہ ہے :

(۱) آج دنیا کے تقریباً سبھی ممالک میں تبلیغ مذہب کی آزادی کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے اور ایسی جمہوریت کو آئیڈیل نظام حکومت مانا گیا ہے، جس میں عوام کو کسی ایک مذہب پر قائم رکھنے کا پابند نہیں بنایا جاتا ہو، اس کے برخلاف آج سے چند صدی پیشتر حکومتوں کا مذہب متعین ہوتا تھا، اس کے مقابلے میں کسی اور مذہب کے تبلیغ کی اجازت نہیں دی جاتی تھی، —— اس کی وجہ سے مسلمان اقلیتوں کے لئے غیر مسلم ممالک میں دعوتِ دین کی بڑی گنجائش پیدا ہوگئی ہے، چنانچہ افریقہ کے بہت سے ملکوں میں مسلمان اکثریت بن چکے ہیں، امریکہ، برطانیہ، فرانس اور متعدد مغربی ملکوں میں آج اسلام دوسرا بڑا مذہب ہے، ہندوستان میں خاطر خواہ کوشش نہ ہونے کے باوجود اسلام قبول کرنے کی رفتار خاصی تیز ہے اور ان کی آبادی حقیقی معنوں میں بیس فیصد سے زیادہ اور سرکاری اعداد وشمار کے مطابق سترہ فیصد ہے۔

(۲) تعلیمی ترقی کی وجہ سے لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل گیا ہے، پہلے لوگ مذہب کے بارے میں زیادہ غور وفکر سے کام نہیں لیتے تھے اور بغیر سمجھے بوجھے اپنے مذہب پر جمے رہتے تھے، اب ہر چیز کو عقل ودانش کی کسوٹی پر پرکھنے کا مزاج پیدا ہوا ہے؛ اس لئے نئی نسل کھلے ذہن کے ساتھ مذاہب کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے، اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرتی ہے، یہ چیز انھیں اسلام کی طرف لا رہی ہے۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دور رکھنے کے لئے زبردست پیروپیگنڈہ مہم چلائی گئی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنے کے لئے —— نعوذ باللہ —— آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''محمد'' (قابل تعریف) کے بجائے ''مذمم'' (قابل مذمت) کہتے تھے اور لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات سے منع کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تجسس بڑھ گیا اور یہی تجسس بہت سے لوگوں کے لئے قبول اسلام کا سبب بنا، اس وقت بھی عالمی سطح پر یہی صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے، صہیونی اور صلیبی طاقتیں اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لئے پوری دنیا میں پروپیگنڈہ مہم چلا رہی ہے اور اس کے لئے ترقی یافتہ ذرائع ابلاغ کا بھرپور استعمال بھی کر رہی ہے، اس سے جہاں ایک طرف اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں، وہیں دوسری طرف اسلام کو سمجھنے اور قرآن مجید کا مطالعہ کرنے کی ایک عام سوچ پوری دنیا کی سطح پر اُبھری ہے اور اس طرح بہت سے لوگ ہیں کہ جن پر کسی نے اسلام کی دعوت پیش

نہیں کی ؛ لیکن اسلام کا مطالعہ انھیں دامن اسلام میں لے آیا ہے اور ۱۱ ؍ستمبر کے واقعہ کے بعد خاص طور پر لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے مغرب میں اسلام قبول کیا ہے۔

(۴) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام دین فطرت ہے، اس کی تعلیمات عقل ومشاہدہ اور فطرتِ انسانی سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں ؛ اسی لئے اس میں ہر عہد کے مسائل کے حل کرنے کی پوری پوری صلاحیت ہے، دنیا کے دوسرے مذاہب چوں کہ انسانی آمیزش سے محفوظ نہیں رہ سکے؛ اس لئے ان کی بہت سی تعلیمات فطرتِ انسانی سے متصادم اور عقل ومشاہدہ کے خلاف ہیں، یہ وہ چیز ہے، جو لوگوں کو اسلام کی طرف کھینچتی اور اس کی عظمت کا قائل بناتی ہے۔

(۵) آج دنیا میں جتنے مذاہب ہیں، ان میں کوئی نہیں، جو انسانی مساوات و برابری کے سلسلے میں انصاف کی کسوٹی پر پورا اُترتا ہو، بائبل اسرائیلی اور غیر اسرائیلی میں فرق کرتی ہے، ہندو مذہب میں پیدائشی اونچ نیچ کا نہایت گہرا اور غیر منصفانہ تصور موجود ہے، گو سفید فام اور سیاہ فام لوگوں کے درمیان تفریق قانونی طور پر قریب قریب پوری دنیا سے ختم کردی گئی ہے؛ لیکن غیر معلنہ طور پر عملاً ابھی بھی یہ تفریق موجود ہے، اسلام ایسا دینِ عدل ہے، جس میں رنگ ونسل اور زبان وعلاقہ کے بنا پر کوئی تفریق نہیں ہے؛ بلکہ کرامت وشرافت کی بنیاد تقویٰ ہے ''**لا فضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي ولا لاحمر على اسود ولا لأسود على احمر الا بألتقوىٰ إن أكرمكم عند الله اتقاكم**'' (**شعب الایمان للبیہقی**، حدیث نمبر: ۵۱۳۷) —— اس کی وجہ سے افریقی اور مغربی ممالک میں سیاہ فام لوگ اور ہندوستان میں پسماندہ اقوام کا اسلام کی طرف زبردست رجحان پایا جاتا ہے اور اگر سنجیدہ کوشش کی جائے، تو اس کے گہرے اور مفید اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔

(۶) اسلام سے متاثر ہونے کا ایک اہم سبب قانونِ شریعت کا اعتدال بھی ہے، دنیا کے دو بڑے مذاہب ہندومت اور عیسائیت میں طلاق، خلع اور بیوہ ومطلقہ عورتوں کے نکاح کا کوئی تصور نہیں تھا، بیشتر مذاہب میں عورتوں کو میراث نہیں دی جاتی تھی، اسی طرح لڑکیاں اپنی مرضی سے رشتہ کا انتخاب نہیں کرسکتی تھیں ؛ بلکہ ان کے والدین ان پر اپنی مرضی مسلط کرنے میں حق بہ جانب سمجھے جاتے تھے، دوسری طرف موجودہ مغربی تہذیب نے آزادی کے نام پر عورتوں کو گھر سے باہر نکالا اور وہ ذمہ داریاں بھی ان سے متعلق کردیں، جو فطرت نے مردوں پر رکھی تھیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندانی نظام بکھر گیا، طلاق کی شرح بڑھ گئی، نکاح کی شرح کم ہوگئی اور شرحِ پیدائش میں ایسا انحطاط آگیا کہ مغرب کی بعض نسلیں ختم ہونے کے قریب ہیں۔

ظاہر ہے اسلام کی یہ خصوصیات اول روز سے ہیں؛ لیکن موجودہ دور کے سیاسی نظام اور ذرائع ابلاغ کی ترقی نے اسلام کے ان امتیازی پہلوؤں کو برادرانِ انسانیت تک پہنچانا آسان کردیا ہے؛ اس لئے ضرورت ہے کہ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں یا کسی وجہ سے غیر مسلم حکومتوں کے زیر سایہ زندگی گزار رہے ہیں، وہاں اصل توجہ دعوتِ دین پر دی جائے، تو انشاء اللہ انھیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ''بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ'' (المائدۃ:۶۷) کے مطابق دوسری اقوام سے تحفظ بھی حاصل ہوگا، اسلام کی اشاعت بھی ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ بتدریج وہ اس ملک کی غالب طاقت بن جائیں، جیسا کہ ملیشیا، انڈونیشیا اور بعض دوسرے ملکوں میں ہوا۔

غیر مسلموں میں دعوت

ایک قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ مسلمانوں میں اصلاح وارشاد کا جو کام ہورہا ہے، بہت سے لوگوں نے فریضۂ دعوت کی ادائیگی کے لئے اس کو کافی سمجھ لیا ہے، یہ بھی بنیادی غلط فہمی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو عقیدہ وعمل کے انحراف سے بچائے، یہ بھی فی الجملہ دعوتِ دین میں شامل ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات سے بھی عمل صالح کی بیعت لی ہے، جو پہلے سے مسلمان تھے، خود مسلمانوں کو ایمان پر استقامت کی دعوت دیتے ہوئے کہا گیا: ''يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اٰمِنُوْا'' (النساء:۱۳۶) قرآن مجید نے مسلمانوں کو آپس میں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا ہے:

> وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ، يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ، اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ، اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۔ (التوبۃ:۷۱)
>
> مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہوکر رہے گی، یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم ودانا ہے۔

لیکن یہ سمجھنا کہ فریضۂ دعوت کو ادا کرنے کے لئے یہی کافی ہے، قطعاً درست نہیں، حقیقت یہ ہے کہ دعوتِ دین کے اصل مخاطب کفار و مشرکین ہیں؛ کیوں کہ :

(الف) قرآن مجید میں جن انبیاء اور ان کی اقوام کا ذکر آیا ہے، اگر ان کا مطالعہ کیا جائے اور قرآن میں انبیاء اور ان کی اقوام کے جو مکالمات مذکور ہیں، ان کو دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسی فیصد سے بھی زیادہ ان کے مخاطب ان کے عہد کے کفار و مشرکین تھے۔

(ب) خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے ۲۳ سالہ عہدِ نبوت میں ابتداءِ نبوت سے فتح مکہ بلکہ حجۃ الوداع تک مشرک قبائل ہی میں دعوتی کوششیں فرمائیں۔

(ج) اگر ایک شخص کی بیماری معمولی ہو اور دوسرا شخص زیادہ بیمار ہو، تو فطری طور پر انسان پہلے زیادہ بیمار شخص کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور یقیناً کفر کی بیماری فسق عملی سے کہیں بڑھ کر ہے؛ کیوں کہ کافر کتنے بھی اچھے عمل کرے، وہ دوزخ سے بچ نہیں سکتا اور مومن کے اعمال کتنے بھی خراب ہوں، وہ انجام کار انشاء اللہ جنت میں داخل ہوگا۔

(د) قرآن مجید میں بہت سے مواقع پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ہے اور سب سے بڑا معروف ''ایمان باللہ'' ہے اور سب سے بڑا منکر ''کفر و شرک''؛ اسی لئے بعض اہل علم کے نزدیک تو قرآن میں جہاں بھی معروف کا لفظ کہا جائے، وہاں ایمان مراد ہوتا ہے اور جہاں بھی منکر کا ذکر آئے، وہاں اس سے کفر مراد لیا جاتا ہے؛ چنانچہ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں :

> **قوله تعالیٰ ''یامرون بالمعروف'' ای بعبادة الله وتوحیده وکل ما اتبع ذلک : ''وینهون عن المنکر'' عن عبادة الاوثان وکل ما اتبع ذلک ، وذکر الطبری عن ابی العالیه انه قال کل ما ذکر لله فی القرآن من الامر بالمعروف والنهی عن المنکر ، فهو النهی عن عبادة الاوثان والشیاطین ۔** (تفسیر طبری:۸/۲۰۳)
>
> اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ''**یامرون بالمعروف**'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی عبادت، توحید اور جو باتیں اس کے تابع ہیں، اس کا حکم دیتے ہیں اور ''**ینهون عن المنکر**'' سے مراد یہ ہے کہ بتوں کی پرستش وغیرہ

> سے منع کرتے ہیں اور طبری نے ابو العالیہ سے نقل کیا ہے کہ قرآن میں
> جہاں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم ہے، بتوں اور شیطانوں
> کی پوجا سے روکنا ہی مقصود ہے۔

لہٰذا جن اُمور کی دعوت دی جائے، ان میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، ایک یہ کہ دعوت اُصولِ دین کی طرف دی جائے، اپنے مذہب و مسلک کی طرف نہیں، دوسرے: دعوتِ دین کے اصل مخاطب وہ لوگ ہیں، جو ابھی دامن اسلام میں نہیں آئے ہیں، مسلمانوں میں دعوت کو فریضۂ دعوت کی ادائیگی کے لئے کافی نہیں سمجھا جائے۔

اس سلسلہ میں ممتاز صاحب علم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا ایک اقتباس نقل کرنا مناسب ہوگا :

> تبلیغ تو اصل میں اسے ہی کہیں گے، جس کو آپ پوچھ رہے ہیں، تبلیغ
> احکام حقیقتاً تبلیغ نہیں ہے، اسے مجازاً تبلیغ کہا جاتا ہے، حقیقت میں تبلیغ
> اس کا نام ہے کہ غیر مسلموں کو دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کی دعوت
> دی جائے۔(۱)

حضرات ! حقیقت یہ ہے کہ جامعہ دار السلام عمر آباد نے بہ حیثیت ایک دینی درسگاہ، برادرانِ وطن میں دعوت کے کام کی طرف منظم توجہ کے اعتبار سے ہندوستان کی دوسری جامعات پر سبقت کی ہے اور پورے ملک میں اسے ایک تحریک بنانے میں اس کا نمایاں حصہ ہے، نیز اس وقت دعوتی کام کے سلسلہ میں یہ ہندوستان گیر اجتماع بھی اس کی نہایت قابل قدر کوشش ہے، اس سلسلہ میں جامعہ ہذا، اس کے ناظم عالی مقام حضرت مولانا کاکا سعید عمری حفظہ اللہ اور ان کے رفقاء کی مساعی جمیلہ کی جس قدر تحسین کی جائے کم ہے۔

دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اس اجتماع کو قبول فرمائے اور اس کو اس ملک میں دعوتی کاموں میں فروغ کے لئے بہترین ذریعہ بنائے۔

ربنا تقبل منا إنک أنت السمیع العلیم ۔

● ● ●

(۱) دو اہم مسئلے، یعنی تبلیغ کی اہمیت اور تبلیغ سے تعلیم کا جوڑ: ۴۸، ناشر: مدرسہ تعلیم القرآن لپٹری، جونپور: ۱۴۱۵ھ۔

غیر مسلم معاشرہ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے روابط ☆

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد المرسلين ، وعلى آله و صحبه أجمعين ، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين۔

جناب صدر، بزرگان محترم! یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ ''کل ہند مجلس تعمیر ملت'' نے معروف قائد نیز جان پُرسوز، دل دردمند اور فکر ارجمند کی مالک شخصیت اور تنظیم کے بانی جناب سید خلیل اللہ حسینیؒ سے منسوب سالانہ توسیعی خطبہ کے لئے ''غیر مسلم معاشرہ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے روابط'' جیسے اہم موضوع کا انتخاب کیا ہے، یہ جہاں اپنے بزرگوں کو یاد رکھنے کا ایک بہتر طریقہ ہے، وہیں تنظیم کی بصیرت، شعور وآگہی اور زمانہ شناسی کی دلیل بھی ہے، نیز قائد محترم سے اس موضوع کی مناسبت بھی ظاہر ہے؛ کیوں کہ آصف جاہی حکومت کے سقوط کے بعد جناب سید خلیل اللہ حسینی صاحب مرحوم نے پوری جرأت اور بالغ نظری کے ساتھ مسلمانوں کی رہنمائی کی اور انھیں بتایا کہ وہ غیر مسلم اکثریت والے اقتدار کے زیر سایہ اپنے ملی تشخص کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کریں اور کس طریقہ پر رواداری اور بھائی چارہ کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے وجود کو تحلیل ہونے سے بھی بچائیں، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ 'مجلس تعمیر ملت' نے اپنی عمر کے پچاس سال پورے ہونے پر شرعی نقطۂ نظر سے ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی، تہذیبی اور مذہبی مسائل پر غور کرنے کے لئے ایک اہم سیمینار منعقد کیا تھا، جو اس موضوع پر ملک میں غالباً پہلا سیمینار تھا، اس کے بعد متعدد تنظیموں اور اداروں نے اس موضوع پر مذاکرہ کی مجلسیں منعقد کیں، جس کو اسی سیمینار کی صدائے بازگشت کہا جاسکتا ہے، اس طرح آج کا توسیعی خطبہ تنظیم کی ان فکری کوششوں کا تسلسل ہے۔

حضرات ! رسول اللہ ﷺ جس وقت اس دنیا میں تشریف لائے، اس وقت اکثر علاقوں میں مملکت کا مذہب متعین ہوتا تھا، دوسرے مذاہب کے لوگوں کو یا تو وہاں رہنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی

☆ مجلس تعمیر ملت حیدرآباد کی دعوت پر سید خلیل اللہ حسینیؒ توسیعی خطبات کے پروگرام میں دیا جانے والا خطبہ۔

یا کم سے کم انھیں اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی اجازت نہیں دی جاتی تھی، ایرانی حکومت کا مذہب آتش پرستی تھا، ان کے مذہبی تعصب کا حال یہ تھا کہ وہ رومیوں کے جن علاقوں پر قابض ہوتے تھے، وہاں عیسائیوں کے مذہبی مقامات کی ایک ایک اینٹ اُکھاڑ پھینکتے تھے، روم میں وہ عیسائیت نافذ تھی، جو درحقیقت سینٹ پال کی ایجاد تھی، یہاں بُت پرستوں کو تو رہنے کا موقع ہی نہیں تھا، یہودیوں کے لئے بھی عرصۂ حیات تنگ تھا؛ بلکہ عیسائیوں کے وہ فرقے جنھیں مرتد قرار دے دیا گیا تھا اور جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ماننے کو تیار نہیں تھے، وہ بھی رومی سلطنت میں اس کی وسعت کے باوجود کوئی جائے پناہ نہیں پاتے تھے اور ایسے علاقوں کی پناہ حاصل کئے ہوئے تھے، جہاں باضابطہ کوئی حکومت نہیں تھی، جیسے حجاز وغیرہ کا علاقہ۔

جب مکہ سے دین حق کا سورج طلوع ہوا تو اسی مزاج کے تحت کفر کی تاریکیوں کے لئے یہ ایک ناقابل قبول واقعہ تھا؛ چنانچہ مسلمانوں پر ایسے مظالم توڑے گئے اور ناانصافیاں روا رکھی گئیں، جو نہ صرف انسانیت کے خلاف تھیں؛ بلکہ عربوں کی مسلّمہ قبائلی روایات کے بھی خلاف تھیں؛ اسی لئے بالآخر مسلمانوں کو ہجرت کا حکم دیا گیا اور رسول اللہ ﷺ اور آپ کے رفقاء ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے، چنانچہ ایک طویل عرصہ تک عام معمول یہی رہا کہ جب کسی خطہ پر غیر مسلموں کا اقتدار مستحکم ہوجاتا تو مسلمان وہاں سے عالم اسلام کی طرف رخت سفر باندھتے؛ تاکہ وہ پوری آزادی کے ساتھ اپنے مذہب پر عمل کرسکیں، ہاں کہیں کہیں ایسا ضرور ہوا کہ مقامی حکمراں کے منصفانہ مزاج کو دیکھتے ہوئے اور ان کی طرف سے ملنے والی مذہبی آزادی کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کا کوئی گروہ وہاں قیام پذیر ہوگیا؛ لیکن بڑے پیمانہ پر ایسے واقعہ کا ظہور غالباً سقوط اندلس کے بعد ہوا، جہاں مسلمانوں کے آخری فرمانروا نے اس معاہدہ کے ساتھ اقتدار کی کلید عیسائی فرمانروا کے حوالہ کی کہ جو مسلمان یہاں رہنا چاہیں، انھیں اپنے مذہب پر عمل کی پوری آزادی حاصل ہوگی، ان کی عبادت گاہیں قائم رہیں گی اور انھیں وہ تمام حقوق دیئے جائیں گے، جنھیں آج ''انسانی حقوق'' کہا جاتا ہے؛ چنانچہ قرطبہ، غرناطہ اور بلنسیہ وغیرہ میں مسلم آبادی کے چھوٹے چھوٹے جزیرے موجود تھے؛ جیسا کہ علامہ ابن ہمامؒ (م:۸۶۱) اور دوسرے فقہاء کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، افسوس کہ عیسائی حکمرانوں نے اس معاہدہ کا ذرا بھی پاس و لحاظ نہیں رکھا اور کچھ ہی عرصہ بعد ایسے روح فرسا مظالم ڈھائے کہ شاید ہی انسانی تاریخ میں انسانیت سوزی اور ظلم و جور کی ایسی مثال مل سکے، مسلمانوں کا نہ صرف قتل عام کیا گیا؛ بلکہ انھیں سمندر

کی بے رحم موجوں کے حوالہ بھی کر دیا گیا اور بالآخر تھوڑے ہی عرصہ میں اسپین فرزندان توحید سے خالی ہوگیا اور مسلمان یا تو یہاں سے ہجرت کر گئے یا انھوں نے راہ حق میں دار ورسن کو گلے لگایا۔

حضرات ! یورپ میں کلیسا اور حکومت کی طویل جنگ اور کلیسا کی شکست پر اس جنگ کے اختتام نے ایک نئے تصور کو جنم دیا کہ سلطنت کا اپنا کوئی مذہب نہ ہو جس پر ملک میں رہنے والے تمام شہری عمل کرنے کے پابند ہوں ؛ بلکہ مذہب کو ایک نجی مسئلہ کا درجہ حاصل ہو اور ہر شہری کو نجی زندگی میں اپنے اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی ہو، اس تصور نے جہاں لادینیت کو فروغ دیا اور انسانیت کو اس سے نا قابل تلافی نقصان پہنچا، وہیں اس کا ایک مثبت پہلو یہ تھا کہ مغرب میں مذہبی جور وتشدد ختم ہوا اور پوری دنیا میں بڑے پیمانہ پر مذہبی اقلیتیں وجود میں آئیں ؛ اسی لئے آج دنیا میں مذہبی، تہذیبی اور لسانی اقلیتوں کے اعداد وشمار جمع کئے جائیں تو شاید وہ اکثریتی فرقے سے بھی بڑھ جائیں، یہی وجہ ہے کہ آج پوری دنیا میں اقلیتوں کے حقوق کو خصوصی اہمیت حاصل ہوگئی ہے ، جو بین الاقوامی معاہدات کا ایک حصہ ہے، اور یہ ضروری بھی ہے ؛ کیوں کہ اگر اکثریت ظلم وجور پر اُتر جائے اور فرقہ پرستی کا مظاہرہ کرنے لگے تو بعض اوقات ''اکثریتی آمریت'' شخصی آمریت سے بھی بڑھ جاتی ہے۔

خود مسلمان بھی بہ حیثیت اقلیت آج مشرق سے مغرب تک دنیا کے ہر علاقہ میں موجود ہیں اور کہا جاتا ہے کہ پوری دنیا کی مسلم آبادی کا قریب قریب پچاس فیصد حصہ غیر مسلم ممالک میں آباد ہے، بیسویں صدی میں بہ حیثیت اقلیت مسلمانوں کی کثرت کے بہت سے اسباب ہیں، جن میں چند خاص طور پر قابل ذکر ہیں :

اول : یہ کہ مغرب کی استعماری طاقتوں نے جب عالم اسلام پر قبضہ کیا تو وہ مزدور اور کارکن کی حیثیت سے بڑی تعداد میں زیر قبضہ ممالک سے مسلمانوں کو اپنے یہاں لے گئے، جیسے فرانس میں بڑی تعداد میں موجود جزائری مسلمان یا جنوبی افریقہ میں مَلے نسل کے لوگ۔

دوسرے : مغربی ملکوں نے ایک پالیسی یہ بھی اختیار کی کہ مسلمان ملکوں میں اپنے پسندیدہ اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے وہاں کی مسلمان آبادی کو مغربی ملکوں میں منتقل ہونے کی ترغیب دی جائے ؛ چنانچہ فلسطین اور بوسنیا وغیرہ سے بڑی تعداد میں مسلمانوں کو مغربی ملکوں میں پناہ دی گئی۔

تیسرے : مسلمان حکومتوں میں جمہوریت اور انسانی حقوق سے محرومی اور سیاسی مخالفین کے ساتھ مظالم کے باعث بھی بہت سے مسلمان یورپ اور امریکہ کی طرف منتقل ہوئے، ان تارکین وطن

کو اظہار رائے کی آزادی حاصل ہوئی اور مغربی ملکوں کو یہ فائدہ ہوا کہ انھیں اپنے یہاں ان حکومتوں کے ایک اپوزیشن گروپ کو رکھنے اور ان کی پرورش کرنے کا موقع ملا؛ تاکہ بوقت ضرورت ان ملکوں کی حکومت کو غیر مستحکم کیا جاسکے اور وہاں اپنی پسند کے حکمراں رکھے جاسکیں، عراق، افغانستان اور مغربی کنارہ (فلسطین) کے حکمراں اس کی واضح مثال ہیں۔

چوتھے: مغرب کی صنعتی ترقی کی وجہ سے وہاں کارکنوں کی ضرورت بڑھی اور مغرب میں شرح پیدائش کی کمی نے اس ضرورت میں مزید اضافہ کردیا، دوسری طرف چوں کہ مغرب نے عالم اسلام پر جدید ٹکنالوجی کا راستہ بند کر رکھا ہے، یہ ممالک صنعتی ترقی کے اعتبار سے عام طور پر بہت پیچھے ہیں، اور یہاں کے ہنرمندوں اور مزدوروں کو مقامی طور پر حسبِ ضرورت کسبِ معاش کے مواقع فراہم نہیں ہیں؛ اس لئے ایک بڑی تعداد ایشیائی ملکوں سے مغرب کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔

زیادہ تر یہی اسباب ہیں، جن کی وجہ سے غیر مسلم ممالک میں مسلمان اقلیتوں کی اچھی خاصی تعداد ہے، اس کے علاوہ ادھر چند دہوں سے عالم اسلام سے بہت سے مسلمان دعوتی نقطۂ نظر سے بھی مغرب منتقل ہوئے ہیں اور وہاں اسلام قبول کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے، خاص کر نائن الیون کے بعد سے؛ لیکن افسوس کہ دعوتی نقطۂ نظر سے ہجرت کرنے والے تارکین وطن اور ان کی کوششوں سے اسلام قبول کرنے والے نومسلموں کی تعداد ابھی بھی بہت تھوڑی ہے؛ البتہ ہندوستان کی نوعیت شاید پوری دنیا سے مختلف ہے، جہاں مسلمانوں نے تقریباً ایک ہزار سال حکومت کی اور وہاں تارکین وطن کے بجائے مقامی اور پشتینی مسلمان آباد ہیں، پھر بھی وہ اقلیت میں ہیں، اسلامی تاریخ میں شاید ہی اس کی کوئی مثال ملے کہ مسلمان کسی خطہ میں اتنے طویل عرصہ تک برسر اقتدار رہنے کے باوجود اقلیت میں رہے ہوں، یقیناً دعوت دین سے بے توجہی نے انھیں اس صورتِ حال سے دوچار کیا ہے۔

حضرات! عام طور سے کثیر مذہبی معاشرہ کا بانی مغرب کو سمجھا جاتا ہے؛ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس کی بنیاد اسلام نے رکھی ہے، رسول اللہ ﷺ ہجرت سے پہلے چاہتے تھے کہ اہل مکہ اگر اسلام قبول نہ بھی کریں تو کم سے کم مسلمانوں کو اسلام پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کی اجازت دے دیں؛ چنانچہ اہل مکہ نے رسول اللہ ﷺ کو صلح کے دو فارمولے پیش کئے، ایک یہ کہ ہم دِنوں کی تقسیم کرلیں، کچھ دن ہمارے دیویوں اور دیوتاؤں کی عبادت ہوا کرے، جس میں آپ بھی شریک ہوں، اور کچھ دن آپ کے خدا کی عبادت ہو اور اس میں ہم بھی شرکت کریں، دوسرا فارمولہ یہ تھا کہ

دنوں کی تقسیم نہ ہو؛ بلکہ روزانہ آپ کے خدا کی بھی عبادت ہو اور ہماری دیویوں اور دیوتاؤں کی بھی، اور ان دونوں کی عبادت میں آپ کی بھی شرکت ہو اور ہم سب کی بھی، قرآن مجید نے بتایا کہ یہ دونوں فارمولے قابل عمل نہیں ہیں؛ چوں کہ توحید و شرک ایک دوسرے کی ضد ہیں، جس طرح دن و رات اور روشنی و تاریکی ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے، اسی طرح توحید اور شرک کا جمع ہونا بھی ممکن نہیں؛ البتہ قرآن مجید نے ایک تیسرا فارمولہ پیش کیا کہ اگر اہل مکہ ایمان لانے پر تیار نہیں ہیں تو یہ بات قابل عمل ہو سکتی ہے کہ مشرکین اپنے دین پر عمل کریں اور مسلمانوں کو ان کے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت دیں "**لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ**" (الکافرون:٦) — اس طرح ایک ایسا تکثیری معاشرہ وجود میں آسکتا ہے، جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے بقائے باہم کے اصول پر امن کے ساتھ زندگی گذاریں۔

حضرات! رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اس کی دوسری مثال ہجرت حبشہ کا واقعہ ہے، حبشہ میں حکومت کا مذہب عیسائیت تھا، اگرچہ ٦ ؍ہجری کے بعد رسول اللہ ﷺ کے دعوتی مکتوب سے متاثر ہو کر حبشہ کے فرمانروا اصحمہ نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا؛ لیکن جس وقت مسلمانوں نے ہجرت کی اس وقت بادشاہ عیسائی تھا اور نجاشی کے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی حبشہ کے لوگ یا پورے حکمراں گروہ کے ایمان لانے کا ذکر نہیں ملتا؛ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے نجاشی کی وفات پر غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی؛ البتہ نجاشی ایک عادل اور انصاف ور حکمراں تھا اور اس نے مسلمانوں کو مذہبی آزادی اور شہریوں کو حاصل ہونے والے دوسرے حقوق کے ساتھ حبشہ میں رہنے کی اجازت دی تھی، اسی لئے حبشہ ہجرت کرنے والے صحابہ کرام ﷺ حکومت حبشہ کے ساتھ دلی ہمدردی رکھتے تھے اور جب ان پر بعض دشمنوں نے حملہ کیا اور جنگ کی نوبت آئی تو ان کے لئے دُعاء بھی فرماتے تھے۔

کثیر مذہبی معاشرہ کی تیسری نظیر 'میثاق مدینہ' ہے، جب آپ نے مدینہ ہجرت فرمائی تو اس وقت مدینہ میں تین قومیں آباد تھیں، مسلمان، یہودی اور مشرکین؛ چنانچہ آپ نے ایک معاہدہ کرایا، جس کا حاصل یہ تھا کہ مدینہ میں رہنے والے تمام گروہوں کو اپنے اپنے مذہب پر چلنے کی اجازت ہوگی؛ لیکن جب مدینہ پر کوئی بیرونی دشمن حملہ کرے گا تو سب مل کر مدینہ کا دفاع کریں گے، اس معاہدہ پر آپ نے یہودیوں اور عربوں کے تمام قبائل سے دستخط کروائے، پھر رفتہ رفتہ مدینہ کے مشرکین اپنی مرضی سے مسلمان ہو گئے اور یہودیوں کے ساتھ آپ نے اس معاہدہ کو اس وقت تک قائم رکھا، جب تک ان کی طرف سے کھلی ہوئی بدعہدی اور وعدہ خلافی کی نوبت نہیں آ گئی۔

غرض کہ کم سے کم یہ تین مثالیں رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ایک ایسے معاشرہ کی ملتی ہے، جس میں مختلف مذاہب کے لوگوں کو اپنے مذہب پر عمل کرتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا موقع فراہم کیا گیا، ان میں سے خاص کر مکہ اور حبشہ کی مثالیں مسلمان اقلیت کے اکثریت کے ساتھ تعلقات کی بنیاد فراہم کرتی ہیں، پھر اس تکثیری معاشرہ کے تصور کو آگے بڑھاتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق مقرر فرمائے اور انھیں نہ صرف جان و مال، عزت و آبرو، معاشی جد و جہد وغیرہ میں آزادی عطا کی؛ بلکہ انھیں اپنے مذہب پر عمل کرنے کا بھی پورا پورا حق دیا گیا، یہ اس طریقۂ عمل کے بالکل برعکس تھا، جو اس زمانہ کی حکومتوں میں مروج تھا اور جس میں مذہبی اقلیتوں کو کوئی حق حاصل نہیں ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں جتنی مسلم حکومتیں قائم ہوئیں، ان کے زیر سایہ مختلف مذاہب پر یقین رکھنے والے لوگوں نے امن وسکون کے ساتھ زندگی بسر کی اور اس حکومت کو اپنے لئے سایۂ رحمت سمجھا، شام سے لے کر اسپین تک ہر جگہ عیسائیوں کو پوری آزادی دی گئی، ہندوستان میں ہندو بھائیوں کے حقوق اور خاص کر ان کی مذہبی آزادی کا پورا پاس ولحاظ رکھا گیا، یہود جب عالم عیسائیت کے ظلم وجور کا نشانہ تھے اور انھیں مختلف علاقوں میں مارے مارے پھرنا پڑتا تھا، اس وقت ان کے لئے سب سے محفوظ پناہ گاہ عالم اسلام ہی تھی، جہاں وہ اپنے تمام تشخصات کے ساتھ باعزت طور پر زندگی گذارتے تھے؛ اس لئے شریعتِ اسلامی میں مسلمانوں کے لئے بہ حیثیت اقلیت برادرانِ وطن کے ساتھ زندگی گزارنے کے اُصول کی رہنمائی بھی ہے اور ایک ایسے کثیر مذہبی سماج کا تصور بھی، جس میں مسلمانوں کے زیر اقتدار غیر مسلم حضرات پوری آزادی، انسانی حقوق اور عزت نفس کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں۔

حضرات! مسلمان جب کسی مشترکہ معاشرہ میں رہتے ہیں تو عموماً اور جب وہ اس معاشرہ میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں تو خصوصاً مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان روابط کے سلسلہ میں تین بنیادی اُصولوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، اول: انسانی وحدت، دوسرے: ہم وطنی کے حقوق اور تیسرے: اسلامی تشخصات کی حفاظت۔

انسانی وحدت

اسلام کا بنیادی عقیدہ ''وحدتِ اِلٰہ'' ہے، یعنی خدا ایک ہے اور وہی پوری کائنات کا خالق ہے، مخلوق خواہ کتنی بھی عظیم ہو وہ خدا نہیں ہوسکتی، یہ اسلام کے تمام افکار کی بنیاد اور احکامِ شریعت کی جڑ

اور اصل ہے، ''وحدتِ اِلٰہ'' ہی سے دوسرا تصور ''وحدتِ انسانیت'' کا پیدا ہوتا ہے، یعنی جب تمام انسان خدا کی مخلوق اور اس کے محتاج ہیں تو وہ سبھی پیدائشی اعتبار سے درجہ و مرتبہ میں یکسانیت کے حامل ہیں؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے آخری خطبہ میں ان دونوں حقیقتوں کو جمع کرتے ہوئے فرمایا: ''**إن أباكم واحد، وإن ربكم واحد وكلكم من آدم وآدم من تراب**'' (سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في التفاخر بالأحساب، حديث نمبر: ۵۱۱۶، عن أبي هريرة) یعنی تم سب کا رب ایک ہے، اور تم سب کے باپ بھی ایک ہی ہیں، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے، قرآن مجید میں انسانی وحدت کے اس تصور کو واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا :

> **يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْراً وَّنِسَآءً۔** (النساء:۱)
>
> اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد وعورت دنیا میں پھیلا دیئے۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا گیا :

> **وَهُوَ الَّذِىْٓ أَنْشَأَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ۔** (الانعام:۹۸)
>
> اور وہی ہے جس نے ایک جان سے تم کو پیدا کیا پھر ہر ایک کے لئے ایک جائے قرار ہے اور ایک اس کے سونپے جانے کی جگہ۔

اسلام سے پہلے مختلف مذاہب نے خاندانی بنیاد پر برتری اور کہتری کا مصنوعی تصور قائم کر رکھا تھا، عرب عجم کو حقیر سمجھتے تھے، اسرائیلیوں کے نزدیک غیر اسرائیلی ایک کمتر درجہ کی مخلوق تھے اور اصل میں وہ بنی اسرائیل کی خدمت کے لئے پیدا کئے گئے تھے، ہندو مذہب میں تو سماجی تفریق اپنی انتہاء کو پہنچی ہوئی تھی، جہاں 'برہمن' معبودوں کا مقرب ترین گروہ تھا، وہیں 'شودر' ایسے بدقسمت تھے کہ ان کے کانوں کو 'ویدوں' کے سننے کی بھی اجازت نہ تھی، اسی طرح ایرانی اپنے آپ کو ایک بالاتر مخلوق تصور کرتے تھے، ان کے نزدیک آریائی حکومت کرنے ہی کے لئے پیدا کئے گئے تھے

اور شاہی خاندان کے بارے میں تو ان کا خیال تھا کہ ان کی رگوں میں خدا کا خون دوڑتا ہے، ان حالات میں شریعتِ محمدی (ﷺ) دنیا میں آئی اور قرآن نے اعلان کیا کہ خاندان تعارف اور پہچان کے لئے ہے، اس سے عظمت و حقارت کا تعلق نہیں ہے اور نہ ان کو تفاخر کا سبب سمجھنا جائز ہے :

إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ أُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْباً وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا ۔ (الحجرات:۱۳)

ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں؛ تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔

اسلام نے ایک بنیادی اور انقلابی فکر دی کہ جو چیزیں بطور اتفاق کے انسان کو حاصل ہوتی ہیں، جیسے کسی کا سفید فام یا سیاہ فام ہونا، یا عربی اور عجمی ہونا، ان کی وجہ سے ایک انسان کو دوسرے انسان پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوتی؛ بلکہ فضیلت اور عزت و مرتبت کا معیار اکتسابی چیزیں ہیں، جن کے حاصل کرنے میں انسان کی محنت اور اس کے اختیار کو دخل ہوتا ہے، چنانچہ ارشاد نبوی (ﷺ) ہے :

لا فضل لعربي على عجمي ولا لأبيض على أسود ، إن أكرمكم عند الله أتقاكم ۔

کسی عربی کو عجمی پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، اللہ کے نزدیک تم سے سب سے زیادہ باعزت وہ ہے، جو سب سے زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والا ہو۔

انسانی وحدت کا یہ تصور عالمگیر انسانی اُخوت اور بھائی چارہ کو وجود میں لاتا ہے، اس لئے کوئی شخص مسلمان ہو یا غیر مسلم 'انسانی اُخوت' اسے ایک ڈوری میں پرو دیتی ہے، اسلامی تصور کے تحت وہ ایک دوسرے کا بھائی ہے، سارے انسان انسانیت کے وسیع کنبہ کا حصہ اور ایک وسیع تر انسانی خاندان کے افراد ہیں؛ اسی لئے قرآن نے بحیثیت انسان ہر ابن آدم کو قابل احترام قرار دیا ہے :

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ آدَمَ ۔ (بنی اسرائیل:۷۰)

ہم نے انسان کو معزز بنایا ہے۔

نیز اس کے نزدیک تخلیق کے اعتبار سے انسانی ڈھانچہ بہترین قالب ہے :

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۔ (التین:۴)

ہم نے انسان کو بہترین قالب میں پیدا کیا ہے۔

یہ تکریم واحترام تمام بنی نوعِ انسانی سے متعلق ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے عملی طور پر اس حقیقت کو واضح فرمایا، ایک بار ایک یہودی کا جنازہ جارہا تھا، آپ ﷺ کھڑے ہوگئے، لوگوں نے عرض کیا کہ یہ یہودی کا جنازہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جان تو اس میں بھی ہے، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۳۱۲، باب من قام لجنازۃ یہودی) غزوۂ احزاب کے موقع سے ایک مشرک مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا، اہل مکہ نے خواہش کی کہ اس کی قیمت لے کر نعش ان کے حوالہ کردیں، تو آپ ﷺ نے کوئی قیمت لئے بغیر نعش واپس کردی؛ کیوں کہ انسانی نعش کی قیمت وصول کرنا انسانی احترام کے مغائر ہے، اسلام سے پہلے جنگ کا کوئی قانون نہیں تھا اور لوگ مقتول کے اعضاء تراش کر ہار پہنتے اور اپنی آتش انتقام بجھاتے تھے، اسلام نے ایک تو حتی المقدور جنگ سے بچنے کا حکم دیا؛ لیکن اگر اس کی نوبت آہی جائے تو جنگ کے مہذب قوانین مقرر کئے، من جملہ ان کے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص گرفت میں آجائے تو ایذاء پہنچا پہنچا کر قتل نہ کیا جائے اور جو مارے جائیں، ان کے اعضاء کاٹے نہ جائیں کہ یہ احترامِ انسانیت کے خلاف ہے۔

کافر و ذمی کا لفظ اہانت آمیز نہیں

اسلام بحیثیتِ انسان کسی غیر مسلم کی توہین وتحقیر کو بھی رَوا نہیں رکھتا، بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ غیر مسلم کے لئے ''کافر'' اور ''ذمی'' کا لفظ استعمال کرکے ان کی تحقیر کی گئی ہے، اسی طرح آج کل بعض غیر مسلم بھائی ''کافر'' کے لفظ کو اہانت آمیز اور حقارت انگیز خیال کرتے ہیں، یہ محض غلط فہمی اور پروپیگنڈہ ہے، ''کفر'' کے معنی انکار کے ہیں، قرآن مجید میں یہ لفظ انکار ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے، چنانچہ منکرین آخرت کے بارے میں ارشاد ہوا: ''**وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ**'' (**یوسف:۳۷**) اہل مکہ کو ان باتوں سے انکار تھا، جن کی دعوت رسول اللہ ﷺ دیا کرتے تھے؛ اس لئے وہ کہتے تھے: ''**اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ**'' (**الزخرف:۲۴**) یعنی: ''آپ جس دین کو لے کر بھیجے گئے ہیں، ہم اس کا انکار کرتے ہیں'' اسی طرح جادو کے انکار پر بھی کفر کا اطلاق کیا گیا ہے، چنانچہ بعض انبیاء علیہم السلام کے مخالفین کا قول نقل گیا ہے :

قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۔ (**الزخرف:۳۰**)

انھوں نے کہہ دیا کہ یہ تو جادو ہے اور ہم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔

پس ''کافر'' کے معنی انکار کرنے والے، یعنی ایسے شخص کے ہیں، جو توحید اور اسلامی تعلیمات

کو قبول نہیں کرتا ہو، گویا یہ غیر مسلم "Non Muslim" کا ہم معنی لفظ ہے، پس یہ ایک حقیقت کا اظہار ہے نہ کہ کسی شخص کی توہین، اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد مواقع پر اس عہد کے غیر مسلموں کو ''کافر'' کے لفظ سے مخاطب کیا گیا ہے؛ لیکن انھوں نے اس کا برا نہیں مانا، اگر یہ لفظ اہانت آمیز ہوتا تو یقیناً انھوں نے اس طرزِ تخاطب پر اعتراض کیا ہوتا، پھر باوجودیکہ یہ لفظ اہانت آمیز نہیں ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو ''اے کافر!'' کہنے سے ایذاء ہوتی ہو، تو اس شخص کو اس طرح خطاب نہ کیا جائے اور اگر کرے گا، تو گنہگار ہوگا :

ولو قال لذمی یاکافر! یأثم إن شق علیه ۔ (الأشباہ والنظائر: ۲/۲۵۷)

اگر کسی نے کسی ذمی کو اے کافر کہہ کر پکارا اور اس پر یہ گراں گذرتا ہو تو اے کافر کہنے والا شخص گناہ گار ہوگا۔

اسی طرح عربی زبان میں ''ذمۃ'' کے معنی ''عہد'' کے ہیں، ''ذمی'' اس شخص کو کہا جاتا ہے، جس کی حفاظت کا عہد کیا جائے، چنانچہ عربی زبان کی مشہور لغت ''لسان العرب'' میں ہے :

رجل ذمی ، معناہ له عهد ۔ (لسان العرب: ۵/۵۹)

''مردِ ذمی'' کے معنی ایسے شخص کے ہیں، جس کے لئے عہد کیا گیا ہو۔

اسی طرح علامہ ابن اثیرؒ اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہ غیر مسلم اقلیت کو اہل ذمہ کیوں کہا جاتا ہے؟ رقمطراز ہیں :

سمی أهل الذمة لدخولهم في عهد المسلمین وأمانهم۔ (النہایۃ: ۲/۱۶۸)

اہل ذمہ اس لئے نام رکھا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے عہد اور ان کی امان میں داخل ہو جاتے ہیں۔

اس لئے یہ محض غلط فہمی ہے کہ قرآن مجید اور حدیثِ نبوی ﷺ میں غیر مسلموں کے لئے اہانت آمیز تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

ہم وطنوں کی حیثیت

حضرات ! انسان دنیا میں اپنے لئے ایسی جگہ کا محتاج ہوتا ہے، جہاں اس کا مستقل قیام ہو سکے اور انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ جہاں پیدا ہوتا ہے اور بود و باش اختیار کرتا ہے، اس سرزمین سے

اسے ایک محبت اور خصوصی نسبت سی ہو جاتی ہے، یہ محبت کوئی مذموم عمل نہیں ہے؛ چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ کو سرزمین مکہ سے بڑی محبت تھی، جب آپ نے مکہ سے ہجرت کی تو مکہ سے نکلتے ہوئے ارض مکہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

ما أطيبک من بلد ، وأحبک إليّ ، ولو لا أن قومي أخرجوني منک ماسکنت غيرک ۔ (۱)

تو کتنا پاکیزہ اور مجھے کس قدر محبوب شہر ہے، اگر میری قوم نے مجھے تیری زمین سے نکالا نہ ہوتا تو میں کہیں اور مقیم نہ ہوتا۔

پھر جب آپ نے مدینہ منورہ کو اپنا وطن بنایا تو دُعاء فرمائی :

اللهم حبب إلينا المدينة كما حببت مكة أو أشد ۔ (۲)

اے اللہ! جیسے مکہ کی محبت آپ نے میرے اندر پیدا فرمائی تھی، ویسی ہی؛ بلکہ اس سے بڑھ کر محبت ہمارے دل میں مدینہ کی پیدا فرما دے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کو مدینہ سے ایسی محبت ہوئی کہ جب آپ سفر سے واپس تشریف لاتے اور مدینہ کے کنارے پر واقع کوہِ اُحد پر نظر پڑتی تو آپ کا روئے انور چمک اُٹھتا اور سواری کی رفتار تیز ہو جاتی؛ یہاں تک کہ مکہ کے فتح ہو جانے کے بعد بھی آپ نے مدینہ کو اپنا وطن باقی رکھا؛ بلکہ مکہ میں نماز سفر ادا فرمائی اور حج وعمرہ کے موقع سے جب بھی مکہ تشریف آوری ہوئی، آپ نے وہاں حسبِ ضرورت ہی قیام فرمایا، غرض کہ وطن سے محبت اگر شرعی حدود میں ہو اور ناانصافی اور تعصب کا باعث نہ بنے تو بری بات نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ جب وطن سے محبت ہوگی تو اہل وطن سے محبت ہونا بھی فطری بات ہے اور ان میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں ہوں گے؛ اسی لئے اسلام میں جس طرح اُخوت کا ایک دائرہ مسلمانوں کے درمیان ہے، اسی طرح جو ہم وطن ہیں، وہ بھی ہمارے بھائی ہیں، —— بعض حضرات کو خیال ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کو کیسے بھائی کہا جاسکتا ہے؟ لیکن قرآن مجید کی تعبیر کو دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال درست نہیں ہے اور ہم وطنوں کے ساتھ بھی مسلمان ''وطنی اُخوت'' کا رشتہ رکھتے ہیں،

(۱) ترمذی، کتاب المناقب، مسند أبي يعلى: ۵/ ۶۹، وصحيح ابن حبان: ۹/ ۲۰۷، وقال الهيثمي في مجمع الزوائد: ۳/ ۲۱۵، رواه أبو يعلى ورجاله ثقات۔

(۲) بخاری، کتاب المرضی، باب من دعا برفع الوباء والحمی، ومسلم، کتاب الحج، ومسند احمد، حديث السيدة عائشة۔

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ انبیاء کو ان کی ہم وطن قوموں کا بھائی قرار دیا گیا، اس سلسلہ میں یہ آیتیں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں :

● كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِيْنَ ، إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلاَ تَتَّقُوْنَ ۔ (الشعراء:۱۰۵-۱۰۶)

قومِ نوح نے رسولوں کو جھٹلایا، یاد کرو جب کہ ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا تھا ''کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟''

● كَذَّبَتْ عَادُ الْمُرْسَلِيْنَ ، إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ هُوْدٌ أَلاَ تَتَّقُوْنَ ۔ (الشعراء:۱۲۳-۱۲۴)

عاد نے رسولوں کو جھٹلایا، یاد کرو جب کہ ان کے بھائی ہود نے ان سے کہا تھا ''کیا تم ڈرتے نہیں؟''

● كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ، إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ ، صَالِحٌ أَلاَ تَتَّقُوْنَ ۔ (الشعراء:۱۴۱-۱۴۲)

ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا، یاد کرو جب کہ ان کے بھائی صالح نے ان سے کہا تھا ''کیا تم ڈرتے نہیں؟''

● كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍ الْمُرْسَلِيْنَ ، إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ ، لُوْطٌ أَلاَ تَتَّقُوْنَ ۔ (الشعراء:۱۶۰-۱۶۱)

لوط کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا، یاد کرو جب کہ ان کے بھائی لوط نے ان سے کہا تھا ''کیا تم ڈرتے نہیں؟''

اس سلسلہ میں یہ نکتہ خاص طور پر غور کئے جانے کے لائق ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے دو قوموں میں دعوت حق کا فریضہ انجام دیا، ایک مدین نامی شہر کے باشندوں میں، جس سے آپ کا وطنی تعلق تھا، دوسرے اصحابِ ایکہ میں، تو قرآن نے جہاں اہل مدین میں حضرت شعیب کی دعوت کا ذکر کیا ہے وہاں خاص طور پر رشتۂ اُخوت کا ذکر فرمایا ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے :

وَإِلَى مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْباً ۔ (الأعراف:۸۵، هود:۸۴، العنكبوت:۳۶)

اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔

— اور جہاں اصحابِ ایکہ میں دعوت کا ذکر ہے وہاں رشتۂ اُخوت کا ذکر نہیں کیا گیا ہے :

کیوں کہ حضرت شعیب علیہ السلام وہاں کے رہنے والے نہیں تھے :

كَذَّبَ اَصۡحَابُ الۡاَيۡكَةِ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ، إِذۡ قَالَ لَهُمۡ شُعَيۡبٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ۔ (الشعراء:۱۷۶-۱۷۷)

اصحاب الایکہ نے رسولوں کو جھٹلایا، یاد کرو جب کہ شعیب نے ان سے کہا تھا ''کیا تم ڈرتے نہیں؟''

غرض کہ جیسے انسانی اُخوت کا عالمگیر رشتہ پوری دنیا کے انسانوں کے درمیان وسیع تر بھائی چارہ کی تشکیل کرتا ہے، اسی طرح ایک دائرہ وطنی اُخوت کا بھی ہے، جو تمام ہم وطنوں کو بھائی بھائی قرار دیتا ہے، خواہ مذہب کے اعتبار سے ان کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہو۔

اسلامی تشخصات کی حفاظت

بزرگانِ محترم ! مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، ضروری ہے کہ ان پر دین کی محبت تمام محبتوں؛ یہاں تک کہ خونی رشتوں پر بھی مقدم ہو؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يَٓا اَيُّهَا الَّذِيۡنَ آمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا اٰبَاءَكُمۡ وَإِخۡوَانَكُمۡ اَوۡلِيَاءَ إِنِ اسۡتَحَبُّوۡا الۡكُفۡرَ عَلَى الۡاِيۡمَانِ ، وَمَنۡ يَّتَوَلَّهُمۡ مِّنۡكُمۡ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۔ (التوبۃ:۲۳)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں، تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے۔

اسی لئے کسی مسلمان کے لئے قطعاً اس بات کی گنجائش نہیں ہوسکتی کہ وہ کسی بھی دوسرے تعلق پر دین کے تعلق کو قربان کردے، یہی وجہ ہے کہ جب بھی انبیاء اور ان کے متبعین کے لئے اپنے وطن میں رہ کر دین حق پر عمل کرنا مشکل ہوگیا، انھیں وہاں سے ہجرت کر جانے کا حکم دیا گیا، سیدنا حضرت ابراہیم، حضرت شعیب، حضرت موسیٰ، حضرت لوط اور حضرت صالح —— علیہم الصلوٰۃ و السلام —— وغیرہ کی ہجرت کے واقعات قرآن مجید میں تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں، نیز تحفظ دین ہی کے لئے مسلمانوں کو بھی مکہ سے ہجرت کرنے کا حکم فرمایا گیا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

قُلۡ إِنۡ كَانَ آبَاؤُكُمۡ وَأَبۡنَاؤُكُمۡ وَإِخۡوَانُكُمۡ وَأَزۡوَاجُكُمۡ

وَعَشِيْرَتُكُمْ ، وَأَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا ، وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا ، وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِّنَ اللهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ ، فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَأْتِيَ اللهُ بِأَمْرِهٖ ، وَاللهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ ۔ (التوبة:۲۴)

اے نبی! کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز واقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا۔

اس لئے اسلام مسلمانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ کثیر مذہبی معاشرہ میں رہتے ہوئے بھی اپنی شناخت اور پہچان کو باقی رکھیں اور برادرانِ وطن کے ساتھ اپنی پہچان کو گم نہ کرلیں، یہی روح ہے اس بات کی کہ رسول اللہ ﷺ نے دوسری اقوام کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے؛ چنانچہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے :

لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ بِغَيْرِنَا ، لَا تَشَبَّهُوا بِالْيَهُوْدِ وَلَا بِالنَّصَارٰى الخ ۔ (**الجامع للترمذی**، حدیث نمبر: ۲۶۹۵، کتاب الاستیذان)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو دوسروں کی مشابہت اختیار کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے، یہودیوں اور عیسائیوں سے مماثلت اختیار نہ کرو۔

اس تشبّہ اور مماثلت کے چار مدارج ہو سکتے ہیں :

(الف) دوسری قوموں کے مذہبی شعائر میں مماثلت اختیار کی جائے، جیسے مسلمان صلیب یا زنار پہننے لگیں، یا سکھوں کے جو مخصوص شعائر ہیں، ان کو استعمال کریں، فقہاء نے اسے باعثِ کفر قرار دیا ہے؛ چنانچہ مجوسی خاص قسم کی ٹوپی پہنا کرتے تھے، فقہاء نے اس کے بارے میں کہا ہے :

وَلَوْ وَضَعَ عَلٰى رَأْسِهٖ قَلَنْسُوَةَ الْمَجُوْسِ كَفَرَ ۔ (۱)

اگر اپنے سر پر مجوسیوں کی خاص ٹوپی پہنے تو یہ کفر ہے۔

---

(۱) **الملتقط فی الفتاویٰ الحنفیة: ۲۴۵۔**

فقہاء کے یہاں زنار کے بارے میں بھی اسی طرح کی صراحت ملتی ہے، ہندوستان میں قشقہ لگانے کا حکم بھی یہی ہے؛ کیوں کہ وہ ہندو بھائیوں کے مذہبی شعائر میں سے ہے۔

(ب) غیر مسلم مذہبی تہواروں میں شرکت — یہ اگر یوں ہی ہو یا اس کا مقصد اپنے گمان کے مطابق رواداری ہو، تب بھی جائز نہیں اور اگر ان کے مذہبی معتقدات اور افعال پر خوشنودی ورضامندی کا اظہار اور تائید وتحسین مقصود ہو، تو کفر ہے: ''**إِنَّمَا الرِّضَا بِالْكُفْرِ مُسْتَحْسِنًا كُفْرٌ**'' (**الملتقط:**۲۴۵) — کوئی شخص جس مذہب پر عقیدہ نہ رکھتا ہو اور اپنے عقیدہ کے مطابق اس کو نادرست خیال کرتا ہو، اس میں شرکت اور اس پر رضامندی وخوشنودی کا اظہار کھلی ہوئی دو عملی اور نفاق کی بات ہے؛ اس لئے اسلام نہ مسلمانوں کے لئے اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ ایسا منافقانہ رویہ اختیار کریں اور نہ غیر مسلموں سے خواہش کرتا ہے کہ وہ اسلامی شعائر کو اختیار کریں اور مسلمانوں کے مذہبی تہواروں میں شریک ہوں۔

(ج) تیسرا درجہ 'تہذیبی تشبّہ' کا ہے، یعنی ایسی وضع قطع اور لباس، جو کسی خاص قوم کی شناخت بن گئی ہو اور اس کا مذہب سے تعلق نہ ہو، کو اختیار کرنا، جیسے ہندوستان میں دھوتی، کہ اس کا مذہب سے تعلق نہیں؛ لیکن یہ ہندو بھائیوں کی پہچان سی بن گئی ہے، اگر کسی کو دھوتی میں ملبوس دیکھا جائے تو ذہن اسی طرف جاتا ہے کہ وہ ہندو ہے، ایسی مشابہت اور مماثلت اختیار کرنا مکروہِ تحریمی ہے، علامہ ابن تیمیہؒ نے اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ (دیکھئے: **اقتضاء الصراط المستقیم:**۹۴/۱)

لیکن تشبّہ کی اس جہت میں تبدیلی آتی رہتی ہے؛ کیوں کہ اگر کوئی وضع ایک عہد میں کسی قوم کی پہچان بن گئی ہو اور بعد کو اس کا استعمال عام ہو جائے اور وہ کسی خاص مذہبی گروہ کی شناخت باقی نہ رہ جائے تو پھر تشبّہ کی کیفیت ختم ہو جائے گی اور اس کا استعمال جواز کی حد میں آجائے گا، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کوٹ، پینٹ کے بارے میں (امداد الفتاویٰ: ۲۶۸/۴ سوال نمبر: ۳۴۵) اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے ساری کے متعلق یہی لکھا ہے۔ (**کفایت المفتی:**۱۶۱/۹)

(د) جو ملبوسات اور تقریبات کسی خاص مذہبی گروہ کی پہچان نہیں ہیں، ان کے اختیار کرنے اور ان میں شریک ہونے کی گنجائش ہے، بہ شرطیکہ کسی اور سبب سے شریعت نے ان کو منع نہیں کیا ہو، اسی طرح انتظام وانصرام سے متعلق اُمور، جیسے طرزِ تعمیر، دفتری نظم ونسق، تجارتی طور وطریق وغیرہ میں غیر مسلم بھائیوں کے طریقۂ کار سے استفادہ کرنے میں کچھ حرج نہیں، حضرت عمرؓ نے حساب

وکتاب کے نظام میں روم وایران کے طریقوں سے استفادہ کیا تھا،(**الفاروق:۲/۱۳۰**) آپ ﷺ نے غزوۂ احزاب میں حضرت سلمان فارسی ؓ کے مشورہ پر اہل فارس کے طریقہ پر خندق کھودوائی تھی۔(**البداية والنهاية:۴/۹۵**)

یہ اس بات پر دلیل ہے کہ ایسے اُمور میں غیر مسلم بھائیوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں۔

تشبّہ اور مماثلت سے بچنے کا جو اصولی حکم شریعتِ اسلامی میں دیا گیا ہے، وہ تعصب اور تنگ نظری پر مبنی نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ شناخت کی حفاظت ایک فطری عمل ہے، غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی صورت اور آواز کو ایک دوسرے سے ممتاز رکھا ہے، انسان کے اندر شناخت کی حفاظت کا جذبہ اتنا بے پناہ ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم اپنی شناخت الگ رکھنا چاہتی ہے، اپنے تمدن کی حفاظت کرتی ہے، اپنے جھنڈے الگ رکھتی ہے، ہر اسکول اپنا مستقل یونیفارم رکھتا ہے، گورنمنٹ کے مختلف محکموں کے الگ الگ یونیفارم ہوتے ہیں، یہ سب شناخت ہی سے متعلق ہیں؛ اس لئے اپنی شناخت کی حفاظت کوئی مذموم عمل نہیں ہے اور نہ اس میں دوسروں کی مخالفت اور ان کے تئیں تنگ نظری کا اظہار ہے، اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان اپنی پہچان کو باقی رکھیں اور جہاں اسلامی نظام نافذ ہو، وہاں غیر مسلم بھائیوں کو بھی اس بات کی پوری آزادی فراہم کی جائے کہ وہ اپنی مذہبی وتہذیبی شناخت کے ساتھ زندگی گذاریں۔

مذہبی شناخت کی حفاظت ہی سے متعلق ایک اہم مسئلہ شریعت اسلامی پر عمل کا بھی ہے۔

شریعت اسلامی پر عمل

مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، مسلم ممالک میں یا غیر مسلم ممالک میں، دین کے چار شعبوں میں ان کے لئے قانونِ شریعت کا التزام ضروری ہے، اعتقادات، عبادات، احوالِ شخصیہ اور معاملات۔

اعتقادات سے مراد وہ احکام ہیں، جن کا تعلق قلب وضمیر سے ہو، جیسے: توحید، رسالت، آخرت کا یقین وغیرہ۔

’’عبادات‘‘ سے وہ احکام مراد ہیں، جن کا تعلق براہِ راست خدا اور بندے کے باہمی ارتباط سے ہے، جیسے: نماز، روزہ وغیرہ۔

''احوالِ شخصیہ'' سے مراد Parasnal Law ہے، اس میں نکاح و طلاق کے علاوہ میراث، وصیت اور مختلف اقارب سے متعلق حقوق وفرائض بھی آجاتے ہیں۔

''معاملات'' سے مراد مالی بنیاد پر دو افراد کے تعلقات ومعاہدات ہیں: تجارت، اجارہ، ہبہ وغیرہ اس شعبہ کے تحت آتے ہیں اور سود وقمار جیسے حرام معاملات بھی اسی دائرہ میں ہیں۔

یہ تمام قوانین وہ ہیں کہ چاہے مسلم اکثریت ملک ہو یا غیر مسلم اکثریت ملک، اور کلیدِ اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو یا نہیں ہو، مسلمانوں کے لئے ان قوانین میں شریعتِ اسلامی کی اطاعت واجب ہے، جو قوانین اجتماعی نوعیت کے ہوں، یا جرم وسزا سے متعلق ہوں، جیسے حدود، قصاص، نظامِ مملکت وغیرہ، ان شعبوں سے متعلق شرعی قوانین وہیں قابل نفاذ ہیں، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور باگِ اقتدار ان کے ہاتھوں میں ہو، پس غیر مسلموں سے تعلقات ان قوانین پر عمل آوری کے حق سے دست برداری اور محرومی کی قیمت پر استوار نہیں کئے جاسکتے اور اس سلسلہ میں کسی تبدیلی کو قبول کرنے کا مطالبہ فی نفسہٖ نامعقول بھی ہے؛ کیوں کہ مسلمانوں کے ان پر عمل کرنے اور نہ کرنے سے غیر مسلم بھائیوں کو نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ کوئی نقصان۔

یہ تین بنیادی اُصول ہیں، انسانی وحدت کا تصور، وطنی اُخوت کا تصور اور مذہبی شناخت کی حفاظت — ان کی روشنی میں مسلمان اقلیت کے غیر مسلموں سے تعلقات کے بارے میں غور کیا جاسکتا ہے، یہاں اس بات کی وضاحت بھی مناسب ہوگی کہ غیر مسلم اقلیت (ذمی) کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں اسلام میں جو تعلیمات دی گئی ہیں اور جن کا فقہاء نے ذکر کیا ہے وہ غیر مسلم اکثریت کے ساتھ روابط کے سلسلہ میں بھی ہمیں رہنمائی کرتی ہیں؛ کیوں کہ غیر مسلم اقلیت کے ساتھ جس حسن سلوک کی دعوت دی گئی ہے اس میں تو احسان اور حسن سلوک پیش نظر ہے اور غیر مسلم اکثریت کے ساتھ روابط سے قومی، ملی اور مذہبی مفادات کا تحفظ بھی متعلق ہے، اس لئے ان کے ساتھ تو بدرجۂ اولیٰ ہمیں بہتر روابط رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

باہمی روابط وتعلقات

برادرانِ اسلام ! جہاں تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی روابط کی بات ہے تو اس موضوع کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: سماجی تعلقات، معاشی تعلقات، سیاسی تعلقات اور مذہبی تعلقات، تعلقات کے ان تمام دائروں کے سلسلے میں قرآن وحدیث سے ہمیں تفصیلی رہنمائی ملتی ہے۔

سماجی تعلقات

سماجی تعلقات کے سلسلہ میں بنیادی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے :

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۔ (الممتحنة:۸)

جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کرتے اور نہ انھوں نے تم کو تمہارے گھر سے نکالا ہے، اللہ تعالیٰ تم کو ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور انصاف برتنے سے نہیں روکتے، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

یہ آیت بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور اس سے یہ بات واضح ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں سے برسر پیکار نہ ہوں، مسلمانوں پر ان کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ کرنا ضروری ہے، قرآن نے صاف کہا ہے کہ کسی قوم کا ہدایت کے راستہ پر آنا اور دین حق کو قبول کرنا اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے؛ لیکن اس کی وجہ سے کسی گروہ کے ساتھ بے تعلقی کا معاملہ کرنا اور حسن سلوک سے رک جانا درست نہیں، مسلمان ان کے ساتھ جو بہتر سلوک کریں گے، انھیں بہر حال اس کا اجر مل کر رہے گا :

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰاهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ، وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۔ (البقرة:۲۷۲)

ان لوگوں کی ہدایت آپ کے ذمہ نہیں ہے، اللہ جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور تم جو کچھ مال خرچ کرتے ہو، وہ اپنے ہی لئے، اور خرچ نہیں کرتے ہو مگر اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں، اور جو بھی خرچ کرو گے تم کو پورا پورا دیا جائے گا، (یعنی اس کا اجر ملے گا) اور تم پر ظلم نہیں ہوگا۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بعض انصار کی بنو قریظہ اور بنو نضیر کے یہودیوں سے قرابت تھی، انصار ان پر اس لئے صدقہ نہیں کیا کرتے تھے کہ جب ضرورت مند ہوں گے

تو اسلام قبول کریں گے، (**تفسیر قرطبی: ۳/۳۳۷**) اللہ تعالیٰ نے ان کے اس رویہ کو پسند نہیں کیا اور فرمایا گیا کہ ان کی ہدایت کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے؛ لیکن تم کو اس کی وجہ سے اپنا دستِ تعاون نہ کھینچنا چاہیے؛ کیوں کہ تم کو تمہارے انفاق کا اجر مل کر رہے گا۔

آپ اللہ ﷺ اور آپ کے رفقاء نے عملی طور پر اس کو برت کر دکھایا، مکہ میں شدید قحط پڑا، لوگ مردار وغیرہ کھانے پر مجبور ہو گئے، یہ زمانہ مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان شدید اختلاف اور گرما گرمی کا تھا، اس کے باوجود آپ ﷺ نے مکہ کے قحط زدہ مشرکین کے لئے پانچ سو دینار بھیجے؛ حالاں کہ اس وقت خود مدینہ کے مسلمان سخت مالی دقتوں اور فاقہ مستیوں سے دو چار تھے، نیز آپ ﷺ نے یہ رقم سردارانِ قریش ابوسفیان اور صفوان بن اُمیہ کو بھیجی، جو مسلمانوں کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور مشرکین مکہ کی قیادت کر رہے تھے۔ (**ردّالمحتار: ۳/۳۰۲، باب المصرف**)

حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے غیر مسلم کو دیکھا کہ وہ بھیک مانگ رہا ہے، جب حضرت عمرؓ نے وجہ پوچھی تو کہا کہ ہمیں جزیہ ادا کرنا ہے، حضرت عمرؓ نے بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر فرمایا اور کہا: ہم نے تمہاری جوانی کو کھایا اور اب پھر تم سے جزیہ وصول کریں، یہ انصاف کی بات نہیں ہے:

''**ما أنصفناک أکلنا شیبتک ، ثم نأخذ منک الجزیة**'' (**نصب الرایة: ۳/۴۵۴**)

چنانچہ فقہاء کے یہاں اس پر تو قریب قریب اتفاق ہے کہ صدقاتِ نافلہ غیر مسلموں کو دیا جاسکتا ہے، حنفیہ کے نزدیک راجح یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقاتِ واجبہ بھی غیر مسلموں کو دیے جاسکتے ہیں۔ (دیکھئے: **الدر المختار علی هامش ردالمحتار: ۳/۳۰۱**)

غرض کہ مسلمانوں کا رویہ اپنی غیر مسلم اکثریت کے ساتھ حسن سلوک کا ہونا چاہئے، اور مالی اعانت و غمخواری میں ان کو بھی شریک کرنا چاہئے۔

انسانی زندگی کا احترام وتحفظ

سماجی زندگی میں سب سے اہم مسئلہ امن و امان کا ہے اور امن و امان کا تعلق جان و مال اور عزت و آبرو سے ہے؛ چنانچہ شریعتِ اسلامی میں غیر مسلموں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو وہی اہمیت دی گئی ہے، جو مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو حاصل ہے، اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے یہ اصولی بات ارشاد فرمائی ہے کہ ان کے خون ہمارے خون کی طرح اور ان کے مال ہمارے مال کی طرح ہیں :

دِمَائُهُمْ كَدِمَائِنَا ، وَأَمْوَالُهُمْ كَأَمْوَالِنَا ۔ (نصب الراية: ۳۶۹/۴)

چنانچہ قرآن مجید نے مطلق نفس انسانی کے قتل سے منع کیا ہے، ارشاد ہے:

لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلاَّ بِالْحَقِّ ۔ (بنی اسرائیل: ۳۳)

کسی نفس کو جس کے قتل کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے، ناحق قتل نہ کرو۔

ایک اور موقع پر کسی معقول سبب کے بغیر ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا گیا:

مَنْ قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِيْ الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعاً ۔ (المائدہ: ۳۲)

جس نے کسی نفس انسانی کو کسی دوسرے کے بدلے یا زمین میں فساد کے بغیر قتل کیا تو گویا اس نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا۔

کیوں کہ اگر کوئی شخص ایک بے قصور شخص کو قتل کر سکتا ہے تو وہ انسانیت کے کسی بھی فرد کو قتل وغارت گری کا نشانہ بنا سکتا ہے؛ اس لئے گویا وہ پوری انسانیت کا قاتل ہے، ان آیات میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی قید نہیں ہے؛ بلکہ مطلقاً کسی بھی انسان کے قتل کو منع فرمایا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایسے غیر مسلم — جس سے امن اور بقاءِ باہم کا معاہدہ ہو — کے قاتل کے بارے میں فرمایا کہ وہ جنت کی بو سے بھی محروم رہے گا:

مَنْ قَتَلَ مُعَاهِدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ ، وَاِنَّ رِيْحَهَا يُوْجَدُ مِنْ مَسِيْرَةِ اَرْبَعِيْنَ عَامًا ۔ (بخاری، عن عبداللہ بن عمرو، حدیث نمبر: ۳۱۶۶)

جس نے کسی معاہد (وہ غیر مسلم جس سے پُرامن زندگی گزارنے کا معاہدہ ہو) کو قتل کیا، وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا؛ حالاں کہ اس کی بو چالیس سال کے فاصلہ سے محسوس کی جاسکتی ہے۔

اگر کوئی مسلمان غیر مسلم کو قتل کر دے تو مسلمانوں کو بھی اس کے قصاص میں قتل کر دیا جائے گا؛ کیوں کہ قرآن مجید نے علی الاطلاق قصاص کا یہی اصول بتلایا ہے، جو شخص دوسرے شخص کا قاتل ہو، وہ اس کے بدلے قتل کیا جائے گا: ''اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ'' (المائدہ: ۴۵) اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ایک غیر مسلم (ذمی) کے قصاص میں ایک مسلمان کو قتل کیا گیا، (مصنف عبد الرزاق: ۱۰۱/۱۰)

حضرت عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے ''ذمی'' کے بدلے مسلمان کے قتل کا حکم دیا، (مصنف عبدالرزاق: ۱۰/۱۰۱) امام شافعیؒ نے حضرت علیؓ سے بھی نقل کیا ہے کہ انھوں نے بعض اہل ذمہ کو قتل کرنے والے مسلمانوں کو قتل کرنے کا حکم فرمایا۔ (مسند امام شافعی، السنن البیہقی: ۱۲/ ۴۳)

اگر مقتول کے ورثاء سزاءِ قتل کو معاف کردیں، یا قتل کے واقعہ میں قصد وارادہ کو دخل نہ ہو؛ بلکہ غلطی سے قتل کا ارتکاب ہوا ہو تو ان صورتوں میں قصاص کے بدلہ خون بہا (دیت) واجب ہوتا ہے؛ چنانچہ خون بہا بھی مسلمان اور غیر مسلم کا یکساں ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے غیر مسلم کی دیت مسلمان ہی کی طرح ادا کی، (سنن دارقطنی، کتاب الحدود) حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابوہریرہ، حضرت اسامہ بن زید اور مختلف صحابۂ کرامؓ سے منقول ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم کی دیت برابر ہوگی، علامہ زیلعیؒ نے تفصیل سے ان روایتوں کو نقل فرمایا ہے۔ (دیکھئے: نصب الرایہ: ۴/ ۶۸-۳۶۹)

ظاہر ہے کہ جان اور زندگی کے احترام میں اکثریت اور اقلیت کا کوئی فرق نہیں ہے؛ بلکہ بحیثیت انسان ہر شخص کی زندگی کا احترام واجب ہے، سوائے اس کے کہ کسی شخص نے اپنی مجرمانہ حرکتوں کی وجہ سے اپنے اس حق کو کھو دیا ہو۔

املاک کا احترام

رسول اللہ ﷺ نے جو اصول مقرر فرمایا کہ غیر مسلموں کی جانیں مسلمانوں کی جانوں کی طرح ہیں اور ان کے مال مسلمانوں کے مالوں کی طرح ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی املاک بھی اسی طرح قابل احترام ہیں جیسا کہ مسلمانوں کی، بغیر رضامندی کے نہ کسی مسلمان کا مال لیا جاسکتا ہے نہ کسی غیر مسلم کا: ''**اِلَّا اَنۡ تَکُوۡنَ تِجَارَۃً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡکُمۡ**''۔ (النساء: ۲۹)

فتح خیبر کے موقع سے بعض مسلمان فوجیوں نے یہودیوں کے جانور ذبح کردیئے اور کچھ پھل کھالئے، رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے اس موقع پر خطاب کیا، اس عمل پر ناگواری ظاہر کی اور فرمایا کہ یہ تمہارے لئے حلال نہیں ہے۔ (ابوداود، حدیث نمبر: ۳۰۵۰)

متعدد صحابہؓ سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے:

أَلاَ مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا أَوْ انْتَقَصَهُ أَوْ كَلَّفَهُ فَوْقَ طَاقَتِهِ أَوْأَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بِغَيْرِ طِيبِ نَفْسٍ ، فَأَنَا حَجِيجُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۰۵۳)

آ گاہ ہوجاؤ! جس نے کسی معاہد پر ظلم کیا، اس کی حق تلفی کی یا اسے اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف کیا یا اس سے کوئی چیز اس کی رضامندی کے بغیر لے لی، تو میں قیامت کے دن اس کا فریق ہوں گا۔

اسلامی قانون کی رو سے چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، جیسے مسلمان کا مال چوری کرنے میں ہاتھ کاٹا جائے گا، اسی طرح اگر کوئی مسلمان چور غیر مسلم کا مال چوری کرلے تو اس صورت میں بھی اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ نے یہ لکھتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ یہ مسئلہ فقہاء کے یہاں متفق علیہ ہے، (المغنی لابن قدامہ: ۱۲/۴۵۱، مع تحقیق: عبداللہ بن عبدالمحسن وغیرہ) اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں مسلمان اور غیر مسلم کی ملکیت یکساں قابل احترام ہے۔

عزت وآبرو کی حفاظت

یہی معاملہ عزت وآبرو اور عفت وعصمت کی حفاظت کا ہے، رسول اللہ ﷺ نے بلاتفریق مذہب ہر بڑے کی توقیر کا حکم دیا ہے اور ہر چھوٹے کے ساتھ شفقت اور محبت کی تلقین کی ہے، مؤمنوں سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْراً مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْراً مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ ۔ (الحجرات:۱۱)

اے ایمان والو! ایک گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے، ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہو اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا تمسخر کریں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، نہ ایک دوسرے پر طعن کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب دو۔

اسی طرح مردوں سے فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنی نگاہوں اور شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور یہی حکم مسلمان عورتوں کو بھی دیا گیا، (النور:۳۱) یہ حکم مطلق ہے اور اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق نہیں ہے، معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی عزت وآبرو کی بھی وہی اہمیت ہے، جو مسلمانوں کی ہے، عفت وعصمت کو مجروح کرنے والی چیزیں حرام ہیں، خواہ مسلمانوں کے ساتھ کی جائیں یا غیر مسلموں کے ساتھ،

جو سزا کسی مسلمان عورت کی آبروریزی کی ہے، وہی سزا غیر مسلم عورت کی آبروریزی کی ہے، غرض کہ عزت وآبرو کے اعتبار سے غیر مسلم بھائیوں کو وہی درجہ حاصل ہے، جو مسلمانوں کو حاصل ہے۔

خوشی وغم میں شرکت

سماجی تعلقات کے دائرہ میں کھانا، کھلانا، پڑھنا، پڑھانا، باہمی ملاقات، خوشی وغم کے موقع پر دلداری وغیرہ اُمور بھی آتے ہیں، اسلام نے ان تمام شعبوں میں غیر مسلموں کے ساتھ بھی خوش گوار برتاؤ کا حکم دیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلموں کی دعوت قبول فرمائی ہے، (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۶۱۷، باب قبول الہدیۃ من المشرکین) خود غیر مسلموں کو دعوت دی ہے (الدر المنثور: ۵/۱۸۱) انھیں اپنا مہمان بنایا ہے (الخصائص الکبریٰ: ۱/۱۲۳) اپنے رفقاء کو غیر مسلم بزرگوں کی تجہیز وتکفین کے انتظام کا حکم دیا ہے (اعلاء السنن: ۸/۲۸۲، باب ما یفعل المسلم اذا مات لہ قریب کافر) نیز غیر مسلموں کی عیادت کی ہے، (صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۵۶۵۷، باب عیادۃ المشرک) رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں فقہاء نے غیر مسلموں سے متعلق جو احکام دیے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں :

- مجوسی کا ہر قسم کا کھانا جائز ہے، سوائے ذبیحہ کے۔
- مسلمان اور مشرک رشتہ دار کے ساتھ صلہ رحمی کرنا درست ہے، وہ نزدیک کا ہو یا دور کا، اور ذمی ہو یا حربی، حربی سے مراد وہ شخص ہے، جو دشمن ملک کا شہری ہو۔
- مسلمانوں کے لئے عیسائی پڑوسی سے مصافحہ کرنا درست ہے۔
- یہودی اور عیسائی کی عیادت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔
- جب کسی غیر مسلم کی وفات ہو جائے تو اس کے عزیز سے عیادت کے لئے یہ الفاظ کہے جائیں :

اَخْلَفَ اللهُ خَيْرًا مِّنْهُ وَ أَصْلَحَكَ ۔ (هندية: ۵/ ۳۸۴)

اللہ تجھ کو اس کا نعم البدل عطا فرمائے اور تمہاری حالت کو بہتر کرے۔

آج ضرورت ہے کہ سماجی زندگی سے متعلق تقریبات میں غیر مسلم بھائیوں کو مدعو کیا جائے اور اگر وہ دعوت دیں تو ان کی دعوت میں شرکت کی جائے؛ کیوں کہ سماجی تعلقات ہی خوشگوار تعلقات کے قیام میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

معاشی تعلقات

محترم حضرات ! معاشی تعلقات کے معاملہ میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی تفریق نہیں ،نبوت کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ کا ابوسفیان اور جبیر بن مطعم کے ساتھ مضاربت کرنا منقول ہے ، اسی طرح خیبر کے فتح ہونے کے بعد آپ ﷺ نے وہاں کی اراضی یہودیوں کے قبضہ میں ہی رہنے دیں اور ان سے بٹائی پر معاملہ طے کرلیا،جس کا بخاری اور مختلف کتبِ احادیث میں ذکر موجود ہے،(صحیح البخاری،حدیث نمبر:۴۲۴۸،باب معاملۃ النبی علی اہل خیبر) مسلمانوں کے لئے یہ بات درست ہے کہ وہ کسی غیر مسلم کے یہاں ملازمت کریں،چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی کے یہاں مزدوری کی ہے،کتبِ احادیث میں اس کا ذکر ہے،(کنزالعمال:۳۲۱/۲) حضرت خباب رضی اللہ عنہ لوہاری کے فن سے واقف تھے،انھوں نے عاص بن وائل کے لئے کام کیا،اس کا ذکر بھی احادیث میں موجود ہے:''**خباب كان قينا فعل للعاص بن وائل**''۔(بخاری،حدیث نمبر:۲۳۷۵،مسلم،حدیث نمبر:۷۰۶۲)

اسی طرح یہ بات بھی درست ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کو اپنے یہاں ملازمت کا موقع دیں، عرب میں سڑکوں کا کوئی باضابطہ نظام نہیں تھا اور پورا خطۂ عرب ریت سے ڈھکا ہوا تھا،اسی لئے راستہ کی شناخت دشوار ہوتی تھی اور جن لوگوں کو شناخت نہیں ہوتی تھی ، وہ سفر میں کسی راہ بتانے والے کو ساتھ لے جاتے تھے،ان کو''دلیل'' کہا جاتا تھا،جس کے معنی راہبر کے ہیں،رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو ایک مشرک کو اپنے لئے بطورِ'دلیل' اجرت دے کر ساتھ رکھا،(احکام اہل الذمۃ لابن قیم:۲۰۷) اسی لئے فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمان غیر مسلم کو اپنے یہاں ملازم رکھ سکتے ہیں: ''**يجوز أن يكون الأجير ذميا والمستأجر مسلما بلا خلاف**''۔(الموسوعۃ الفقہیۃ:۱۰۵،مادہ:اجارہ)

چنانچہ مسلم عہدِ حکومت میں غیر مسلم حضرات بڑے اونچے اور کلیدی عہدوں پر فائز رہے ہیں،حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں حمص کا فینانشیل کمشنر اور حاکم ابن اُثال نامی ایک عیسائی تھا،عبدالملک بن مروان کا کاتب ابن سرجون تھا،یہ بھی عیسائی تھا،کاتب کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اسی سے فرامینِ سلطنت کی مراسلت متعلق تھی اور بقول علامہ شبلیؒ وہ وزیر اعظم کے برابر یا اس سے دوسرے درجہ پر خیال کیا جاتا تھا،عباسی دور میں ابواسحاق صابی اس منصب پر فائز تھا، سلطنت دیلم کے تاجدار عضد الدولہ جیسے عظیم فرمانروا کا وزیر اعظم بھی ایک عیسائی تھا،جس کا نام نصر بن ہارون تھا،یہ تمام فرمانروا نہ صرف اپنی طاقت وحکمرانی میں ممتاز تھے؛ بلکہ مذہب سے بھی ان کا

خاص تعلق تھا؛ لیکن ان کی مذہبیت غیر مسلم بھائیوں سے سلطنت کے اہم اور کلیدی شعبوں میں خدمت لینے میں حارج نہیں ہوئی۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: مقالاتِ شبلی: ۲/۲۱۷-۲۱۹)

معاشی تعلقات میں اضافہ خاص کر غیر مسلم اکثریت کے ساتھ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے مفاد میں ہے اور تعلقات ہمیشہ دو طرفہ بنیادوں پر قائم ہوتے ہیں ، اگر مسلمان غیر مسلم تاجروں اور کاروباریوں سے تعلقات رکھنے اور کاروبار کرنے میں گریز سے کام لیں تو اس سے اکثریتی فرقہ میں بھی تعصب کے جذبات پروان چڑھیں گے اور انجام کار یہ چیز خود مسلمانوں کے حق میں نقصاندہ ہوگی ،اس لئے ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ایسا ماحول پیدا نہ ہو،اس کی نظیر خود حیات طیبہ میں موجود ہے کہ مشرکین مکہ نے تو مسلمانوں کا معاشی اور سماجی بائیکاٹ کیا؛ لیکن مسلمانوں نے اہل مکہ کا بائیکاٹ نہیں کیا اور بعض ایسے علاقے جہاں سے مکہ کی تجارتی رسد روکی جاسکتی تھی ،کو بھی روکا نہیں گیا،اسی طرح مدینہ میں یہودی قبائل کے اچھے خاصے مارکٹ موجود تھے اور مسلمان بھی بلا امتیاز وہاں سے مال خریدتے تھے اور ان سے کاروباری تعلق رکھتے تھے۔

سیاسی تعلقات

حضرات ! انسان جس خطہ میں رہتا ہو، وہاں کے سیاسی حالات سے بے تعلق نہیں رہ سکتا ، کیوں کہ سیاسی مد و جزر اور اتار چڑھاؤ کا اثر زندگی کے تمام شعبوں پر پڑتا ہے اور بڑی حد تک سماج کا امن وامان بھی ان حالات سے متعلق ہوتا ہے؛ چنانچہ اسلام میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی روابط کی گنجائش رکھی گئی ہے، سیاست کا مقصد ملک میں قانون کی حکمرانی کو قائم رکھنا اور مستحکم بنانا ہے، رسول اللہ ﷺ جب اس دنیا میں تشریف لائے ، اس وقت حجاز کے علاقہ میں کوئی باضابطہ حکومت موجود نہیں تھی ؛ البتہ قبائلی روایات اور دستور کے مطابق تحفظ ہوا کرتا تھا اور لوگوں کے باہمی تعلقات قائم رہتے تھے۔

سیاسی اشتراک

اسی زمانہ میں مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا کہ مکہ کے ایک شخص نے ایک بیرونی شخص کا حق ادا کرنے سے انکار کردیا ، چوں کہ اُس کا تعلق مکہ سے نہیں تھا اور مکہ میں اس کے ہم قبیلہ لوگ بھی نہیں تھے ،اس لئے ممکن نہ تھا کہ وہ بزورِ طاقت اپنا حق حاصل کرسکے ،اس غریب الوطن شخص نے صحن کعبہ

میں اہل مکہ کو اپنی بپتا سنائی اور ان کے ضمیر سے انصاف کے طلب گار ہوئے، اس موقع سے کچھ لوگ اس کی مدد کے لئے کھڑے ہوئے اور عبداللہ بن جدعان کے مکان پر ایک نشست ہوئی، اس میں آپ ﷺ نے بھی پوری سرگرمی سے شرکت کی اور اس طرح ''حلف الفضول'' نامی ایک تنظیم قائم ہوئی، جس کا مقصد انصاف کو قائم کرنا، ظلم کو روکنا اور ظالم کے خلاف مزاحمت کرنا تھا، یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا تھا؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کو یہ کام اس قدر پسند تھا کہ آپ ﷺ بعد میں بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر مجھے آج بھی اس کی طرف بلایا گیا تو میں اس پر لبیک کہوں گا: **''لَوْ اُدْعٰی بِهٖ فِیْ الإِسْلَامِ لَأَجَبْتُ''**۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۲/ ۹۱)

بنواُمیہ کے دور میں حضرت حسین ﷺ اور ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کے درمیان ایک مسئلہ پر نزاع پیدا ہوگئی، جس میں ولید کی زیادتی تھی، حضرت حسین ﷺ نے اس سلسلہ میں اسی حوالہ سے لوگوں کی مدد چاہی، یکے بعد دیگرے کئی صحابہ ﷺ نے اس پر لبیک کہا، بالآخر ولید کو اپنے ارادہ سے باز آنا پڑا، (سیرت ابن ہشام: ۱/ ۱۳۵) یہ واقعہ اس بات کے لئے بنیاد فراہم کرتا ہے کہ سیاسی جدو جہد میں مسلمان اور غیر مسلم ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کر سکتے ہیں اور سیاسی تعلقات میں اصولوں کی بنیاد پر غیر مسلموں کا تعاون کیا جاسکتا اور ان سے تعاون لیا جاسکتا ہے، نیز ایسی سیاسی تنظیموں میں جو خالص مسلم تنظیم نہ ہو، مسلمان شریک ہوسکتے ہیں۔

قرآن مجید نے حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ تفصیل سے ذکر کیا ہے، مصر میں اس وقت مشرکین ہی کی حکومت تھی، حضرت یوسف علیہ السلام نے ملکی مفادات اور مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے وزارتِ خزانہ طلب فرمائی: **''قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ''** (یوسف: ۵۵) حضرت یوسف علیہ السلام کی خواہش قبول کی گئی اور انھوں نے اس فریضہ کو بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا، اس سے معلوم ہوا کہ ایسے اقتدار میں شریک و سہیم ہونا بھی درست ہے، جس میں غیر مسلموں کو غلبہ حاصل ہو۔

مبنی برانصاف قوانین کی اطاعت

غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے سیاسی تعلقات دو اصولوں پر مبنی ہوں گے، اوّل ان قوانین کی اطاعت پر، جو مبنی برانصاف ہوں؛ کیوں کہ آپ جب کسی ملک کی شہریت قبول کرتے ہیں، تو یہ زبانِ حال سے اس ملک کے دستور کی پاسداری اور فرمانبرداری کا اقرار ہے اور ایک طرح کا

عہد ہے، جو ہم نے اس ملک کے ساتھ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ عہد کو پورا کرو: ''اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ'' (المائدۃ:۱) ایک اور موقع پر فرمایا گیا: ''اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ'' (الاسراء:۳۴) یعنی معاہدات اور وعدوں کی پاسداری کرو، قانون شکنی کو اسلام جائز نہیں قرار دیتا؛ بشرطیکہ وہ صریحاً عدل کے خلاف نہ ہوں۔

یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ اسلام میں معاہدات کو ایسی اہمیت حاصل ہے کہ ان کی وجہ سے بعض عمومی قوانین میں استثنائی صورت اختیار کی جاتی ہے؛ چنانچہ قرآن مجید کا یہ ارشاد قابل توجہ ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ ، وَالَّذِيْنَ آوَوْا وَّنَصَرُوْا أُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ، وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَالَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ، وَ إِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ۔ (الانفال:۷۲)

جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں، رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دارالاسلام میں) آنہیں گئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں، ہاں اگر وہ دین کے معاملہ تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے؛ لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے غیر مسلم اکثریت کے ساتھ زندگی گزارنے والے مسلمانوں کی مدد کے بارے میں فرمایا ہے کہ بشرطیکہ تمہارے درمیان اور ان کے درمیان پہلے سے کوئی معاہدہ موجود نہ ہو، خود رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''مسلمانوں کی شان یہ ہے کہ وہ دوسرے مسلمان پر ظلم بھی نہ کریں اور اسے ظلم ہوتا ہوا چھوڑے بھی نہیں'' — لیکن

صلح حدیبیہ کے موقع سے جب حضرت ابو جندل ﷜ پا بہ زنجیر خون میں لہولہان ہوکر آئے اور مسلمانوں سے التجاء کی کہ وہ انھیں اپنے ساتھ مدینہ لے چلیں اور حضور ﷺ کی خواہش بلکہ اپیل کے باوجود اہل مکہ اس کے لئے تیار نہیں ہوئے تو آپ نے انھیں ساتھ لینے پر اصرار نہیں فرمایا اور تلقین کی کہ صبر کرو، اللہ تمہارے لئے کوئی راستہ نکالیں گے، غرض کہ حضرت ابو جندل ﷜ کی گزارش اور اس آزمائش کے مقابلہ آپ نے طے شدہ معاہدہ پر عمل کرنے کو ترجیح دی۔

اسی طرح غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے پاس فوجیوں کی تعداد کم تھی اور ایک ایک فوجی کی اہمیت تھی، اسی درمیان حضرت حذیفہ بن یمان اور ان کے والد اہل مکہ کی فوج کی جانب سے آئے، اہل مکہ نے انھیں گرفتار کرلیا اور اس شرط پر چھوڑا کہ وہ جہاد میں مسلمانوں کے ساتھ شریک نہ ہوں، پھر یہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جہاد میں شرکت کے لئے اجازت کے خواستگار ہوئے؛ لیکن رسول اللہ ﷺ نے انھیں یہ کہہ کر شریک جہاد ہونے سے منع فرمایا کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو، اللہ ہماری مدد کرے گا — اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ طے پانے والے معاہدات کی کسی قدر اہمیت ہے!

غرض کہ جب ہم کسی ملک کی شہریت قبول کرتے ہیں تو یہ اس ملک کے قوانین کی پابندی کا عہد ہوتا ہے اور دستور کی وساطت سے ہم صرف حکومت ہی کے ساتھ نہیں؛ بلکہ ملک کے تمام شہریوں کے ساتھ بھی ایک معاہدہ میں بندھے ہوتے ہیں، اس لئے ہم پر ملکی قانون کا پاس ولحاظ رکھنا نہ صرف قانوناً واجب ہے؛ بلکہ شرعاً بھی واجب ہے، بشرطیکہ وہ صریح طور پر اسلامی شریعت سے متصادم نہ ہو۔

ظلم کی مخالفت

سیاسی اشتراک کی دوسری بنیاد ظلم کی مخالفت اور اس کے سدِّ باب میں باہمی تعاون ہے، قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مُنکَر کو روکنے کا حکم دیا گیا ہے، ''مُنکَر'' میں تمام برائیاں شامل ہیں اور یقیناً ظلم بھی اس میں داخل ہے، رسول اللہ ﷺ نے منکر کو روکنے کے طریقہ کے سلسلہ میں یہ اُصول بتایا کہ اس کے لئے قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے طاقت کا استعمال کرسکتا ہو تو اس کا استعمال کرے، اگر طاقت کا استعمال نہیں کرسکتا تو زبان سے اس کے خلاف احتجاج کرے اور اگر زبان کے استعمال سے بھی عاجز ہے تو دل سے اس کو برا مانے اور عزم رکھے کہ جب بھی ممکن ہوگا، وہ ظلم کو دفع کرنے کی کوشش کرے گا۔

مَنْ رَأٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ ، فَإِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ ، فَإِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ ، وَذٰلِکَ أَضْعَفُ الْاِیْمَانِ ۔ (مسلم، حدیث نمبر:۴۹)

تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو چاہیے کہ بزورِ بازو اسے بدلنے کی کوشش کرے، اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے اور اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمتر درجہ ہے۔

''ید'' ایک علامتی لفظ ہے اور ہاتھ سے مراد طاقت ہے، اس زمانہ میں ووٹ اور پُرامن احتجاج بھی ایک طاقت ہے، اسی طرح زبان سے منکر کو روکنے میں زبان کے ذریعہ ظلم کے خلاف احتجاج بھی شامل ہے؛ اسی لئے قرآن مجید نے بری بات کو زبان پر لانے اور علی الاعلان کہنے کو منع کیا ہے؛ لیکن ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی اجازت دی ہے :

لَایُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۔ (النساء:۱۴۸)

اللہ تعالیٰ بری بات کے زور سے کہنے کو پسند نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ وہ مظلوم ہو۔

حدیث میں احتجاج کے بعض اور طریقے بھی منقول ہیں۔ (مجمع الزوائد:۱۲۰/۸، باب ماجاء فی أذی الجار)

غرض کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی اشتراک درست ہے ؛ البتہ سیاسی اشتراک خود مسلمانوں کا باہمی طور پر ہو یا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہو، اس کا مقصد صرف اقتدار میں ساجھے داری نہ ہو؛ بلکہ انصاف کو قائم کرنا اور ظلم کو روکنا بھی ہو۔

مذہبی تعلقات

سامعین کرام ! مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کے سلسلہ میں سب سے اہم موضوع مذہبی تعلقات کا ہے، اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، اپنے دین پر استقامت اور دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام، ان میں سے پہلے نکتہ یعنی دین پر استقامت کے سلسلہ میں گفتگو ہو چکی ہے۔

دوسرے مذاہب کا احترام اور عدم مداخلت

مذہبی تعلقات کی دوسری بنیاد دوسرے مذاہب کا احترام اور ان کے مذہبی امور میں عدمِ مداخلت ہے، قرآنی تعلیمات کا نچوڑ عقیدۂ توحید کی دعوت ہے، اسلام میں توحید سے زیادہ کوئی چیز مطلوب ومحمود نہیں اور شرک سے زیادہ کوئی چیز قابل ترک اور مذموم نہیں؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے حد درجہ مذہبی رواداری کی تعلیم دی ہے، قرآن مجید نے صاف کہا ہے کہ ہر شخص کو عقیدہ کی آزادی حاصل ہے اور کسی مذہب کے قبول کرنے کے لئے جبر وتشدد جائز نہیں :

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۔ (البقرۃ:۲۵۶)

دین میں کوئی جبر نہیں، ہدایت گمراہی کے مقابلہ میں واضح ہو چکی ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا :

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۔ (یونس:۹۹)

کیا آپ لوگوں کو اس بات پر مجبور کر دیں گے کہ وہ ایمان لائیں؟

عقیدہ کے علاوہ غیر مسلموں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی بھی مکمل آزادی حاصل ہے، قرآن مجید نے صاف طور پر حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے مشرکین مکہ کو کہلایا: ''**لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ**'' (الکافرون:۶) ''تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین'' رسول اللہ ﷺ کی رَواداری کا حال یہ تھا کہ نجران کے عیسائیوں کا وفد بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے ان کو ان کے مذہب کے مطابق اور ان کے قبلہ کی طرف رُخ کر کے مسجدِ نبوی میں نماز ادا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی، (احکام الذمۃ: ۱/ ۳۱۶) فقہاء نے لکھا ہے کہ :

اگر کسی مسلمان کی بیوی یہودی یا عیسائی ہو اور اس کے عقیدہ کے مطابق کسی خاص دن روزہ رکھنا واجب ہو تو مسلمان شوہر اسے روزہ رکھنے سے روک نہیں سکتا ہے، گو اس کی وجہ سے وہ جنسی استفادہ کے حق سے محروم ہوتا ہے۔ (حوالۂ سابق)

اسی طرح اگر وہ اپنے عقیدہ کے مطابق صلیب پہنے، یا مسلمان شوہر کے گھر میں صلیب رکھے تو اسے یہ حق ہے اور شوہر اس کو روک نہیں سکتا۔ (حوالۂ سابق)

یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے مذہبی گروہوں کے مذہبی جذبات کو مجروح نہ کیا جائے اور دوسری قومیں جن دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرتی ہوں، ان کو برا بھلا نہ کہا جائے؛ حالاں کہ

یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام خدا کی ذات وصفات میں کسی کی شرکت کو جائز نہیں سمجھتا؛ کیوں کہ یہ سچائی اور واقعہ کے خلاف ہے؛ لیکن پھر بھی مذہبی رواداری کے تحت ان معبودانِ باطل کے بارے میں ناشائستہ باتیں کہنے سے منع کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔ (الانعام:۱۰۸)

وہ اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہیں، تم ان کو برا بھلا نہ کہو۔

عبادت گاہوں کا احترام

اسی طرح عبادت گاہوں کے معاملہ میں بھی تمام اہل مذاہب کے جذبات کو ملحوظ رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے، قرآن مجید نے جہاں عبادت گاہوں کے منہدم کرنے کی مذمت کی ہے، وہاں مسلمانوں کی مسجدوں سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کے گرجوں کا ذکر فرمایا ہے، (**الحج:۴۰**) اس سے ظاہر ہے کہ عبادت گاہیں خواہ کسی مذہب کی ہوں، ان کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے، رسول اللہ ﷺ نے بنونجران سے جو معاہدہ کیا، اس میں یہ صراحت فرمائی کہ ان کی عبادت گاہیں منہدم نہیں کی جائیں گی اور نہ مذہبی امور میں کوئی مداخلت کی جائے گی، (ابوداود، حدیث نمبر: ۳۰۴۱) عہدِ صدیقی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ذریعہ حیرہ کا علاقہ فتح ہوا، اہل حیرہ کے لئے انھوں نے جو دستاویز تیار فرمائی، اس میں بھی یہ صراحت موجود ہے کہ ان کے چرچ اور گرجے منہدم نہیں کئے جائیں گے، امام ابویوسفؒ نے اسے نقل کیا ہے۔ (موسوعۃ الخراج: ۱۴۳)

اس سلسلہ میں خلافتِ راشدہ اور بعد کے مسلم عہد میں بہت سی مثالیں موجود ہیں، جن کا ذکر اس وقت درازیٔ تحریر کا باعث ہوگا؛ لیکن اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام عقیدۂ توحید کی حفاظت اور اپنی شناخت کی بقاء کے سلسلہ میں جس قدر حساس ہے، غیر مسلموں کے مذہبی اور سماجی مسائل میں اسی قدر کشادہ قلب، سیر چشم اور رَوادار بھی ہے، افسوس کہ اس پر غلط فہمیوں کے تہ در تہ دبیز پردے ڈال دیے گئے ہیں، مذہبی معاملات کے سلسلہ میں یہ اُصول غیر مسلم اکثریت کے ساتھ بھی اسی طرح قابل عمل ہیں، جیسے غیر مسلم اقلیت کے ساتھ۔

حضرات ! یہ تو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے روابط کے بارے میں بعض تفصیلات تھیں؛ لیکن اس موقع سے میڈیا کے پروپیگنڈہ کی وجہ سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان روابط میں پیدا ہونے والی کرواہٹوں کی نسبت سے دو غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ضروری محسوس ہوتا ہے۔

جہاد — حقیقت اور غلط فہمی

اول یہ کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات کے موضوع پر شکوک وشبہات کے کانٹے آج کل جس عنوان سے بوئے جاتے ہیں، وہ ہے جہاد، جہاد کی ایسی تصویر پیش کی جاتی ہے کہ گویا ہر مسلمان تلوار تھامے گھر سے نکلتا ہے اور جس غیر مسلم کو پاتا ہے اسے تہِ تیغ کردیتا ہے، اسی لئے آج کل دہشت گردی اور جہاد کو ہم معنی الفاظ سمجھ لیا گیا ہے ؛ حالاں کہ جہاد ایک قانونی عمل ہے اور دہشت گردی غیر قانونی فعل۔

جہاد تمام غیر مسلموں سے نہیں ہے ؛ بلکہ ان غیر مسلموں سے ہے جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہوں ؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۔ (البقرۃ:۱۹۱)

اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو، جو تم سے جنگ کر رہے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو، بیشک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

اس آیت میں ’’حد سے تجاوز کرنے‘‘ کو منع کیا گیا ہے، حد سے تجاوز کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اوّل یہ کہ جو لوگ تم سے برسر پیکار نہ ہوں، تم بھی ان سے جنگ نہ کرو، دوسرے یہ کہ جب جنگ ہو تو انسانی تقاضوں اور جنگ کے مہذب قوانین کو ملحوظ رکھو، عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور معذوروں، نیز جنگ میں حصہ نہ لینے والوں اور مذہبی پیشواؤں پر ہاتھ نہ اٹھاؤ کہ رسول اللہ ﷺ اور خلفاءِ راشدین نے جنگ میں ان لوگوں کو نشانہ بنانے سے منع فرمایا ہے۔ (سنن أبی داود، حدیث نمبر: ۱۶۴)

ایک اور موقع پر قرآن نے ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے، جن سے جہاد کا حکم ہے، کہا ہے :

اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۔ (سورۂ محمد:۱)

جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ محض کفر کی وجہ سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا ؛ بلکہ کفر کے ساتھ ساتھ ان کی ظلم وزیادتی اور جبر واستبداد کے سبب جہاد کا حکم فرمایا گیا، قرآن نے اس مضمون کو ایک سے زیادہ مواقع پر بہت ہی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جو غیر مسلم حضرات مسلمانوں سے

آمادۂ پیکار نہ ہوں اور صلح جو ہوں، مسلمانوں کو بھی ان کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھانا چاہئے ؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْاْ إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلاً ۔ (النساء:۹۰)

اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں، پس تم سے جنگ نہ کریں اور تمہاری طرف صلح کی پیش کش کریں تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان کے خلاف دست درازی کی کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے۔

وَإِن جَنَحُواْ لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا ۔ (الأنفال:۶۱)

اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔

ان آیات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جنگ ،جنگجوؤں اور شدت پسندوں سے ہے، نہ کہ صلح جوؤں اور امن پسندوں سے ؛ بلکہ اگر کسی غیر مسلم گروہ سے امن کا معاہدہ ہو اور وہ کسی مسلمان گروہ کے درپئے آزار ہوں، تو سیاسی طور پر اور پر امن طریقوں سے تو مسلمانوں کی مدد کی جائے گی اور سیاسی واخلاقی دباؤ ڈالا جائے گا؛ لیکن ان کے خلاف قتال کرنا اور عہد کو توڑ دینا پھر بھی درست نہیں ہوگا، اس سلسلہ میں قرآن مجید کی یہ صراحت گذر چکی ہے :

وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلاَّ عَلَى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ وَاللهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۔ (الانفال:۷۲)

اور اگر وہ (مسلمان) تم سے دین کے معاملہ میں مدد کے طلب گار ہوں تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے ؛ لیکن ایسی قوم کے خلاف نہیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو اور تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اسے دیکھ رہے ہیں۔

قرآن مجید کے ان ارشادات کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جہاد کا حکم کن لوگوں سے ہے؟ صرف ان لوگوں سے، جو مسلمانوں سے جنگ کرنے پر تلے ہوئے ہوں، جن لوگوں سے مسلمانوں کا معاہدۂ امن ہو یا جو لوگ غیر جانبدار رہوں، نہ ان سے جنگ ہو اور نہ ان سے کوئی معاہدہ ہو، ایسے لوگوں سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا، اور یہ بات ظاہر ہے کہ یہ انصاف کے عمومی اُصول اور تقاضے کے

عین مطابق ہے کہ ظالموں کا پنجہ تھاما جائے اور انھیں ظلم سے باز رکھا جائے، جو لوگ مسلمانوں سے جنگ نہ کرتے ہوں اور انھیں مشرکین مکہ کی طرح وطن سے بے وطن ہونے پر مجبور نہ کر رہے ہوں، ان کے ساتھ جنگ کی بجائے حسن سلوک اور صلح وآشتی کا حکم دیا گیا ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے:

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۔ (الممتحنة:۸)

جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کرتے ہیں اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکال رہے ہیں، اللہ تعالیٰ تم کو ان کے ساتھ بہتر سلوک کرنے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتے، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مدنی زندگی میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تصادم کے کل بیاسی (۸۲) واقعات پیش آئے ہیں اور زیادہ تر جنگیں مدینہ کے قریب ہوئی ہیں، جو اس بات کی علامت ہے کہ اس میں مسلمان حملہ آور نہیں تھے، ان بیاسی واقعات میں کل ۱۰۱۸/ افراد دونوں طرف سے کام آئے اور اوسطاً ایک جنگ میں گیارہ جانیں گئیں، یہی وہ تعداد ہے، جس کی وجہ سے اسلام کے بارے میں غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ اسے تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے، جب کہ مہابھارت کی ''مقدس جنگ'' میں لاکھوں افراد خود ہندو مذہبی مآخذ کے مطابق مارے گئے اور عیسائی مذہبی عدالت کے حکم پر ایک کروڑ بیس لاکھ افراد کو سزائے موت دی گئی اور ان میں ایک بہت بڑی تعداد وہ تھی، جن کو زندہ جلا دیا گیا؛ لیکن افسوس کہ مغربی اقوام — جن کی پوری تاریخ غارت گری، خوں آشامی اور استعماریت کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے، — نے ''چور مچائے شور'' کے مصداق بڑی ہوشیاری کے ساتھ مسلمانوں کی تاریخ پر لکھ دیا:

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

غیر مسلموں سے دوستی

دوسری غلط فہمی جو اس وقت عالمی سطح پر پائی جاتی ہے، یہ ہے کہ اسلام نے غیر مسلموں کو دوست بنانے سے منع کیا ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا الْكَافِرِيْنَ أَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ، أَتُرِيْدُوْنَ أَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَاناً مُّبِيْناً۔ (النساء:۱۴۴)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دے دو؟

اس سلسلہ میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا اس سے وہ مشرکین مراد ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں مسلمانوں سے آمادۂ پیکار تھے یا قیامت تک آنے والے تمام غیر مسلم اس میں شامل ہیں؟ قرآن کی تعبیر اور آیت کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے عہد نبوی کے وہ غیر مسلم مراد ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ نہایت ظالمانہ رویہ روا رکھے ہوئے تھے؛ اس لئے کہ ایک تو قرآن نے اکثر ''کافرین'' کے لفظ سے ''مشرکین مکہ'' کو مراد لیا ہے، دوسرے: خود قرآن مجید میں دوسرے مقام پر اس بات کی صراحت آگئی ہے کہ ان لوگوں کی دوستی منع ہے، جنھوں نے مسلمانوں سے جنگ کی، ان کو ان کے وطن سے نکالا اور ان کے بے وطن کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کی؛ چنانچہ ارشاد ہے :

اِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَأَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوْا عَلٰٓى إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ ، وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ ۔ (الممتحنة:۸-۹)

وہ تمھیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنھوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا ہے اور تمھارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے، ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ آیت میں عہد نبوی کے ان مشرکین کی دوستی سے منع کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ انتہائی درجہ معاندانہ رویہ اختیار کئے ہوئے تھے اور آج بھی جو لوگ اس طرح کا رویہ اختیار کریں ان کے لئے یقیناً یہی حکم ہوگا، عام غیر مسلموں کے لئے یہ حکم نہیں ہے، خود اس آیت میں غور کیجئے کہ اس میں ''مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ'' کے الفاظ موجود ہیں، یعنی غیر مسلموں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں اور ان کو چھوڑ کر دوست نہ بنالو۔

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اولیاء بنانے سے کیا مراد ہے؟ عام دوست کو ولی نہیں کہتے

ہیں، ولی ایسے قریب ترین شخص کو کہا جاتا ہے جس سے بے حد قربت ہو، یہاں تک کہ کوئی راز اس سے راز نہ رہے، اس لئے والد، دادا اور سرپرست کو ''ولی'' کہتے ہیں، پس آیت کا منشا یہ ہے کہ مسلمانوں کا راز ان غیر مسلموں کے پاس نہ چلا جائے جو تم سے برسرپیکار ہیں اور یہ بات ظاہر ہے کہ ہر ملک اپنے راز کی باتوں کو چھپانا چاہتا ہے؛ تاکہ دشمن اس سے فائدہ نہ اُٹھا سکے، عام دوستانہ تعلقات اس میں مراد نہیں ہیں۔

اس پر ایک اور طرح سے غور کیا جاسکتا ہے کہ شریعت اسلامی میں مسلمانوں کو یہودی اور عیسائی عورت سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے، اس لئے مسلم سماج میں غیر مسلم ماں اور غیر مسلم بیوی کا وجود ہوسکتا ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ تمام رشتوں میں سب سے زیادہ محبت کا رشتہ ماں اور بیوی کا ہوتا ہے، تو اگر غیر مسلموں سے محبت اور دوستی کی مطلقاً ممانعت ہوتی تو ان سے اس طرح کا رشتہ کیسے جائز ہوتا؟ غرض کہ غیر مسلموں کو دوست بنانے کی ممانعت کا تعلق ان غیر مسلموں سے ہے، جو صرف مذہبی اعتبار سے مسلمانوں سے اختلاف ہی نہ رکھیں؛ بلکہ ان کا سلوک بھی معاندانہ ہو، نیز دوستی سے مراد ایسی دوستی ہے جو مسلم مملکت کے محفوظ راز کے افشاء ہوجانے کا سبب بن سکتی ہو، یا بعض مفسرین کے اقوال کے مطابق دوسرے اہل مذاہب سے مذہبی اثرات اور طور وطریق کو قبول کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہو، عام دوستی، محبت اور تعلق جو سماج کے ایک شخص کی دوسرے شخص سے ہوتی ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

حضرات! اخیر میں یہ بات عرض کرنی ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان — خواہ مسلمان اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں — تمام روابط اور تعلقات کی اساس یہ ہے کہ مسلمان داعی ہیں اور غیر مسلم مدعو، مسلمان خیر اُمت ہیں اور غیر مسلم ان کی تبلیغی کوششوں کا میدان؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آلِ عمران:۱۱۰)

اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو۔

یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ بقول حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ: ''جیسے رسول اللہ ﷺ اس

اُمت کی طرف مبعوث ہیں، اسی طرح یہ اُمت پوری انسانیت کی طرف مبعوث ہے'' جو ان کو بھلائی کی دعوت دینے اور برائی سے روکنے پر مامور ہے اور سب سے بڑی بھلائی ایمان اور سب سے بڑی برائی کفر ہے؛ لہٰذا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں ایمان کی دعوت اور کفر سے ان کو بچانے کی کوشش یقیناً داخل ہے، اس لئے جو اوصاف بحیثیت داعی رسول اللہ ﷺ کے ذکر کئے گئے ہیں اور جو سلوک آپ نے اپنے زمانہ کی غیر مسلم اکثریت کے ساتھ اختیار کیا تھا، وہی اس اُمت سے بھی مطلوب ہے، قرآن مجید نے رسول اللہ ﷺ کے سلوک کو اس طرح بیان کیا ہے :

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ ، وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا انْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ۔(آلِ عمران:۱۵۹)

(اے پیغمبر!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے ئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو، ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش چھٹ جاتے۔

یعنی آپ اپنے مخاطب کے لئے نرم گفتاری اور نرم خوئی اختیار فرمایا کرتے تھے، یہی چیز ہے، جو آپ کے جانی دشمنوں کو بھی آپ کے جاں نثاروں میں داخل کر دیتی تھی، قرآن مجید نے خاص طور پر مسلمانوں کو تلقین کی ہے کہ لوگوں سے بہتر طور پر گفتگو کرو: ''**قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا**''۔**(البقرہ: ۸۳)**

نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے :

خالق الناس بخلق حسن۔(صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب حلاوۃ الایمان)

لوگوں کے ساتھ بہتر اخلاق سے پیش آؤ۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو جب فرعون کو دعوت دینے پر مامور کیا گیا تو بطور خاص تاکید کی گئی :

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا۔(طٰہٰ:۴۴)

فرعون سے نرم گفتگو کرنا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جیسے ماں باپ اپنی اولاد سے یکطرفہ لطف و محبت اور حسن سلوک کرتے ہیں، اسی طرح داعی گروہ کے لئے ضروری ہے کہ مدعو کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی درجہ محبت اور حسن سلوک پر مبنی ہو اور وہ اپنی طرف سے تعلقات کو خوشگوار اور معتدل رکھنے کی پوری کوشش کرے،

یہاں تک کہ مدعو کی زیادتی بھی ان کو عدل اور اعتدال کے راستہ سے ہٹنے نہیں دے :

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى أَلَّا تَعْدِلُوْا ۔ (المائدۃ:۸)

کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ اور عدل کرو۔

یہ بات لمحۂ فکریہ ہے کہ ہندوستان میں ۱۹۴۷ء کے بعد سے مسلمان مسلسل ابتلاء وآزمائش سے گذر رہے ہیں اور بہ ظاہر ظلم و جور کی داستان دراز سے دراز تر ہوتی جارہی ہے، اس کے باوجود مسلمان اللہ کی نصرت سے محروم ہیں اور ان کی بددعائیں بھی اثر سے خالی ہیں، شاید یہ قرآن مجید کے اس ارشاد کے مطابق ہے کہ جو لوگ دین حق سے بے خبر ہوں اور جن تک خدا کا پیغام پہنچایا نہیں گیا ہو، ان پر اللہ کا عذاب نہیں آتا؛ کیوں کہ یہ ظلم ہے :

ذٰلِكَ أَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّأَهْلُهَا غَافِلُوْنَ ۔ (الانعام:۱۳۱)

یہ شہادت ان سے اس لئے لی جائے گی کہ یہ ثابت ہوجائے کہ تمہارا رب بستیوں کو ظلم کے ساتھ تباہ کرنے والا نہ تھا جب کہ ان کے باشندے حقیقت سے ناواقف ہوں۔

اسی طرح ایک اور موقع پر فرمایا گیا :

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ أُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِنَا ، وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰى إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُوْنَ ۔ (القصص:۵۹)

اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا، جب تک کہ ان کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دیتا جو ان کو ہماری آیات سناتا اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے، جب تک کہ ان کے رہنے والے ظالم نہ ہوجاتے۔

موجودہ حالات میں اور بالخصوص ہندوستان میں ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم برادرانِ وطن سے جہاں تک ممکن ہو اپنے تعلقات کو خوشگوار رکھنے کی کوشش کریں، اسوۂ نبوی کو سامنے رکھیں

اور اس حقیقت کو یاد رکھیں کہ ہم ایک داعی اُمت ہیں اور برادران وطن ہمارے مدعو ہیں، خاص کر ہندوستان کے برادرانِ وطن کے بارے میں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ ہندو قوم خدا سے محبت رکھتی ہے؛ لیکن خدا کی معرفت سے محروم ہے، اس کے دل میں مذہب کی عظمت ہے؛ لیکن وہ دین حق کی پہچان سے محروم ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ہم ان کے ساتھ باہمی روابط میں اس پہلو کو ضرور ملحوظ رکھیں اور ان روابط کو دعوت دین کے لئے استعمال کریں، تبھی ایک باعزت اُمت کی حیثیت سے ہم سربلندی کی زندگی گزار سکیں گے۔

اخیر میں مجلس تعمیر ملت کے صدر عالی قدر محترم جناب عبدالرحیم قریشی صاحب، نائب صدر مولانا سلیمان سکندر صاحب اور اس پروگرام کے کنوینر محبی فی اللہ جناب ضیاء الدین نیر صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس اہم خطبہ کے لئے اس حقیر کو مدعو کیا اور آپ حضرت سے کچھ عرض کرنے کا موقع عنایت فرمایا، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے اور ہم سب کو اس بات کی توفیق عطا فرمائے کہ ہمارا جینا اور مرنا اور نرم وگرم ہونا اللہ کے لئے ہو۔

إن صلاتي ونسكي ومحياي ومماتي لله رب العالمين ،
والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته ۔

●●●

بین مذہبی مذاکرات — اُصول وآداب ☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين وعلى آله وصحبه أجمعين ، أما بعد ۔

جناب صدر، علماء کرام اور دانشورانِ ذی احترام! یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ایسی مخلوق بنایا ہے، جس میں عقل وفہم کی غیر معمولی صلاحیت رکھی گئی ہے؛ لیکن جیسے انسان کے ظاہری رنگ و روپ، شکل وصورت اور آواز وغیرہ میں فرق رکھا گیا ہے، اسی طرح اس کی سوچ اور مزاج و مذاق میں بھی فرق اور تنوع پایا جاتا ہے، جس کا دن رات مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، اسی کا اثر ہے کہ کسی کو مثلاً سرخ رنگ پسند ہے اور کسی کو سیاہ، کسی کو ایک پھل پسند ہے اور کسی کو دوسرا، یہ اختلافِ رائے جس طرح مادی چیزوں میں ہے، اسی طرح معنوی چیزوں میں بھی ہے، اسی اختلاف فکر ونظر اور تنوع ذوق ومزاج کی وجہ سے دنیا میں سینکڑوں ادیان ومذاہب موجود ہیں اور جو گروہ جس دین کو قبول کرتا ہے، وہ اسی پر پورا ایقان رکھتا ہے، قرآن مجید چوں کہ خود خالق فطرت کی اُتاری ہوئی کتاب ہے؛ اس لئے اس میں اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے کہ اگر اللہ کو منظور ہوتا تو ساری انسانیت ایک ہی دین پر قائم ہوتی، یہ اختلافِ دین اگرچہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق نہیں ہے؛ لیکن اس کے پیچھے بھی اللہ ہی کی مشیت کارفرما ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے :

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعاً ۔ (یونس:۹۹)

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً ۔ (ہود:۱۱۸، النحل:۹۳)

وَلَوْ شَاءَ اللهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلاَ تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ ۔ (الانعام:۳۵)

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۔ (الانعام:۱۱۲)

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِيْنَ ۔ (الانعام:۱۴۹)

جب خود اللہ تعالیٰ نے انسان کو راہِ ہدایت اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا ہے، اس کو ارادہ

☆ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے تحت دہلی میں منعقدہ اجلاس میں یہ کلیدی خطبہ پیش کیا گیا۔

واختیار کی قوت دی ہے اور اس کی سوچ میں اختلاف رکھا ہے تو اب نوع انسانی کو ہدایت کی طرف لانے کا طریقہ یہی ہے کہ قوموں کے درمیان تبادلۂ خیال ہو اور حوار و مذاکرہ کا راستہ اختیار کیا جائے، جس کو قرآن مجید نے دعوت الی اللہ، اور مجادلۂ حسنہ سے تعبیر کیا ہے، جو خیر اُمت کے لئے شہادت حق کا ایک پُرامن راستہ ہے۔

حضرات ! اس پس منظر میں حوار کی بڑی اہمیت ہے، اور اس موضوع سے متعلق چند اہم اُمور کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے :

مذاکرات کے مقاصد

اس سلسلہ میں سب سے قابل توجہ امر یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان مذاکرات سے ہمارے مقاصد کیا ہونے چاہئیں؟

(۱) مذاکرات کا سب سے بنیادی مقصد ''دعوت الی اللہ'' ہے؛ اس اُمت کو اسی لئے خیر اُمت کا مقام دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو معروف کی طرف بلاتی اور منکر سے روکتی ہے :

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۔ (آل عمران:۱۱۰)

''ناس'' کا لفظ قرآن مجید میں زیادہ تر مشرکین کے لئے استعمال ہوا ہے۔

''معروف'' کا سب سے اعلیٰ درجہ ایمان ہے۔

''منکر'' میں سب سے سخت درجہ کفر و شرک ہے۔

اس طرح گویا اس آیت میں مسلمانوں کو غیر مسلموں پر دعوت ایمان پیش کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، اسی لئے اس آیت میں اہل کتاب کے ایمان لانے کی طرف خاص طور سے اشارہ کیا گیا ہے، قرآن مجید میں انبیاء کی اپنی قوم کے ساتھ مذاکرات کے جو واقعات آئے ہیں یا رسول اللہ ﷺ کے اپنے مخاطبین کے ساتھ گفتگو کی جو تفصیل آئی ہے، ان سب کی بنیاد دعوتِ ایمان پر ہے؛ اس لئے اسلامی نقطۂ نظر سے مذاکرات کا بنیادی مقصد دعوت الی اللہ ہے۔

(۲) مذاکرات کا دوسرا مقصد مخاطب کی غلط فہمی کو دور کرنا ہے؛ کیوں کہ اگر دل میں شکوک وشبہات کے کانٹے چبھ رہے ہوں اور دلوں میں غلط فہمیاں اور بدگمانیاں ہوں تو کیسے انھیں ایمان کی

توفیق ہوسکتی ہے؟ — انبیاء کی اپنی اقوام سے جو گفتگو ہوتی رہی ہے، اگر اس کا جائزہ لیا جائے تو بہت سی گفتگو کا مقصود مخاطب کی غلط فہمی کو دور کرنا ہوتا تھا؛ مخاطب انھیں ساحر کہتے تھے، مجنون کہتے تھے، کہتے تھے کہ جس کتاب کو وحی الٰہی کہتے ہو، وہ ''**اساطیر الأولین**'' ہے، الزام لگاتے تھے کہ یہ سنی ہوئی کہانیاں ہیں، انبیاء مثبت انداز میں پورے تحمل اور بردباری کے ساتھ ان کا جواب دیتے تھے اور ان کی غلطی کو دلائل سے واضح کرتے تھے، اہل مکہ کا گمان تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں، قرآن نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ یہ کیسی بات ہے کہ بیٹی کی پیدائش کو اپنے لئے عیب سمجھتے ہو اور خدا کے لئے بیٹیاں ثابت کرتے ہو، اہل مکہ کہتے تھے کہ جب انسان کی موت ہوجائے گی اور وہ ریزہ ریزہ ہوجائے گا تو پھر کس طرح وہ دوبارہ زندہ کئے جائیں گے؟ قرآن نے کہا کہ جب اللہ تعالیٰ پہلی بار تمہاری تخلیق کرسکتے ہیں تو دوبارہ تمہیں زندگی عطا کرنا کیا دشوار ہے؟ :

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِىٓ أَنشَأَهَآ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ۔ (یٰسین:۷۹)

یہودی کہتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے اور عیسائیوں کا دعویٰ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام عیسائی تھے، قرآن نے وضاحت کی کہ حضرت ابرہیم نہ یہودی تھے نہ عیسائی؛ بلکہ وہ دین حنیف پر قائم تھے؛ کیوں کہ یہودیت اور عیسائیت کا آغاز ہی حضرت ابراہیم کی کئی نسلوں کے بعد ہوا، عیسائی کہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں؛ کیوں کہ کسی باپ کے بغیر ان کی پیدائش ہوئی ہے، قرآن نے حضرت آدم علیہ السلام کی مثال دی کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش تو ماں باپ دونوں کے بغیر ہوئی، اگر یہ خدا کے بیٹے ہونے کی دلیل ہو تو انھیں بھی خدا کا بیٹا ماننا پڑے گا :

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ
قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ۔ (آل عمران:۵۹)

عیسائی علماء نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ قرآن نے حضرت مریم کا بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو قرار دیا ہے؛ حالاں کہ حضرت ہارون ان سے مدتوں پہلے پیدا ہوئے اور وہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفیق تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ دوسرے ہارون ہیں اور لوگوں میں یہ رواج تھا کہ وہ گذشتہ انبیاء کے نام پر اپنے بچوں کے نام رکھا کرتے تھے۔

غرض کہ مذاکرات کا دوسرا مقصد غلط فہمیوں کا ازالہ ہے اور اس کے لئے یہ بہت مؤثر ذریعہ ہے۔

(۳) مذاکرات کا تیسرا مقصد نفرت اور عداوت کے جذبات کو ختم کرنا یا کم کرنا ہے، بہتر

گفتگو عام طور پر رائیگاں نہیں جاتی اور اگر مخاطب آپ کی بات کو پوری طرح قبول نہ کرے اور اس کی مخالفت بالکل ختم نہ ہوجائے تو کم ضرور ہوجاتی ہے :

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۔ (فصلت: ۳۴)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ دعوت کا جہاں یہ فائدہ ہے کہ مخاطب کو ہدایت نصیب ہوتی ہے، وہیں اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ مخالفت کے جذبات ختم ہوجاتے ہیں یا کم ہوجاتے ہیں، صحابہ نے جب رسول اللہ کی ایماء پر حبش کو ہجرت فرمائی اور ایسے حالات پیش آئے کہ صحابہ کا نجاشی اور ان کے اعوان وانصار کے ساتھ مذاکرہ (حوار) ہوا تو یہی گفتگو نجاشی کے اطمینان کا، مسلمانوں کے ساتھ بہتر سلوک کا اور بالآخر ایمان لانے کا سبب بنا، آپ نے جب مدینہ ہجرت فرمائی تو وہاں کے یہودیوں اور مشرکین کے ساتھ مذاکرہ فرمایا، جس کے نتیجہ میں میثاقِ مدینہ پر تمام لوگوں کے دستخط ہوئے اور مسلمانوں کو پر امن زندگی گذارنے کا موقع ملا، یہود اور منافقین اگرچہ خفیہ طور پر سازشیں کرتے رہے؛ لیکن غزوۂ احزاب تک انھوں نے کھل کر مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی نہیں کی، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے عرب میں موجود مشرک، یہود اور عیسائی قبائل سے گفتگو کی، اس گفتگو کے ذریعہ صلح کا راستہ ہموار ہوا اور پر امن ماحول میں اسلام کی دعوت کو فروغ دینے کا موقع ملا۔

پس یوں تو مذاکرات کے بہت سے فوائد ہیں؛ لیکن یہ بنیادی مقاصد ہیں، جو نہایت اہم ہیں اور جن کو مذاکرات کے ذریعہ بہتر طور پر حاصل کیا جاسکتا ہے۔

مذاکرات اور انبیاء کرام

سامعین ذی احترام! بائبل میں بھی اور قرآن مجید میں بھی انبیاء کے واقعات اور اپنی قوموں سے تخاطب اور تبادلۂ خیال کو دیکھا جائے تو وہ مذاکرات کے بہترین نمونے ہیں؛ چنانچہ سورۂ ہود (۲۵ تا ۴۹) میں: حضرت نوح علیہ السلام، سورۂ شعراء، سورۂ بقرہ، انعام اور انبیاء میں: حضرت ابراہیم علیہ السلام، اسی طرح سورۂ شعراء اور سورۂ نمل میں: حضرت لوط علیہ السلام، سورۂ یوسف میں: حضرت یوسف علیہ السلام، اعراف، ہود اور نمل میں: حضرت صالح علیہ السلام، ہود، اعراف اور شعراء میں: حضرت ہود علیہ السلام، اعراف، ہود اور شعراء میں: حضرت شعیب علیہ السلام، اعراف، شعراء اور سورۂ طٰہٰ میں: حضرت موسیٰ علیہ السلام، سورۂ نمل میں: حضرت سلیمان علیہ السلام، آل عمران میں: حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مختلف سورتوں میں: رسولِ اقدس ﷺ

کے اپنی قوم سے خطاب اور سوال وجواب کے مضامین کو دیکھا جاسکتا ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دعوت کی بہترین مثال اہل کتاب کو دی گئی، دعوت ہے۔ (آل عمران: ۶۴-۶۸)

سلف صالحین نے بھی اپنے اپنے زمانہ میں مختلف اہل مذہب سے مذاکرات کا سلسلہ قائم فرمایا اور کوئی شبہ نہیں کہ اس کے بہت اچھے اثرات مرتب ہوئے، ان واقعات کو اکثر مناظرہ کے عنوان سے مختلف کتابوں میں نقل کیا گیا ہے، اسی میں وہ مشہور واقعہ ہے جس میں امام ابوحنیفہؒ نے ملحدین کے ساتھ وجود باری پر مباحثہ کیا تھا اور خلیفہ ہارون رشید نے اپنے ایک نصرانی طبیب سے مناظرہ کیا تھا، یا خلیفہ مامون نے کلثوم بن عمرو عتابی اور ابن فروہ نصرانی کے درمیان مباحثہ کرایا تھا۔

مذاکرہ کار کے لئے مطلوبہ اوصاف

حضرات گرامی ! مذاکرات کی کامیابی میں بڑا دخل حوار کرنے والے کے اخلاق اور طرز گفتگو کا ہوتا ہے۔

۱- اس میں ایک بنیادی چیز وہ ہے جسے قرآن مجید نے ''قول حسن'' سے تعبیر کیا ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے: ''**وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْناً**''۔ (البقرۃ: ۸۳)

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کو دعوت دینے کے لئے بھیجا تو ہدایت دی گئی :

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلاً لَّيِّناً لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَى ۔ (طٰہٰ: ۴۴)

اُصولِ دعوت کے بارے میں بتاتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

اُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۔ (النحل: ۱۲۵)

علامہ ابن تیمیہؒ نے اس سلسلہ میں کیا خوب نکتہ لکھا ہے کہ مجادلہ حسنہ کے بجائے ''**مجادلة بالتی هی أحسن**'' کی دعوت دی گئی ہے :

ولم يقبل بالحسنة كما قال في الموعظة ؛ لأن الجدال فيه مدافعة ومغاضبة ، فيحتاج أن يكون بالتی هي أحسن ، حتى يصلح مافيه من الممانعة والمدافعة ۔ (۱)

---

(۱) **الرد علی المنطقین: ۴۶۸۔**

ایک اور موقع پر حصر کے ساتھ کہا گیا کہ اہل کتاب کے ساتھ تمہاری گفتگو صرف اور صرف بہتر طریقہ پر ہو :

وَلَا تُجَادِلُوْا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۔ (العنکبوت:۴۶)

نرمی کا اظہار نہ صرف الفاظ سے ہو؛ بلکہ آواز سے بھی ہو کہ تیز آواز میں مخالف سے بات نہ کی جائے :

لَاّ يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلاَّ مَن ظُلِمَ ۔ (النساء:۴۸)

۲- دوسرا ضروری وصف یہ ہے کہ فریق مخالف کے ساتھ عام سلوک کے اعتبار سے بھی خوش اخلاقی سے پیش آیا جائے ، رسول اللہ ﷺ کی سیرت اس سلسلہ میں ہمارے لئے بہترین نمونہ ہے ؛ اسی لئے انبیاء اپنے مخاطب کفار ومشرکین کو ''یا قومی'' کہہ کر خطاب کرتے تھے ،جس میں اپنائیت ومحبت کا اظہار ہے ،رسول اللہ ﷺ نے مختلف بادشاہوں اور رؤساء کو دعوتی خطوط لکھے تو اس میں بھی ان کے درجہ ومقام اور حیثیت عرفی کی پوری پوری رعایت تھی ، ابوجہل کو اسلام کی دعوت پیش کی تو اس کو ابوالحکم کے لفظ سے مخاطب کیا ، جو اس کے لئے سب سے محبوب نام تھا اور جس سے اس کی عزت اور لیاقت کا اظہار ہوتا تھا ،عدی بن حاتم آئے تو ان کو دولت خانہ پر لے گئے اور توقیر کے ساتھ بٹھایا ؛ ہرقل کے نام لکھے گئے خط میں اس کو ''عظیم الروم'' کے لفظ سے مخاطب فرمایا۔

۳- حوار کے مؤثر ہونے کے لئے ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ فریق مخالف کے ساتھ عدل کا رویہ اختیار کیا جائے اور اس میں جو خوبیاں ہوں ،ان کے اعتراف میں بخل سے کام نہ لیا جائے ،اللہ تعالیٰ نے ہر شخص میں اور ہر گروہ میں خیر کے پہلو بھی رکھے ہیں ، اگر ان خوبیوں کا تذکرہ کیا جائے تو اس سے فریق مخالف کے اندر قبول کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ؛ چنانچہ قرآن مجید نے صاف صاف کہا ہے :

وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلاَّ تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوىٰ ۔ (المائدۃ:۸)

قرآن مجید میں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں اہل کتاب کی ناشائستہ باتوں پر نقد کیا گیا ہے ، وہیں ان میں جو خوبیاں پائی جاتی تھیں ، یا ان کے کسی گروہ میں اگر کوئی خوبی موجود تھی تو اس کا بھی بہتر طور پر ذکر فرمایا گیا ہے ، جیسے :

وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِن تَأْمَنْهُ بِقِنطَارٍ يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ وَمِنْهُم مَّنْ إِن تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لاَّ يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلاَّ مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِماً ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الأُمِّيِّيْنَ سَبِيْلٌ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۔ (آل عمران:۷۵)

۴- مذاکرہ کار کے لئے ایک نہایت ہی اہم وصف صبر اور بردباری کا بھی ہے، جب کسی مختلف فیہ مسئلہ پر گفتگو ہوتی ہے تو بعض باتیں طبیعت کے خلاف بھی کہی جاتی ہیں، اور ایسی بھی باتیں ہوتی ہیں، جس سے انسان کی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے، بظاہر اس کا وقار مجروح ہوتا ہے، محاور کا کمال یہ ہے کہ وہ ایسی باتوں سے متاثر نہ ہو اور صبر کا دامن اس کے ہاتھوں سے چھوٹنے نہ پائے، وہ کانٹوں کا جواب پھول سے اور نفرت کا جواب محبت سے دے، قرآن مجید میں بار بار اس کی تاکید کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ ۔ (الاعراف:۱۹۹)

ایک اور موقع پر فرمایا گیا :

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ، وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيْمٍ ۔ (فصلت:۳۴-۳۵)

اپنے مخاطب کے مقابلہ حلم و بردباری اور عفو وصبر کی بہترین مثال وہ مکالمات ہیں جو انبیاء اور ان کی اقوام کے درمیان پیش آئے ہیں اور قرآن نے ان کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

۵- مذاکرہ کار کے لئے ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنے مخاطب کی زبان سے واقف ہو، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ انبیاء کرام نے اپنی اپنی اقوام کو انھیں کی زبان میں مخاطب کیا ہے :

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُوْلٍ إِلاَّ بِلِسَانِ قَوْمِهِ ۔ (ابراہیم:۴)

علامہ ابن تیمیہؒ اس سلسلے میں فرماتے ہیں :

وأما مخاطبة أهل الاصطلاح باصطلاحهم ولغتهم فليس بمكروه إذا احتيج إلى ذلك وكانت المعاني صحيحة كمخاطبة العجم من الروم والفرس والترك بلغتهم وعرفهم ، فإن هذا جائز حسن للحاجة و إنما كرهه الأئمة إذا لم يحتاجوا إليه ۔ (درء تعارض العقل والنقل:۱/۴۳)

مذاکرات کا ابتدائی موضوع

ایک اہم سوال یہ ہے کہ حوار کے مضامین کیا ہونے چاہئیں؟ —— اس سلسلے میں قرآن مجید سے ہمیں جو رہنمائی ملتی ہے، وہ یہ ہے کہ پہلے ان اُمور کی دعوت دی جائے اور ان باتوں سے گفتگو کا آغاز کیا جائے، جو دونوں کے درمیان مشترک ہوں :

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ۔ (آل عمران: ۶۴)

’’کلمہ سواء‘‘ جس کی طرف تمام انبیاء نے دعوت دی ہے، وہ بنیادی طور پر توحید و رسالت اور آخرت ہے، خاص کر تمام آسمانی کتابیں ان عقائد پر متفق ہیں ؛ اس لئے حوار کا بنیادی مضمون یہی ہونا چاہئے اور اس بات کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اسلام گفتگو کے آغاز کے لئے اور دعوتِ اسلام کو آسان بنانے کے لئے اس بات کا تو قائل ہے کہ کلمہ سواء اور مشترک عقائد سے آغاز کیا جائے ؛ لیکن وہ وحدت دین کا قائل ہے کہ دین ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ۔ (الشوریٰ: ۱۳)

اور یہ بھی واضح فرما دیا گیا کہ اللہ کے یہاں اس دین کے علاوہ کوئی اور دین قابل قبول نہیں :

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۔ (آل عمران: ۸۵)

وہ وحدت ادیان کا قائل نہیں ہے جیسا کہ کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ تمام مذاہب ایک ہیں، منزل ایک ہے اور راستے الگ الگ ہیں، اسلام کی نظر میں ایک ہی راستہ ہے جو اللہ کی رضاء وخوشنودی کی طرف آتا ہے، اس کے سوا جو بھی راستے ہیں، وہ انسان کو گمراہی کی طرف لے جانے والے ہیں۔

کلمۂ آخریں

محترم حضرات ! یوں تو مذاکرات اور حوار کی اہمیت ہر جگہ ہے ؛ لیکن ہندوستان میں اس

کی اہمیت نسبتاً زیادہ ہے، اور اس کے دو بنیادی اسباب ہیں، ایک یہ کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا کثیر مذہبی ملک ہے، دنیا کا شاید ہی کوئی مذہب ہو، جس کے ماننے والے اس ملک میں نہیں بستے ہوں، ہندوستان کا یہ ملا جلا معاشرہ صرف اِسی دور میں نہیں ہے؛ بلکہ زمانۂ قدیم سے اس کی یہی روایت رہی ہے، اس ملک میں بودھ ازم پیدا ہوا، اسی ملک میں ویدک دھرم (ہندو مذہب) نے جنم لیا، اسی ملک میں جین مت اور سکھ مت پیدا ہوئے، خود اسلام بالکل ابتدائی دور میں یہاں پہنچا اور بہت کم عرصہ میں ملک کے طول وعرض میں اس کی روشنی پھیل گئی، اس کے علاوہ عیسائی، یہودی، پارسی وغیرہ بھی یہاں بڑی تعداد میں رہے ہیں اور اس وقت بھی موجود ہیں —— حوار سے یہاں پُرامن ماحول قائم ہوگا، مفاہمت کا مزاج پیدا ہوگا اور بقاء باہم کے اُصول پر تمام مذاہب کے ماننے والے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے عادی بنیں گے۔

دوسرے: یہ ملک دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے، جس میں تمام گروہوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے، یہاں جمہوریت کو استحکام اور ہمہ مذہبی کلچر کو قبول عام حاصل ہے، اسی کا ایک مظہر یہ ہے کہ اس ملک کا صدر ایک ہندو، نائب صدر ایک مسلمان، وزیر اعظم ایک سکھ، اسپیکر ایک دَلت خاتون اور برسر اقتدار اتحاد کی لیڈر ایک عیسائی خاتون ہے؛ لہٰذا اس ملک میں حوار و مذاکرات کے لئے سازگار فضا اور خوشگوار ماحول موجود ہے، جو نہ صرف بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں ممد ومعاون ہوں گے؛ بلکہ اسلام کی دعوت واشاعت میں بھی ان سے فائدہ اُٹھایا جاسکے گا۔

اسی پس منظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے: ''**الضوابط الشرعية والمنهجية للحوار بين الأديان**'' کے عنوان پر یہ ورکشاپ منعقد کیا ہے اور پورے ملک سے اصحابِ علم ونظر اور دینی وعصری جامعات کے اساتذہ کو شرکت کی دعوت دی ہے؛ تاکہ ہم یہاں کی جمہوری فضا اور رواداری پر مبنی سماج میں بین مذہبی مذاکرات کو فروغ دیں اور حوار کو اسلام کی استدلالی بالادستی اور اس کے فکری غلبہ وظہور کو ثابت کرنے کا ذریعہ بنائیں۔

دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو کامیاب فرمائے اور اسے اسلام کی دعوت واشاعت کے لئے مؤثر وسیلہ بنائے، **وباللہ التوفیق وھو المستعان**۔

●●●

ہندوستانی مدارس میں اسلامی اقتصادیات کی تعلیم ☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين و علىٰ آله و صحبه أجمعين ، أما بعد !

جنابِ صدر، بزرگانِ محترم، برادرانِ عزیز! یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے اور اس حقیقت پر گذشتہ اور موجودہ تاریخ کی شہادت ثبت ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے لئے افراد سازی کا سب سے بڑا مرکز دینی مدارس ہیں اور اب ان مدارس کی اہمیت کو مشرق سے مغرب تک اور اپنوں سے بے گانوں تک محسوس کیا جاتا ہے، خاص کر ہندوستان میں تحریکِ مدارس کا بڑا نمایاں رول رہا ہے، اس ملک کو آزاد کرانے میں علماء نے جو ناقابل فراموش کاوشیں کی ہیں اور اس راستہ میں بلا تامل دار و رسن کو گلے لگایا ہے، وہ ایک زندہ حقیقت ہے، افسوس کہ اسے فراموش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے نہ صرف ہندوستان میں؛ بلکہ پوری دنیا میں جو باطل تحریکات اُٹھی ہیں، ان کا سیلاب روکنے کے لئے اللہ کی توفیق سے فرزندانِ مدارس ہی کھڑے ہوئے ہیں، یا کم از کم انھوں نے اس سلسلہ میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، انھوں نے الحاد، احکام شریعت کی بے جا تاویل اور آیاتِ قرآنی کی انحراف آمیز توضیح کو پوری قوت کے ساتھ روکا ہے، انھوں نے حدیثِ نبوی کی حجیت، دین میں اس کی اہمیت اور اس کے اعتماد و استناد کے خلاف چلائے جانے والی منظم تحریک —— جو ہندوستان سے مصر تک پوری قوت، مغرب کی تائید اور بعض دفعہ سربراہانِ ملک کی پشت پناہی کے ساتھ آگے بڑھائی گئی —— کا بھرپور اور مؤثر مقابلہ کیا ہے، رسول اللہ ﷺ کی عظمت، ان کی سیرت کی نزاہت و پاکیزگی اور ختم نبوت پر جب بھی کسی گروہ نے پتھر پھینکنے کی کوشش کی، علماء نے اس کا مقابلہ کرنے اور ناموس نبوت کی حفاظت کرنے کو اپنے جگر پاروں کے رگ گلو کی حفاظت سے بھی زیادہ اہمیت دی ہے، مسلمانوں کو جب بھی دعوتِ ارتداد دی گئی، خواہ آریہ سماجیوں کی طرف سے ہو یا عیسائیوں کی طرف سے، اس کی مزاحمت اور اسلام کی طرف سے مدافعت کو فرزندانِ مدارس نے اپنی

☆ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے زیر اہتمام دہلی میں منعقدہ ایک سیمینار میں دیا جانے والا خطبہ افتتاحیہ۔

سب سے بڑی ذمہ داری سمجھا اور اس راہ میں پھانسی کے پھندوں اور قید و بند کی زنجیروں کو بھی خاطر میں نہیں لائے، دین میں جب بھی انحراف پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تو ان ہی علماء نے بلا خوفِ لومۃ لائم اس کا مقابلہ کیا اور دین کی اس محبت اور سنت رسول پر اس جانثاری کی وجہ سے دشنام طرازی اور تکفیر کے تیر بھی سہے، احکام شریعت کو جب بھی مجروح کرنے اور اُمت مسلمہ کو اس سے محروم کرنے کی کوشش کی گئی، تو ان ہی علماء نے اس فتنہ کی سنگینی کو محسوس کیا اور اس کے مقابلہ کے لئے اُمت کو للکارا، اسی قدسی گروہ نے ملک کو آزاد کرانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا اور اللہ کی زمین پر اللہ کی شریعت کو نافذ کرنے کی حتی المقدور کوششیں کی۔

یہ تو علماء کی حفاظتی اور دفاعی خدمات کی چند جہتیں ہیں؛ لیکن اس کے علاوہ مثبت طریقہ پر مسلمانوں کو دین سے مربوط رکھنے کے لئے علماء نے جو کوششیں کی ہیں، وہ تاریخ کا ایسا روشن باب ہے کہ اخیر دور میں شاید ہی اس کی کوئی نظیر مل سکے، لوگ اسٹیج پر تعلیم کو عام کرنے کی باتیں خوب کہتے ہیں؛ لیکن خود ان داعیانِ تعلیم نے اپنے دروازوں کو متمول اور دولت مند لوگوں تک محدود کر رکھا ہے، جو لوگ غریبوں کی جھونپڑیوں میں علم کا چراغ جلاتے ہیں اور شہر کی رونقوں سے دور قریوں اور دیہاتوں میں علم کا آبِ حیات پہنچاتے ہیں، وہ یہی علماء اور ان کے زیر انتظام دینی درسگاہیں ہیں، یہ درسگاہیں نہ صرف مسلمانوں کو دین و اخلاق اور تہذیب و تمدن سے آراستہ کرتی ہیں؛ بلکہ ارتداد اور بے دینی سے ان کی حفاظت بھی کرتی ہیں، اس کے علاوہ آج مسلمانوں میں جو کچھ سماجی و اصلاحی کام ہو رہا ہے، حلال و حرام کی فکر پائی جا رہی ہے اور دینی حمیت اور ایمانی غیرت باقی ہے، وہ ان ہی مدارس اور ان کے فضلاء کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

زمانہ جوں جوں گذرتا جا رہا ہے، حالات نازک سے نازک تر ہوتے جا رہے ہیں، آج عالمی سطح پر اسلام کو بدنام کرنے اور مسلمانوں کو رسوا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، کمیونزم کے زوال کے بعد مغرب نے محسوس کر لیا ہے کہ اسلام ہی اس کا سب سے بڑا رقیب ہے اور سرمایہ دار نظام کو اب صرف اسلام سے مقابلہ درپیش ہے، انھیں اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ ایک نظام حیات کا مقابلہ دوسرے نظام حیات ہی سے ہوتا ہے، آہن و آتش کے ذریعہ زمینیں فتح کی جا سکتی ہیں، ملکوں کے نقشے بدلے جا سکتے ہیں، لوگوں کی گردنیں جھکائی جا سکتی ہیں؛ لیکن اس کے ذریعہ دل و دماغ کو فتح نہیں کیا جا سکتا، اس کے ذریعہ اقلیم قلب کی کشور کشائی نہیں ہو سکتی اور فکر و عقیدہ کو شکست نہیں دی

جاسکتی، وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ اُمت اتنی سخت جان ہے کہ ہزار ابتلاؤں اور آزمائشوں کے باوجود وہ دامن نبوت کا ایک تار بھی چھوڑنا نہیں چاہتی اور اسلام کی کشش اور جاذبیت کچھ ایسی ہے کہ میدانِ جنگ کے سورما اور تیغ وشمشیر کے شہسوار بھی اس کے آگے جبین اعتراف خم کررہے ہیں اور فاتح خود مفتوح بنے جاتے ہیں؛ اس لئے آج اسلام پر ہمہ پہلو یلغار کی جارہی ہے اور اس کے لئے ہر طرح کی تلبیس وتحریف کا راستہ کھول دیا گیا ہے، اس پس منظر میں علماء کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔

یہ امر محتاجِ اظہار نہیں کہ شریعتِ اسلامی کا ایک امتیازی وصف اعتدال وتوازن اور انسانی فطرت سے ہم آہنگی ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان معاش کا محتاج ہے، وہ اس سے محروم رہ کر زندگی کی راہ میں چند قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا؛ چنانچہ اسلام نے نہ صرف کسبِ معاش کو جائز رکھا؛ بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی، قرآنِ مجید نے مال کو ''خیر'' **(العادیات:۸)** اور ''فضل الٰہی'' **(الجمعة:۱۰)** سے تعبیر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اللہ کے بندوں کی ضروریات کی تکمیل کے لئے کسبِ معاش کو دوش بدوش رکھتے ہوئے فرمایا گیا کہ جب نماز سے فارغ ہوجاؤ تو روزی کی تلاش کی سرگرمیوں میں لگ جاؤ:
''فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللهِ'' **(الجمعة:۱۰)** — اگر دولت اس کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ حاصل کی جائے، تو اسلام نے اس کی مذمت نہیں کی ہے؛ اسی لئے ہمیں قرآنِ مجید میں صاحب ثروت پیغمبروں کا اور حدیث میں صاحبِ ثروت صحابہ کا ذکر ملتا ہے، اور ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں زکوٰۃ لینے کا ذکر تو غالباً ایک ہی جگہ ہے، لیکن زکوٰۃ دینے کا حکم مختلف الفاظ میں ۶۵ جگہ ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ زکوٰۃ دولت مند ہی پر واجب ہوتی ہے۔

البتہ اسلام نے کسبِ معاش کی ایسی بے قید اجازت بھی نہیں دی کہ انسان اخلاقی اور انسانی حدود سے باہر چلا جائے؛ اسی لئے شریعت نے مال کے سلسلے میں دونوں پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، ایک یہ کہ مال کس طرح کمایا جائے، دوسرے یہ کہ مال کہاں خرچ کیا جائے؟ کسب کے ذرائع کیا ہوں اور خرچ کے مواقع کیا ہوں؟ ان دونوں جہتوں میں ایسے احکام دیئے گئے ہیں کہ معاشرہ میں انصاف قائم ہو، ہر شخص کو اپنی محنت کا پھل ملے؛ لیکن وہ بالکل خودغرض نہ ہوجائے، وہ ایسی اجتماعی ملکیت کا بھی قائل نہیں، جس میں افراد درخت اور پتھر کی طرح بے اختیار ہوجائیں اور انھیں روبوٹ تصور کرلیا جائے؛ کیوں کہ ذاتی منافع کی طلب یقیناً ایسی چیز ہے، جس سے معاشی تگ ودو کے جذبات پروان چڑھتے ہیں اور پھر اس سے معیشت کو ترقی حاصل ہوتی ہے، اور وہ ایسی انفرادی

ملکیت کا بھی قائل نہیں، جس کی بنیاد خود غرضی، استحصال اور حق تلفی پر ہو اور جس میں ایثار، دوسروں کی رعایت اور انفاق کے لئے کوئی جگہ نہ ہو، قرآن وحدیث کی معاشی تعلیمات اور مسلمان فقہاء کے اجتہادات کی یہی بنیاد ہے۔

معیشت کی اہمیت کی وجہ سے یہ موضوع ہمیشہ سے علماء کی فکر کا محور رہا ہے، تدوین فقہ کے بالکل ابتدائی دور میں ہمیں امام محمد بن حسن شیبانی کا نام ملتا ہے، جنھوں نے ''کتاب الکسب'' تالیف فرمائی اور اس میں کسب کے جائز و ناجائز ذرائع اور ان سے متعلق فضائل واحکام پر روشنی ڈالی، یہ اصل کتاب تو غالباً اب تک شائع نہیں ہوسکی ہے؛ لیکن اس کا خلاصہ علامہ ابوبکر محمد بن احمد سرخسی (م: ۴۸۳ھ) نے اپنی کتاب ''المبسوط'' میں درج کیا ہے، اسی طرح ابتدائی دور کی کتابوں میں ہمیں قاضی ابو یوسف کی ''کتاب الخراج'' اور علامہ ابوعبید کی ''کتاب الاموال'' بھی ملتی ہے، جس کا تعلق ایک اسلامی حکومت کی مدات آمدنی اور مداتِ خرچ سے ہے، ذیلی طور پر فقہ المعاملات کی بحثیں ہمیں ان فقہی کتابوں میں تو ملتی ہی ہیں، جن میں تمام مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ان کے علاوہ جو کتابیں ''احکام سلطانیہ'' یعنی حکومتی قوانین ''احکام قضا'' یعنی عدالتی قوانین اور ''احکام سیر'' یعنی بین قومی تعلقات سے متعلق قوانین پر لکھی گئی ہیں، ان میں بھی اقتصادیات سے متعلق احکام اچھے خاصے آجاتے ہیں، غرض کہ ہمارے فقہاء نے ان مسائل کو ہمیشہ خصوصی اہمیت دی ہے۔

صنعتی ترقی کے بعد معاشی نظام کے سلسلے میں جو نئے افکار پیدا ہوئے، انھیں نظریہ کی حیثیت سے ترقی حاصل ہوئی، اور عالمی سطح پر وہ غور وفکر اور عملی کوششوں کا محور بن گئے، نیز اشتراکیت اور سرمایہ داری نے ایک نظام حیات کی شکل اختیار کرلی، اس پس منظر میں اسلام کے معاشی نظام کی توضیح اور اس کی تطبیق کے سلسلے میں علماء نے مفید کاوشیں کی ہیں، گو خلافتِ عثمانیہ کے سقوط اور مسلم ممالک میں تمام شعبہ ہائے حیات میں اسلام کی حکمرانی سے گریز کی وجہ سے ان کو اس درجہ فروغ حاصل نہیں ہوسکا، جو ہونا چاہئے تھا، مقام مسرت ہے کہ ان کاوشوں میں علماء ہند کی بھی نمایاں خدمات ہیں، غالباً موجودہ دور میں اس موضوع پر پہلی کتاب مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی ''اسلامی معاشیات'' ہے، جو بڑے سائز کے تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس موضوع پر مولانا نے بڑی نادر تحقیقات پیش کی ہیں، انھوں نے اپنے آپ کو صرف قدماء کے افکار کا اسیر نہیں رکھا ہے؛ بلکہ قارئین اس میں ''قال'' کے ساتھ ''اقول'' کا بھی بڑا سرمایہ پائیں گے، مولانا ہی کی نگرانی میں ان کے

ایک فاضل شاگرد ڈاکٹر محمد یوسف الدین نے بھی اس موضوع پر مقالہ لکھا، اور ڈاکٹر انور اقبال قریشی سابق صدر شعبۂ معاشیات عثمانیہ یونیورسٹی نے بھی دو ضخیم جلدوں میں ''اسلام کے معاشی نظریے'' کے نام سے اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا، اس طرح مولانا گیلانی کو اس اہم شعبہ میں سبقت و اولیت کا شرف حاصل ہے اور آج بھی اس کی وقعت اور قدر و قیمت روز اول کی طرح باقی ہے۔

مولانا گیلانی کے بعد اس سلسلے میں دوسرا اہم نام مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ کا لیا جاسکتا ہے، ان کی کتاب ''اسلام کا اقتصادی نظام'' — جو مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ کی خواہش پر لکھی گئی اور ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی — اپنے موضوع پر نہایت اہم اور جامع تالیف ہے، اس کے بعد اس موضوع سے متعلق علمی خدمات میں تین شخصیتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ہندوستان سے ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی اور ڈاکٹر احمد علی ندوی، جن میں سے اول الذکر کا کام طریقۂ استثمار پر ہے اور ثانی الذکر کا مالیات سے متعلق فقہی قواعد پر، اور تیسری شخصیت پاکستان سے مولانا محمد تقی عثمانی کی ہے، جن کی تالیفات عام طور پر مقبول و متداول ہیں، عالم اسلام میں اس وقت علماء اور معاشی ماہرین کی ایک قابل لحاظ تعداد نیز متعدد ادارے اسلامی معاشی نظام کی تشکیل و ترقی کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دے رہے ہیں، یہ بظاہر عجیب بات محسوس ہوتی ہے کہ اس موضوع پر کام کا آغاز تو ہندوستان میں ہوا؛ لیکن ہندوستان میں اس کام کو وہ توجہ حاصل نہیں ہوسکی، جو عالم اسلام اور عالم عرب میں ہوئی، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ عالم اسلام میں اسلامی طرز معیشت کو عملی شکل دینے کے مواقع مہیا تھے؛ گو مسلم حکومتوں نے اس پر کماحقہ توجہ نہیں کی، اور ہندوستان کے معاشی قوانین اسلامی مالیاتی نظام کے قیام میں حارج ہیں، خدا کرے جلد ایسے موانع دور ہوجائیں، **وما ذلک علی اللہ بعزیز۔**

عصر حاضر میں اسلام کے معاشی نظام کے مطالعہ اور اس کی مشکلات کو حل کرنے کی اہمیت اس لئے بڑھ گئی ہے کہ جنگ عظیم اول کے بعد معاشی نظام کے اعتبار سے دنیا دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی، سرمایہ داری اور کمیونزم، ان دونوں نظاموں کی کشمکش اور آویزشیں اتنی بڑھتی گئیں کہ بعض اوقات تو دونوں بلاک میں ایٹمی جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی، ۱۹۹۲ء کے بعد جب روس پارہ پارہ ہوا، تو گویا اشتراکی نظام کا دار الخلافہ ہی اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور اب سرمایہ دارانہ نظام بلاشرکت غیرے پوری دنیا پر حاوی ہے یا ہونے کے لئے کوشاں ہے، اب اس وقت دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کے مقابل اگر کوئی نظام ہے تو وہ اسلام ہے، یہی وہ حقیقت ہے، جو سرمایہ دارانہ ممالک کو مضطرب کئے ہوئی ہے:

کیوں کہ وہ اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ اسلحہ سے زمینیں فتح کی جاسکتی ہیں، فکر ونظر کو جیتا نہیں جاسکتا، ’افکار‘ افکار ہی سے شکست کھاتے ہیں، تاتاری مسلمانوں سے کہیں زیادہ طاقتور تھے؛ لیکن ان کے پاس کوئی فکری نظام نہیں تھا؛ اس لئے آخر مسلمانوں کے فاتح اسلام کے مفتوح بن گئے۔

یہی وجہ ہے کہ اس وقت مغرب اسلام کے معاشی وسماجی قوانین کو معاشی وسماجی ترقی میں رکاوٹ اور معاشی اداروں کے استحکام کے لئے نقصاندہ قرار دیتا ہے اور اسلامی مالیاتی اداروں کو ناکام کرنے کے لئے کوشاں رہتا ہے، ان حالات میں فقہاء اسلام کی ذمہ داری ہے کہ وہ موجودہ دنیا —— جو صنعتی ترقی کے اوجِ کمال پر ہے اور جس نے مشرق ومغرب کے فاصلوں کو سمیٹ دیا ہے —— کی ضرورتوں کو پورا کرتے اور دشواریوں کو حل کرتے ہوئے اسلامی معاشی نظام کا ڈھانچہ بنائیں اور جو معاشی ادارے آج کی ضرورت بن چکے ہیں، ان کو اسلامی پیکر عطا کریں، نیز انھیں سرمایہ دارانہ نظام کی ناانصافی سے بچاتے ہوئے لوگوں کے لئے قابل عمل بنائیں، اور موجودہ حالات اس کے لئے موزوں ترین حالات ہیں؛ کیوں کہ ۲۰۰۸ء سے پوری دنیا جس مالی بحران سے دوچار ہے اور جس نے معاشی دنیا میں ایک زلزلہ سا برپا کردیا ہے، اس نے سرمایہ دارانہ نظام کی ناکامی کو پوری طرح واضح کردیا ہے؛ حالاں کہ مغربی طاقتیں کھل کر یہ کہنے کو تیار نہیں ہیں؛ لیکن دبے لفظوں میں بعض حقیقت پسند ماہرین اس کا اعتراف بھی کررہے ہیں؛ اس لئے اس وقت خاص طور پر اس دور کے فقہاء کو اس کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔

اس وقت مالیاتی نظام میں تین اداروں کی خاص اہمیت ہے، بینک، اسٹاک ایکسچینج اور انشورنس کمپنیاں، یہ تینوں ادارے موجودہ صنعتی دور کے لئے ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں، بینک کھاتہ داروں کی رقم کی حفاظت کرتا ہے، بروقت اس کی واپسی کو یقینی بناتا ہے، کاروباری مقاصد اور دوسری ضرورتوں کے لئے بڑے بڑے قرضے دیتا ہے، رقوم کی ترسیل میں واسطہ بنتا ہے، اپنے کھاتہ داروں کو نفع دیتا ہے، شیئرز کمپنیاں بڑے کاروبار کے لئے رقم فراہم کرنے کا نہایت اہم ذریعہ ہیں، اس کے ذریعہ عام لوگ بڑی بڑی کمپنیوں تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں اور اپنا سرمایہ لگاسکتے ہیں، بھاری صنعتوں، فاصلاتی تجارت اور ایکسپورٹ امپورٹ، صنعتی فضلات کی کثرت کی وجہ سے خطرناک بیماریوں کی کثرت ایسی چیزیں ہیں کہ ان کی وجہ سے خطرات بہت بڑھ گئے ہیں، ان خطرات کا مداوا انشورنس سے ہوتا ہے، اس لئے ہم ان اداروں کو غیر ضروری نہیں کہہ سکتے اور ایسے

حالات میں جب کہ عالمی سطح پر معیشت باہم مربوط ہوگئی ہے، ایسے اداروں کے بغیر کسی ملک کے وجود کا تصور بھی نہیں کر سکتے؟ مگر افسوس کہ آج ان اداروں کی نشوونما جن دماغوں کے ذریعے ہورہی ہے، انھوں نے ان مفید اور اہم خدمات انجام دینے والے اداروں کے رگ وریشہ میں ربا وقمار کو داخل کردیا ہے، اب ہمارا فرض ہے کہ جیسے مریض کے جسم کو بچاتے ہوئے اس کی بیماری کا علاج کیا جاتا ہے، اسی طرح ہم ان اداروں کو باقی رکھتے ہوئے اس کی خامیوں کو دور کریں اور اسے پوری طرح اسلام کے رنگ میں رنگ دیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں سود، قمار اور محرمات سے پاک بینک انشورنس، میچول فنڈ اور شیئرز میں سرمایہ کاری کو فروغ دینے کی کوشش کی جارہی ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اسلامک بینکنگ کی کوششوں میں مسلمانانِ ہند کو اولیت حاصل ہے، تو غلط نہیں ہوگا؛ کیوں کہ ۱۸۵۶ء میں حیدرآباد دکن میں غیر سودی سوسائٹی پہلی بار قائم ہوئی، حیدرآباد ہی میں ۱۹۲۵ء میں انجمن امداد قرض بلا سود کا قیام عمل میں آیا، غالباً ۱۹۳۶ء میں مسلم فنڈ قائم ہوا، اس کے علاوہ بھی ہندوستان کے شمالی اور جنوبی علاقوں میں بعض ادارے قائم ہوتے رہے، عالم اسلام میں اس کا نقطۂ آغاز مصر کے ایک قریہ مِت غمر کو قرار دیا جاتا ہے، جہاں ۱۹۶۲ء میں غیر سودی کوآپریٹیو بینک کا قیام ہوا، اسلامک بینکوں کے لئے استثمار کا بھی سب سے پہلا ماڈل ''مضاربہ ماڈل'' کے نام سے الٰہ آباد کے ایک پروفیسر نے پیش کیا، ۱۹۷۴ء میں دبئی اسلامک بینک قائم ہوا، جو ایک مکمل بینک تھا، ۱۹۷۵ء میں (IDB) کا قیام عمل میں آیا اور ۱۹۷۶ء میں شاہ فیصل نے سوڈان اور بحرین وغیرہ میں اسلامی بینک قائم کئے۔

واقعہ ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں اسلامک بینکنگ کو پذیرائی حاصل ہورہی ہے، یہاں تک کہ غیر مسلم مالکان بھی مسلمانوں کا سرمایہ حاصل کرنے کے لئے اپنے یہاں اسلامی استثمار کا کاؤنٹر کھول رہے ہیں اور غیر مسلم کمپنیاں بھی اسلامی انشورنس کی دہائی دے رہی ہیں، ان حالات میں ایک طرف تو ایسے افراد کی ضرورت ہے، جو جدید معاشی نظام سے واقف ہوں اور فقہ اسلامی پر ان کی گہری نظر ہو، دوسری طرف ان اداروں کی نگرانی کی ضرورت ہے؛ تاکہ اسلام کے نام پر قائم ہونے والے یہ ادارے صحیح راستے سے منحرف نہ ہوجائیں اور دین کے نام پر بے دینی کو رواج دینے کا ذریعہ نہ بن جائیں، ان دونوں مقاصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ دینی مدارس میں اسلامی معاشیات کو داخل کیا جائے؛ کیوں کہ ملت کے مختلف کاموں کے لئے افراد سازی کا اس سے بڑا

اور کوئی مرکز نہیں، ان کی حیثیت پاور ہاؤس کی ہے، جس سے اُمت کے تمام کاموں کے لئے انرجی حاصل ہوتی ہے، یہ اُمت کے لئے قلب کا درجہ رکھتے ہیں، جو اس جسم کے ایک ایک عضو کو خون پہنچاتا ہے، اس وقت یہ مذاکرہ تین اداروں کے اشتراک سے منعقد ہو رہا ہے اور یہ تینوں ہی ادارے سودی نظام کی جگہ غیر سودی نظام کو لانے کے لئے اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق کوشاں رہے ہیں، (IDB) عالمی سطح کا نہایت فعال ادارہ اور سب سے بڑا اسلامی بینک ہے، جو مالیاتی اداروں کے ساتھ بڑے پیمانے پر رفاہی کام بھی انجام دیتا ہے اور ہم اور آپ سب اس کی وسیع خدمات سے واقف ہیں، انسٹیٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز کے قیام کو بیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے، اس عرصہ میں اس نے علم و تحقیق کے بڑے اہم کام انجام دیئے ہیں اور مختلف شعبوں میں دور رس منصوبہ بندی کے ساتھ کاموں کا آغاز کیا ہے، اس کی خدمات آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں، غیر سودی سرمایہ کاری کے لئے بھی اس نے بڑی کاوشیں انجام دی ہیں اور ایسے اداروں کی مدد کے لئے ''شریعہ بورڈ'' بھی تشکیل دیا ہے۔

تیسرا ادارہ ''اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا'' ہے، جس کا بنیادی مقصد ہی عصر حاضر میں پیدا ہونے والے شرعی وفقہی مسائل کو حل کرنا ہے، اب اس نے بیسویں سال میں قدم رکھا ہے، بحمد اللہ ملک و بیرونِ ملک میں اس کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، نئے مسائل پر اس کے اٹھارہ سیمینار منعقد ہو چکے ہیں، جس میں ۱۷۵ موضوعات سے زیادہ عصری مسائل زیر بحث آئے ہیں، مالیاتی مسائل پر شروع سے اکیڈمی کی خصوصی توجہ رہی ہے، اسلامی معاشیات کا مثبت حصہ زکوۃ وعشر سے متعلق ہے؛ چنانچہ ان موضوعات پر ایک سے زیادہ مستقل سیمینار منعقد ہوئے ہیں، اس کا سلبی پہلو نظام معیشت کی سود و قمار سے تطہیر اور جدید معاشی اداروں کے اسلامی متبادل کی نشاندہی ہے؛ چنانچہ بینک انٹرسٹ، غیر سودی قرض دینے والے اداروں کی ہیئت، انشورنس، اسلامی بینکنگ کے مسائل ـــــ مرابحہ، بیع بالتقسیط وغیرہ ـــــ نیز کریڈٹ کارڈ، ملٹی لیول مارکٹنگ اور ان جیسے بہت سے موضوعات کو اکیڈمی نے بحث کا موضوع بنایا ہے اور اجتماعی طور پر ان کے بارے میں شرعی رہنمائی کی ہے، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہندوستان میں غیر سودی بینکاری کے امکانات کی تلاش میں اکیڈمی نے بڑی کاوشیں کی ہیں، اس کے لئے ماہرین معاشیات، معاشی قوانین کے ماہرین اور مفتیانِ کرام کا ایک گروپ بنایا گیا اور بڑی دقت نظر کے ساتھ اس پر غور کیا گیا اور بالآخر اس پر پروجیکٹ رپورٹ تیار کی

گئی، جس کی مولانا محمد تقی عثمانی (پاکستان) اور ڈاکٹر انس زرقاء (سعودی عرب) جیسے عالم اور ماہر معاشیات نے بڑی تحسین کی، گو ساری محنتوں کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا گیا کہ ہندوستان کے موجودہ قوانین کے تحت ایک مکمل اسلامی بینک کا قیام یہاں ممکن نہیں؛ البتہ کوآپریٹو سوسائٹی کے ذریعہ اسلامی طریقہ پر استثمار کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

آج اس موضوع پر ملک بھر سے دینی مدارس کے ذمہ داروں اور نمائندہ شخصیتوں کو جمع کرنا ان تینوں اداروں کے لئے یقیناً سعادت وشرف کی بات ہے، جس کا مقصد اللہ کی زمین پر اللہ کی شریعت کے نفاذ کے لئے راستہ ہموار کرنا ہے، ان کلمات کو ختم کرتے ہوئے بے ساختہ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نوکِ قلم پر آتا ہے:

إن مثل العلماء في الأرض كمثل النجوم في السماء يهتدى به في ظلمات البر والبحر ، فإذا انطمست النجوم أو شك أن تضل الهداة ـ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۲۱۸۹)

زمین میں علماء کی مثال آسمان پر ستاروں کی طرح ہے، جس کے ذریعے خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں رہنمائی حاصل کی جاتی ہے، اگر تارے ماند پڑ جائیں، تو بعید نہیں کہ صحیح راستہ چلنے والے بھی بھٹک جائیں۔

دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مذاکرہ کو ثمر آور اور نتیجہ خیز بنائے اور ہمیں ایسے فیصلوں کی توفیق عطا فرمائے، جن میں اس کی رضا وخوشنودی ہو۔

اللهم أرنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه ، وأرنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه ـ

● ● ●

دینی وعصری تعلیم کا امتزاج ☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء و المرسلين وعلى آله وأصحابه أجمعين ، أما بعد ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ۔

صدر عالی قدر، مہمانانِ گرامی، بزرگانِ محترم وبرادرانِ عزیز! اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے کہ اس وقت المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے بارہویں جلسہ تقسیم اسناد میں آپ حضرات کا استقبال کرنے کی سعادت حاصل ہورہی ہے، اب تک معہد سے ۶۹۵ طلبہ سندِ فراغت حاصل کر چکے ہیں، جو دینی وعصری درسگاہوں میں تدریس، افتاء وقضاء، تصنیف وتحقیق، اُردو وانگریزی صحافت، برادران وطن یا مسلمانوں میں دعوتِ دین، امامت وخطابت، ملی وسماجی کاموں میں شرکت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سبھوں کی خدمات کو قبول فرمائے اور ان سے اسلام کی اور ملت اسلامیہ کی زیادہ سے زیادہ خدمت لے۔

حضرات ! پیغمبر اسلام ﷺ کی نبوت کا آفتاب جس قوم میں طلوع ہوا، وہ ایک ''اُمی'' قوم تھی، ''اُمی'' اسے کہتے ہیں جو لکھنا اور لکھی ہوئی چیز کو پڑھنا نہ جانتا ہو، اس میں شبہ نہیں کہ عربوں میں شعر وسخن اور زبان وادب کا ایک خداداد مذاق تھا اور وہ اپنے کلام کے ذریعے بربط دل کو چھیڑنے، لہو کو گرمانے اور محبوب کے لب وعارض کا نقشہ کھینچنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے؛ لیکن یہ اشعار اور ادبی سرمایہ زیادہ تر سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا تھا، وہ اپنے حافظہ سے تحریر کا کام لیتے اور صفحۂ قرطاس کے بجائے صفحۂ دل پر نقش کرنے کا اہتمام کرتے تھے، عربوں میں بعض لکھنے پڑھنے والے بھی تھے، رسول اللہ ﷺ اور بنو ہاشم کے شعب ابی طالب میں بائیکاٹ کا واقعہ حدیث وسیرت کی کتابوں میں موجود ہے، جس میں بائیکاٹ کا تحریری اعلان غلاف کعبہ کے ساتھ آویزاں کرنے کا ذکر ہے، قرآن مجید نے بھی ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایک مکی تاجر پر جب سفر کی حالت میں

☆ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے منعقدہ بارہویں جلسہ تقسیم اسناد میں یہ کلیدی خطبہ پیش کیا گیا۔

موت کا وقت آیا تو اس نے اپنے سامان کی ایک فہرست بنا کر سامان میں چھپا دی اور سامان رفقاء سفر کے حوالہ کر دیا، اسی فہرست نے چوری اور بد دیانتی کے راز کو افشاء کیا، (المائدۃ:۱۰۸-۱۰۶) یہ اور اس طرح کے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ عربوں میں تحریر و کتابت کا ذوق موجود تھا؛ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی، بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ مکہ میں صرف سترہ افراد کو لکھنا آتا تھا: ''**دخل الإسلام وفی قریش سبعة عشر رجلا کلهم یکتب**'' (فتوح البلدان:٦٦٠-٦٦١) مدینہ کا معاملہ اس سے بھی زیادہ گیا گزرا تھا، واقدی نے ان لوگوں کے نام ذکر کئے ہیں، جو مدینہ میں لکھنے سے واقف تھے، جن کی تعداد گیارہ سے آگے نہیں بڑھتی، (فتوح البلدان:٦٦٣-٦٦٤) گو ان اعداد و شمار پر اعتماد دشوار ہے؛ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ عرب کا بڑا حصہ جہالت اور ناخواندگی کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں تھا اور نہ صرف علم کی دولت سے محروم تھا؛ بلکہ علم کی اہمیت، اس کی عظمت اور اس کی ضرورت وافادیت سے بھی نابلد تھا۔

یہ حالات تھے، جب آپ ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی، اس وحی میں شرک کی تردید اور خدا پر ایمان لانے کا صراحت کے ساتھ ذکر نہیں، جو قرآن کی دعوت کا عطر اور خلاصہ ہے، اس وحی میں ''آخرت'' کا تذکرہ نہیں، جو ایمان وعمل کا اصل محرک ہے، اس وحی میں آپ ﷺ کی نبوت ورسالت کا اعلان نہیں، جس پر اسلام کی پوری عمارت کھڑی ہے، اس ظلم وجور اور نااتفاقی کی مذمت نہیں، جو عرب سماج کے مزاج میں داخل ہو گیا تھا اور اس وحی میں ان اخلاقی برائیوں اور پستیوں پر بھی کوئی تنقید نہیں، جن کی اصلاح کو آپ ﷺ نے اپنی زندگی کا مشن بنایا، یہ پہلی وحی انسانیت کو ''تعلیم'' کی طرف متوجہ کرتی ہے، اس میں پہلا لفظ ہی ''اقراء'' کا ہے، جس کے معنی ہیں: ''پڑھ'' پھر ان پانچ آیتوں میں دو جگہ تعلیم وتعلم کا ذکر ہے، ایک میں ''قلم'' کے ذریعہ تعلیم ہونے کی طرف اشارہ فرمایا گیا: ''**عَلَّمَ بِالْقَلَمِ**'' یہ گویا کتابی تعلیم کی دعوت ہے، دوسری جگہ ان علوم کی تحصیل پر متوجہ کیا گیا، جو ابھی انسان کی گرفت میں نہیں ہیں اور انسان کی محنت اور اللہ کی مدد سے ہی ان کو حاصل کیا جا سکتا ہے: ''**عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ**'' گویا اس میں قیامت تک آنے والے سائنسی علوم اور ایجادات وانکشافات کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا؛ کیوں کہ ''علم'' ہی تمام اعتقادی اور عملی واخلاقی بیماریوں کا علاج ہے۔

غرض آپ ﷺ دنیا میں علم کا چراغ بن کر آئے اور اس جہالت کو اپنا نشانہ بنایا، جس کے سایہ میں برائیاں پنپتی ہیں؛ اس لئے قرآن مجید نے آپ ﷺ کی جس حیثیت کو زیادہ نمایاں کیا ہے، وہ یہی ہے کہ آپ ﷺ ''معلم'' ہیں اور انسانیت متعلم: ''**یُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ**'' (آل عمران:۱۶۴)،

رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں یہ پہلو اتنا نمایاں نظر آتا ہے کہ مکی زندگی میں بھی باوجود ہر طرح کی مشکلات اور دشواریوں کے آپ ﷺ نے اس کو نظر انداز نہیں فرمایا اور اپنے ایک جاں نثار کے مکان ''دارارقم'' کو — جو صفا کی پہاڑی پر واقع تھا — تعلیمی وتربیتی مرکز بنایا، مکی زندگی کی ابتداء ہی میں نہ صرف مردوں؛ بلکہ عورتوں میں بھی پڑھنے لکھنے کا ذوق پیدا ہو گیا تھا، اس کی واضح دلیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کا واقعہ ہے، جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہن اور بہنوئی کے قرآن پڑھنے کا ذکر ہے، قرآن کی کچھ سورتیں ان کے پاس لکھی ہوئی صورت میں موجود تھیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ پڑھنا صرف زبانی ہی نہ تھا، بلکہ کتاب کے ذریعہ تھا۔

مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد آپ ﷺ نے اولین کام یہی کیا کہ مسجد نبوی کی تعمیر فرمائی اور اسی مسجد سے متصل ایک ''چبوترہ''، تعلیمی مقصد کے لئے بنایا، جسے ''صفہ'' کہا جاتا تھا، یہ گویا اسلامی تاریخ کا پہلا مدرسہ تھا، اس مدرسہ میں غیر مقیم طلبہ بھی تعلیم حاصل کرتے تھے اور دار الاقامہ کا بھی نظم تھا، اس درس گاہ میں حالات ومواقع اور واردین کی بڑھتی گھٹتی تعداد کے لحاظ سے طلبہ کی تعداد کم وبیش ہوتی رہتی تھی، بعض حضرات کا خیال ہے کہ چار سو طلبہ نے بحیثیت مجموعی اس درس گاہ سے استفادہ کیا تھا اور قتادہ کی رائے ہے کہ مدرسہ صفہ سے مستفیدین کی تعداد نو سو تک پہنچتی ہے۔ (التراتیب الادار یہ:۱/۳۴۰)

اس درس گاہ کے نصابِ تعلیم کا موضوع قرآن مجید اور احکام کی تعلیم تھی؛ لیکن اس کے علاوہ تحریر وکتابت پر بھی پوری توجہ دی جاتی تھی، جس کی عرب کے اس معاشرہ میں بڑی اہمیت تھی، حضرت عبداللہ بن سعید بن عاص انصاری رضی اللہ عنہ جو غزوۂ بدر میں شہید ہو گئے تھے، اچھے کاتب تھے، آپ ﷺ نے ان کو کتابت سکھانے پر مامور فرمایا تھا، (الاصابہ:۱۷۷۷) علم وحکمت کے حصول میں آپ ﷺ نے دین ومذہب کے اختلاف کو بھی رکاوٹ نہیں بننے دیا؛ چنانچہ غزوۂ بدر میں جو مشرکین قید ہو کر آئے، ان میں جو لوگ کتابت سے واقف تھے، آپ ﷺ نے ان کا فدیہ یہی مقرر فرمایا کہ وہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بھی اہل صفہ کو قرآن اور کتابت سکھانے پر مامور تھے، (مسند احمد:۵/۳۱۵) اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ''جن کو بارگاہ نبوی ﷺ سے سب سے بڑے قاری ہونے کی سند عطا فرمائی گئی'' کے ذمہ خاص طور پر قرآن پاک کی تعلیم تھی۔ (بیہقی:۶/۱۲۶)

رسول اللہ ﷺ نے ''علم'' کو یہ عظمت عطا فرمائی کہ اسے خرید وفروخت کی جانے والی شئے

قرار نہیں دیا؛ بلکہ اسے عبادت کا درجہ دیا، جسے خالصۃً اللہ کی خوشنودی اور خلق اللہ کی خدمت کے جذبہ سے دوسروں تک پہنچایا جائے اور اسے سامان تجارت نہ بنایا جائے، حضرت اُبی کے ایک شاگرد نے ایک کمان تحفتاً پیش کی، انھوں نے آپ ﷺ سے اس کے بارے میں دریافت کیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم نے یہ کمان لی تو گویا آگ کی کمان حاصل کی، ''**إن أخذتها فخذبها قوساً من النار**'' (بیہقی: ۶/۱۲۶) اس لئے جو اساتذہ اس درس گاہ میں خدمت پر مامور تھے، وہ فی سبیل اللہ خدمت کرتے تھے۔

جو طلبہ ''صفہ'' میں مقیم تھے، اہل مدینہ ان کے کھانے کا نظم کرتے تھے اور ان کو اپنا اور اپنے رسول ﷺ کا مہمان سمجھ کر ان کے ساتھ خوب اکرام کا معاملہ فرماتے تھے، ان کے طعام کا نظم دو طریقوں پر ہوتا، اول یہ کہ خود صفہ میں کھانے کی چیز پہنچادی جاتی، چوں کہ عربوں کی عام غذا کھجور تھی؛ اس لئے کھجور کے خوشے صفہ کے ستونوں سے لٹکا دئے جاتے، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ دو ستونوں کے درمیان رسی باندھ کر اسی رسی سے کھجور کے خوشے لٹکا دیتے، (التراتیب الادار یہ: ۱/۴۷۵) دوسرا طریقہ یہ تھا کہ لوگ کچھ طلبہ کو اپنے گھر لے جاتے اور ان کو کھانا کھلاتے، ایک موقع پر آپ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ جس کے پاس دو اشخاص کے کھانے ہوں، وہ اپنے ساتھ تیسرے مہمان کو لے جائے، خود رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھ دس طلبہ کو لے گئے، (مسند احمد: ۱/۱۹۷) حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کا مکان اہل صفہ کے لئے گویا سب سے بڑا مہمان خانہ تھا، ابن سیرین کی روایت ہے کہ سعد بن عبادہ ہر شب اسّی طلبہ کو اپنے یہاں شب کا کھانا کھلاتے تھے، (سیر اعلام النبلاء: ۱/۲۰۰) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام طور پر دارالاقامہ میں طلبہ کی تعداد اسّی سے کم نہ ہوتی تھی۔

تعلیم کی طرف رسول اللہ ﷺ نے جو توجہ فرمائی اور اپنے قول وفعل کے ذریعہ توجہ دلائی، اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے ہر دور میں تعلیم وتربیت، علم کی خدمت اور تعلیمی اداروں کے قیام پر خصوصی توجہ دی۔

حضرات گرامی ! ایک زمانہ تک مذہب، اخلاق، زبان اور نوشت وخواند کی تعلیم کو کافی سمجھا جاتا تھا، صنعت کی حیثیت علم کی نہیں فن کی تھی، جو ابتدائی حالت میں تھی اور جس کو لوگ عملی تربیت کے ذریعہ حاصل کیا کرتے تھے، آہستہ آہستہ ان فنون نے علوم کی صورت اختیار کی، تجربہ گاہیں بنائی گئیں، کتابیں لکھی گئیں اور مسلمان علماء وحکماء نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے، جو تاریخ کا روشن

باب ہے، اس دور میں چوں کہ علم کی شاخیں اس قدر پھیلی نہیں تھیں اور طلبہ طویل مدت تک تعلیم حاصل کیا کرتے تھے؛ اس لئے خالص مذہبی علوم اور انسانی سماج کے لئے دوسرے مفید علوم ایک ساتھ پڑھائے جاتے تھے؛ اسی لئے ہمیں اسلامی تاریخ میں ایسی بہت سی شخصیات ملتی ہیں، جو اسلامی علوم کے ماہر بھی تھے اور فلسفہ و سائنس میں بھی ان کا پایہ اتنا بلند تھا کہ یورپ کے اہل علم بھی اپنے تمام تر تعصّبات کے باوجود حکمت و سائنس میں ان کے مرتبہ و مقام کے معترف ہیں، جیسے علامہ ابن باجہ کا حال یہ ہے کہ وہ حافظ قرآن بھی ہیں، اسلامی علوم میں ایک اہم مقام کے حامل بھی، علم فلسفہ علم وہیت، ریاضی اور طب میں ان کی کتابیں بہت اعلیٰ درجہ کی مانی گئی ہیں، ابن رشد (۵۲۰-۵۹۵) بڑے پایہ کے فقیہ ہیں، ان کی کتاب ''**بداية المجتهد**'' فقہ میں ایک بے مثال تالیف ہے؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ فن طب میں بھی ان کا اعلیٰ مرتبہ ہے اور دو درجن کے قریب ان کی کتابیں طب کے موضوع پر ہیں، اسی طرح امام فخر الدین رازیؒ بڑے پایہ کے مفسر اور اُصولی بھی ہیں اور اپنے عہد کے مانے ہوئے فلسفی بھی، علامہ سیف الدین آمدیؒ کی کتاب ''الاحکام فی اصول الاحکام'' جہاں اُصولِ فقہ میں نہایت اہم کتاب تسلیم کی گئی ہے، وہیں ان کی ''کتاب الباہر فی علم الاوائل'' اور ''کتاب الحقائق'' فلسفہ وحکمت کی بڑی بلند پایہ تصنیفات ہیں؛ بلکہ متقدمین میں اکثر علومِ طبعیہ کے ماہرین علومِ شرعیہ میں بھی مہارت رکھتے تھے، یہی طریقۂ تعلیم صدیوں عالم اسلام میں رواج پذیر رہا۔

ہندوستان میں محمد بن قاسم کا قافلہ ۷۱۲ء میں فاتحانہ داخل ہوا اور سب سے پہلے دیبل کا علاقہ فتح ہوا اور ۱۸۵۷ء میں دہلی میں مسلمانوں کے چراغ اقتدار نے آخری سانس لی، اس طرح مجموعی اعتبار سے مسلمانوں کا عہد حکومت قریب قریب ساڑھے گیارہ سو سال ہوتا ہے، اس پورے عرصہ میں مسلمانوں نے ہمیشہ تعلیم وتربیت کو بڑی اہمیت دی، مشہور محقق مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے مغربی سیاح ہملٹن سے نقل کیا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں صرف شہر ٹھٹھ میں مختلف علوم وفنون کے چار سو مدارس قائم تھے، (نظام تعلیم وتربیت: ۱/۱۷۴) مسلمانوں نے نہ کبھی کسی زبان سے تعصب برتا اور نہ کسی علم وفن سے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو عبرانی وسریانی زبان سیکھنے کا حکم دیا؛ حالاں کہ یہ ان لوگوں کی زبان تھی، جو اس وقت اسلام کی مخالفت اور اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں پیش پیش تھے؛ بلکہ بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بحیثیت مجموعی چھ یا آٹھ زبانیں سیکھی تھیں، مشہور حنفی فقیہ علامہ سرخسیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت سلمان

فارسی ﷺ نے قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا، حضرت عبداللہ بن زبیر ﷺ کے بارے میں منقول ہے کہ ان کے پاس سو ایسے غلام تھے جو الگ الگ زبانیں بولتے تھے، (التراتیب الاداریہ للکتانی)

یہی حال دیگر علوم وفنون کا ہے، علامہ ابن ندیم نے نقل کیا ہے کہ عہد صحابہ کے اواخر ہی میں خالد بن یزید بن معاویہ (متوفی: ۸۵ھ) کی خواہش پر نجوم، طب اور کیمیا سے متعلق کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں کرایا گیا تھا، مسلمانوں کی وسیع القلبی کا حال یہ ہے کہ منطق وفلسفۂ یونان جن کے بہت سے مسلّمات اسلام کی بنیادی فکر سے متصادم تھے، مسلمانوں نے ان کو بھی حاصل کیا، ان کی تعلیم دی اوران پر بیش قیمت کتابیں لکھیں۔

نہ جانے علماء ہند کے بارے میں کیسے غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ وہ انگریزی زبان اور مغربی علوم وفنون کے حاصل کرنے کو ناجائز سمجھتے ہیں اور کفر قرار دیتے ہیں؟ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے ۲۹/ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو بستر مرگ پر ہونے کے باوجود علی گڑھ میں ''نیشنل مسلم یونیورسٹی'' کی بنیاد رکھی تھی، جو بعد میں جامعہ اسلامیہ کے نام سے موسوم ہوئی اور دہلی منتقل ہوگئی، مولانا نے اس موقع پر اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا :

> آپ میں سے جو محقق اور باخبر لوگ ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے اور دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا، ہاں یہ کہا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر جو یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگ جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب والوں کا مذاق اُڑائیں اور حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے تو ایک مسلمان کے لئے جاہل رہنا اچھا ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ سے پہلے بھی شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا فتویٰ ملتا ہے کہ ''کالج جانا اور انگریزی سیکھنا بموجب مذہب کے سب درست ہے'' سرسید احمد خاں مرحوم نے اسباب بغاوتِ ہند میں اس کا ذکر کیا ہے، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں :

> انگریزی زبان سیکھنا درست ہے، بشرطیکہ کوئی معصیت کا مرتکب نہ ہو اور نقصان دین میں اس سے نہ ہووے۔ (فتاویٰ رشیدیہ: ۵۷۴)

دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ۱۲۹۰ھ میں دارالعلوم میں جلسۂ تقسیم انعامات سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> اگر اس مدرسہ کے طلباء سرکاری مدرسوں میں جاکر جدید علوم حاصل کریں تو یہ بات ان کو کمال کی جانب بڑھانے والی ثابت ہوگی ۔(۱)

مولانا نانوتویؒ نے دارالعلوم کے نصاب میں سنسکرت زبان کو بھی شامل فرمایا تھا ،ندوۃ العلماء کی تحریک جن مقاصد کے لئے شروع ہوئی ، ان میں ایک اہم ترین مقصد مدارسِ اسلامیہ کے نصابِ تعلیم کو اپنے عہد کے تقاضوں سے آہنگ کرنا تھا ، بانیٔ ندوہ حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ روشن دل کے ساتھ ساتھ روشن دماغ کے بھی مالک تھے ،انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لئے نصاب کا جو خاکہ پیش کیا اور اپنے نائب مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کو اس سلسلہ میں جو خطوط لکھے ، ان میں بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ اس پر روشنی گئی ہے ،مولانا مونگیریؒ فرماتے ہیں :

> انگریزی بھی ایک زبان ہے ،جس طرح فارسی وترکی وغیرہ ،جس طرح فارسی وترکی اولاً کفار کی زبان تھی ، جب اس زبان والے اسلام لائے تو مسلمانوں میں وہ زبان شائع ہوئی ، اسی طرح اگر خدا کا فضل ہو ، جس کے ہونے کی اُمید کی جاتی ہے اور انگریزی زبان والے اسلام لائیں تو ان کا حال بھی فارسی ،ترکی زبان کا ہوجائے گا اور جس طرح آپ فارسی میں کتب دینیہ دیکھتے ہیں ، انشاء اللہ انگریزی زبان میں بھی دیکھیں گے ۔

اس لئے یہ محض غلط فہمی ہے کہ مسلمان علماء انگریزی زبان یا جدید علوم کے مخالف ہیں ،اس وقت اس کی دو روشن مثالیں آپ کے درمیان موجود ہیں ، ایک اس جلسہ کے صدر حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی دامت برکاتہم جو دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسی اہم درسگاہ کے مہتمم بھی ہیں اور انٹیگرل یونیورسٹی لکھنؤ کے بانی اور چانسلر بھی ہیں ، دوسری شخصیت حضرت مولانا سید محمد ولی رحمانی دامت برکاتہم کی ہے ، جو جامعہ رحمانی مونگیر اور مختلف دینی درسگاہوں کے سرپرست بھی ہیں اور رحمانی ۳۰ کے بانی اور چیرمین بھی ، ان دونوں حضرات کی تعلیم خالص دینی درسگاہوں میں ہوئی ہے ؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ

(۱) روئداد دارالعلوم ۔

انھوں نے عصری تعلیم کے میدان میں جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں کم اس کی مثال ملے گی۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ جس وقت ہندوستان میں تحریک مدارس شروع ہوئی، اس وقت اس کے نصاب میں خالص دینی علوم کو جگہ دی گئی تھی، اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا سورج غروب ہوا، تو دین اور اُمت کے لئے گھلنے والے بزرگوں کو فکر ہوئی کہ کس طرح اس ملک میں مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت کا سروسامان کیا جائے، اس مقصد کے لئے خوب سوچ سمجھ کر دینی مدارس کے قیام کی کوشش کی گئی اور شہر شہر گاؤں گاؤں ان مدارس ومکاتب کا جال بچھایا گیا، اس سعی محمود اور جہدِ مسعود میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلفاء اور مجازین پیش پیش رہے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جو بلند پایہ عالم بھی تھے اور ہندومت، عیسائیت اور مذاہب باطلہ کے مقابلہ دندان شکن مناظر بھی، انھوں نے ۱۸۶۶ء میں مشہور دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی، جس کے فیض کی شعاعیں آج دنیا کے کونہ کونہ کو روشن کر رہی ہیں۔

اُس وقت صورتحال یہ تھی کہ جگہ جگہ حکومت کی طرف سے تعلیمی ادارے قائم ہو رہے تھے، جو عیسائیت کے تبلیغی مراکز کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، جہالت اور پسماندگی کی وجہ سے ارتداد کا خطرہ ایک حقیقی خطرہ تھا، جس نے زمانہ آگاہ علماء کو بے قرار کر رکھا تھا؛ اسی لئے ایک ایسا نصابِ تعلیم اختیار کیا گیا، جس میں پوری یکسوئی کے ساتھ اسلامی علوم کو حاصل کیا جائے اور اس نصاب کی مدت مختصر ہو؛ تا کہ کم سے کم وقت میں افرادِ کار تیار ہو سکیں اور وہ اپنی صلاحیت کے لحاظ سے اُمت کے مختلف کاموں کو انجام دیں، وہ مسجد کے منبر ومحراب کو بھی آباد کریں، مدارس بھی قائم کریں اور تدریس کا فریضہ انجام دیں، مکاتب کا بھی جال بچھائیں، دعوت واصلاح کی خدمت بھی انجام دیں اور اعداءِ اسلام کی طرف سے ہونے والی یلغار کا جواب بھی دیں؛ چنانچہ کوئی شبہ نہیں کہ اس نظامِ تعلیم کے ذریعہ ایسے علماء پیدا ہوئے، جنھوں نے مختلف میدانوں میں ملتِ اسلامیہ کی رہنمائی کی، قیامِ مدارس کی اس تحریک پر تقریباً ڈیڑھ سو سال کا عرصہ گذر چکا ہے؛ لیکن آج بھی ایسی دینی درسگاہوں کی ضرورت باقی ہے اور آج بھی برصغیر بلکہ پوری دنیا میں اسلامی شعائر جس طرح باقی ہیں، اس میں ان مدارس کا بنیادی رول ہے۔

محترم سامعین! لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں اسلام کی دعوت واشاعت اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ پیدا کی جانے والی غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے انگریزی زبان سے واقفیت، نیز صنعتی ترقی کی بنا پر پیدا ہونے والے وسائل، معاشی نظام میں آنے والی تبدیلی اور ذرائع

ابلاغ ومواصلات میں غیر معمولی ترقی کی وجہ سے فاصلوں کا سمٹ جانے اور دنیا کے ایک گاؤں میں تبدیل ہوجانے کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل میں احکامِ شرعیہ کی رہنمائی ،فقہ اسلامی کی تشریح وتطبیق ، نیز اسلامی عقائد وافکار کی حقانیت کے اثبات کے لئے مختلف عصری علوم کی مبادیات سے آگہی ضروری ہوگئی ہے، یہ کہنا تو درست نہیں ہوگا کہ تمام مدارسِ اسلامیہ کے نظام کو بدل دیا جائے اور ان میں بیشتر عصری علوم کو شامل کردیا جائے ؛ لیکن علماء اسلام کی ایک جماعت ایسی بھی ہونی چاہئے ، جو ضروری حد تک عصری علوم سے واقف ہو۔

المعہد العالی الاسلامی کا ۲۰۰۰ء میں جن مقاصد کے لئے قیام عمل میں آیا تھا، ان میں ایک اہم ترین مقصد یہ بھی تھا، اس سلسلہ میں دو طرفہ کوششیں کی گئیں ، اول یہ کہ مختلف اسلامی علوم میں اختصاص کے شعبے قائم کئے گئے اور ہر شعبہ میں انگریزی ، کمپیوٹر ، جغرافیہ ، تاریخ ہند ، مبادئ معاشیات اور دستورِ ہند کے بعض ابواب کو داخل نصاب کیا گیا اور انگریزی کی روزانہ ایک گھنٹی رکھی گئی ، اختصاص فی الدعوۃ کے شعبہ میں انگریزی زبان کو خصوصی اہمیت دیتے ہوئے پہلے سال روزانہ چار گھنٹی اور دوسرے سال روزانہ پانچ گھنٹیاں رکھی گئیں ؛ تاکہ اس شعبہ میں نسبتاً انگریزی زبان کی زیادہ استعداد پیدا ہو، دوسری کوشش یہ ہوئی کہ عصری تعلیم یافتہ اور عصری تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم حضرات کے لئے ''مدرسہ عبد اللہ ابن مسعود ؓ'' کا قیام عمل میں آیا ، جس میں بیشتر طلبہ وہی ہوتے ہیں ، جو عصری درسگاہوں میں زیر تعلیم ہیں ، ابھی کل ہی اس کے پانچویں بیچ نے دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی ہے، اس طرح علماء کو جدید علوم سے مانوس کرنے اور عصری تعلیم حاصل کرنے والے فضلاء کو اسلامی علوم سے آشنا کرنے کی یہ کوششیں چل رہی ہیں ۔

ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ ایک ایسی درسگاہ بھی شروع کی جائے ، جس میں توازن کے ساتھ دینی اور عصری مضامین پڑھائے جائیں اور دسویں کلاس تک عربی زبان ، ترجمہ قرآن مجید اور فقہ وحدیث کے وہ بنیادی مضامین پڑھادیئے جائیں ، جو مدارس میں ششم عربی تک پڑھائے جاتے ہیں ، دسویں کلاس کے بعد اگر کوئی طالب علم آگے تعلیم حاصل کرنا چاہے تو وہ فضیلت اور تکمیل وتخصص وغیرہ کرسکتا ہے اور عصری تعلیم حاصل کرنا چاہے تو وہ انٹر کرتے ہوئے آگے بڑھ سکتا ہے ؛ چنانچہ ''بین الاقوامی قرآن مجید سیمینار'' منعقدہ : ۶ - ۸ رفروری ۲۰۱۱ء میں اس سے متعلق تجویز بھی منظور کی گئی تھی ، ''رحمانی انٹرنیشنل اسکول'' اسی تجویز پر عمل کی کوشش ہے۔

اس ادارہ کے تین بنیادی مقاصد ہیں، اول: ایسے علماء پیدا کرنا جو انگریزی زبان اور مناسب حد تک عصری علوم سے واقف ہوں؛ تاکہ وہ نئی نسل تک دین کی امانت کو پہنچا سکیں اور کسی احساسِ کمتری کے بغیر اسلام کی ترجمانی کا فریضہ دے سکیں، دوسرے: عصری علوم کے ایسے فاضل پیدا کرنا، جو متوسطات تک اسلامی علوم حاصل کر چکے ہوں؛ تاکہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں پہنچنے کے بعد اس شعبہ سے متعلق پیدا ہونے والے مسائل کو اس کی صورت اور روح کی واقفیت کے ساتھ حل کرنے میں معاون ہو سکیں، تیسرا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے بعض شعبوں میں مسلمان بہت کم ہیں، اور جو ہیں اسلام کے بارے میں ان کی واقفیت بہت کم ہے، جیسے خاص طور پر قانون اور جرنلزم کا ذکر کیا جا سکتا ہے، لڑکوں کی صلاحیت پر نظر رکھتے ہوئے کچھ طلبہ کو ایسے شعبوں کے لئے منتخب کیا جائے اور دسویں کلاس کے بعد انھیں ان شعبوں کی طرف آگے بڑھایا جائے، اس کے لئے ان کی حوصلہ افزائی کی جائے اور وظائف کا انتظام کیا جائے، ان ہی مقاصد کے تحت اس وقت ''رحمانی انٹرنیشنل اسکول'' کا رسمی طور پر افتتاح عمل میں آرہا ہے، جس سے ان خصوصی دینی ضرورتوں کی تکمیل مقصود ہے اور مدارسِ اسلامیہ کے موجودہ نصاب کی افادیت کے اعتراف کے ساتھ ایک اور جہت میں کام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

انسان کا کام خواب دیکھنا ہے، خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنا انسان کے اختیار میں نہیں ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ سے دُعاء ہے کہ اپنے فضل خاص سے اس نئی کوشش کو کامیابی سے ہمکنار فرمائے اور وہ مقاصد پورے ہوں، جن کے لئے اس ادارہ کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے۔

واللہ ھو المستعان۔

● ● ●

غلو اور تجدد — دو فکری بے اعتدالیاں ☆

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين وعلىٰ آله وصحبه أجمعين ، ومن تبعهم باحسان إلىٰ يوم الدين ، أما بعد۔

صدر عالی قدر، ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے علماء وارباب افتاء، کیرالہ کے مختلف حصوں اور اداروں سے تشریف لانے والے اصحابِ علم اور اہل فضل! خوشی کی بات ہے کہ آسمان علم کی یہ کہکشاں آج کیرالہ کی اس تاریخی ریاست میں ضوفشاں ہے، کیرالہ ایک ایسی ریاست ہے، جس کو قدرتی حسن اور فطری جمال کا بہترین مظہر قرار دیا جاسکتا ہے، اگر اس کے ایک طرف سمندر کی مچلتی ہوئی لہریں دعوتِ نظارہ دیتی ہیں، تو دوسری جانب سبز پوش اور دراز قامت پہاڑیوں کا سلسلہ بھی ایسا پُرکیف ہے، جو انسان کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے، آدمی جس طرف سے گزر جائے، وہ اپنے آپ کو ہرے بھرے، دلکش اور خوبصورت درختوں کی بانہوں میں پاتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے ہری وردی میں ملبوس سنتری اس کے استقبال میں کھڑے ہیں :

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست !

لیکن اس جغرافیائی حسن و جمال کے علاوہ ایک اور چیز ہے، جس کی وجہ سے ہندوستان کے ہر مسلمان کو اس خطہ سے محبت ہے، ممبئی میں انگریزوں نے ’گیٹ وے آف انڈیا‘ کے نام سمندر کے کنارے ایک باب الداخلہ تعمیر کیا ہے، اگر ہندوستان میں اسلام کا باب الداخلہ اور گیٹ وے آف اسلام تعمیر کرنا ہو تو وہ یقیناً کیرالہ میں ہوگا؛ کیوں کہ یہی وہ خوش قسمت خطہ ہے، جہاں سب سے پہلے مکہ مکرمہ میں طلوع ہونے والے آفتابِ عالم تاب کی کرنیں پہنچیں اور کفر وشرک کی اس سرزمین پر یہیں سے نورِ توحید کا اُجالا پھیلا۔

☆ اسلامک فقہ اکیڈمی کے ۲۴/ویں فقہی سیمینار منعقدہ اُوچرا، کیرالہ میں یہ کلیدی خطبہ پیش کیا گیا۔

یوں تو کیرالہ (جس کو مالابار کہا جاتا تھا) سے عربوں کا تعلق اسلام سے پہلے سے رہا ہے اور عرب تجار مصالحہ اور دوسری غذائی اشیاء نہ صرف یہاں سے لے کر اپنے وطن پہنچتے تھے؛ بلکہ وہ یہ تجارتی سامان چین اور مشرق بعید تک پہنچاتے تھے؛ لیکن نبوت محمدی کے بعد بالکل ابتدائی دور میں جزیرۃ العرب اور کیرالہ کے درمیان مذہبی تعلقات کے اُستوار ہونے اور یہاں اسلام کے پہنچنے کی شہادت ملتی ہے، ایک روایت یہ بھی نقل کی جاتی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کے معجزہ شق القمر کا ظہور ہوا، تو مالابار کے ایک راجہ نے سر کی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھا اور اس کی حقیقت کو جاننے کے لئے بے چین ہوگیا، انھوں نے ماہرین نجوم کے ذریعہ اس کی حقیقت جاننی چاہی، بالآخر بعض عرب تاجروں سے ملاقات ہوئی، ان کے ذریعہ سے علم ہوا کہ سرزمین عرب میں ایک نبی کا ظہور ہوا ہے اور یہی بات اس کے اسلام قبول کرنے کا سبب بن گئی، کرشنا ایر، تاراچند اور مشہور مستشرق آرنلڈ (Arnold) نے بھی اپنی کتابوں میں عوام میں مشہور اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، اسی طرح ہمیں مشہور محدث ابوعبداللہ حاکم نیساپوری کے یہاں بھی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ملتی ہے، جو بظاہر کیرالہ ہی سے متعلق معلوم ہوتی ہے:

أهدى ملك هندى إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم جرة فيها زنجبيل فأطعم اصحابه كلامنهم قطعة وأطعمنى منها قطعة ، وقد تناول الرسول لنفسه منها۔ (مستدرک حاکم، کتاب الاطعمہ، حدیث نمبر: ۷۱۹۰)

اس راجہ کے اسلام قبول کرنے، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے، واپسی کے سفر میں واصل بحق ہونے اور موجودہ سلطنت عمان یا یمن میں اس کے مدفون ہونے کا واقعہ درست ہو یا نہ ہو؛ لیکن عرب سیاحوں کی روایات، مستشرقین اور ہندوستانی مؤرخین کے بیانات، بعض آثارِ قدیمہ اور کتبات اور کیرالہ میں ملنے والے قدیم چاندی کے سکوں کے نقوش سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ بالکل ابتدائی دور میں جو شاید رسول اللہ ﷺ کا عہد ہی ہو، اسلام کی روشنی یہاں پہنچ گئی تھی، بعض مؤرخین کے بیان کے مطابق تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں صحابی رسول حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کالی کٹ تشریف لائے، جہاں ایک مسجد ''مغدار'' کے نام سے پائی جاتی ہے، شہاب الدین احمد کویا کے بقول یہ ''مغیرہ دار'' کا مخفف ہے اور صحابی رسول کی یادگار کے طور پر

بنائی گئی ہے؛ اسی لئے کیرالہ میں بہت قدیم عہد سے عربی زبان کا سراغ ملتا ہے اور ایسے عربی کتبے ملتے ہیں، جو غیر منقوط ہیں، جس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ کتبے اس دور کے ہیں جب کہ عربی زبان میں نقطوں کی ایجاد نہیں ہوئی تھی، یعنی ۶۰ ھ سے پہلے کے۔

کیرالہ کے دامن سعادت میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ہندوستان کی پہلی مسجد یہیں کے ایک شہر ''کوڈنگلور'' میں تعمیر کی گئی، جو ''چیرامان مسجد'' کے نام سے معروف ہے، مشہور تابعی مالک ابن دینار ؒ کی ہدایت پر ان کے برادر زادہ مالک بن حبیب ؒ نے اس کی تعمیر کی، جس کی بنیاد ۲۷ رمضان المبارک ۲۱ ھ میں رکھی گئی، پھر ایک تحریک کے طور پر مالک ابن حبیب ؒ نے کیرالہ اور موجودہ کرناٹک وتمل ناڈو کے مختلف شہروں میں ایک درجن مسجدیں تعمیر کیں، غرض کہ اس ریاست ذی سعادت کو یہ شرف حاصل ہے کہ مصر وشام، یمن اور ایران وخراسان سے بھی پہلے اسلام کی روشنی یہاں پہنچی اور بالکل ابتدائی دور میں جو مسجدیں تعمیر کی گئیں، ان میں کیرالہ کی بعض مسجدیں شامل ہیں۔

ریاست کیرالہ کی علمی وفکری خدمات بھی بہت نمایاں ہیں، مولانا عبدالغفور عبداللہ قاسمی نے اپنی کتاب ''المسلمون فی کیرالا'' میں ایسی پانچ سو اہم کتابوں کا ذکر کیا ہے، جو عربی میں ہیں اور متنوع عربی اور اسلامی علوم سے متعلق ہیں، یہ حقیر تو کیرالہ کو شیخ احمد زین الدین ملے باری متوفی ۱۰۲۸ھ کی کتاب ''فتح المعین شرح قرۃ العین'' سے جانتا تھا، جو بعض عرب ملکوں کے شافعی مدارس میں داخل نصاب ہے؛ لیکن مذکورہ کتاب کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ اگر علماء کیرالہ کی علمی خدمات کو یکجا کر دیا جائے تو اس کے لئے ایک کتب خانہ کی ضرورت پڑے گی، پھر ملیالم زبان میں جو علمی کام ہوا ہے، وہ اس کے علاوہ ہے، اللہ تعالیٰ ہمیشہ اس خطہ کو دین اور علم دین کا مرکز بنائے رکھے اور پوری اُمت کے لئے اس علاقہ کو سرچشمہ فیض بنائے۔

کیرالہ کے مسلمان جو موپلا مسلمان کہلاتے تھے، وہ بڑی آزمائشوں اور ابتلاؤں سے گزرے ہیں، خاص کر پرتگالیوں کے دور میں جو مظالم ہوئے، ان کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جاسکتا اور انھیں عیسائی بنانے کی جو جابرانہ کوششیں کی گئیں، جس استقامت کے ساتھ اِس جور وظلم کا سامنا انھوں نے کیا، وہ تاریخ عزیمت کا ایک روشن باب ہے؛ لیکن بحمد اللہ کیرالہ کے مسلمانوں نے مختلف آزمائشوں سے گزرتے ہوئے ایک نئی کروٹ لی ہے اور وہ اس وقت تعلیم، معاشی حالات اور سیاسی قوت کے اعتبار سے پورے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک مثال ہیں، عصری تعلیم کے ساتھ

ساتھ دینی تعلیم کا فروغ ، دینی جامعات کی کثرت ، مکاتب کے نظام اور بالخصوص قدیم طریقہ کے مطابق مسجدوں میں ابتدائی جماعتوں سے لے کر منتہی جماعتوں تک کی تعلیم کا انتظام ایک لائق تقلید عمل ہے، نیز اسلامی حمیت اور تہذیب وثقافت میں اسلامی اقدار کی پابندی کیرالہ کے مسلمانوں کے وہ امتیازی اوصاف ہیں، جن سے تمام مسلمانوں کو خوشہ چینی کرنی چاہئے اور یہ بات انھیں اپنے آباء و اجداد اور سلف سے متوارثاً حاصل ہوئی ہے۔

حضرات ! اکیڈمی کا یہ چوبیسواں فقہی سیمینار ایک ایسے وقت میں منعقد ہو رہا ہے، جب کہ ہمارا ملک دوراہے پر کھڑا ہے ، ملک کو ایک تکثیری سماج کے بجائے یک مذہبی سماج کی طرف لے جانے کی کوشش کی جارہی ہے ، پوری قوت اس بات پر صرف کی جارہی ہے کہ یہ ملک مذاہب کا گلدستہ نہ رہے ؛ بلکہ یہ سرسوں کا کھیت بن جائے ، جو ایک ہی رنگ و روپ کی نمائندگی کرتا ہو، ان حالات میں علماء کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

مثل العالم فی الارض کمثل النجوم فی السماء یھتدی بھا فی ظلمات البر والبحر ، فإذا انطمست النجوم أوشک أن تضل الھداۃ۔ (جمع الفوائد: ۱/۱۱۲، بحوالہ مسند احمد، عن انس)

زمین میں عالم کی مثال آسمان میں ستاروں کی ہیں، جس کے ذریعہ خشکی اور تری کی تاریکیوں میں ہدایت حاصل کی جاتی ہے ، اگر ستارے ڈوب جائیں، تو اندیشہ ہے کہ راستہ چلنے والے بھٹک جائیں۔

علماء کے ہادی و رہبر ہونے کی وجہ سے علم کو عبادت پر اور عالم کو عابد پر فضیلت دی گئی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ علم میں زیادتی عبادت میں زیادتی سے بڑھ کر ہے، **"ان فضل العلم خیر من فضل العبادۃ"** (مستدرک حاکم ، کتاب العلم ، حدیث نمبر : ۳۱۷) رسول اللہ ﷺ یوں تو خدمتِ دین کے تمام شعبوں کو بنفسِ نفیس سنبھالتے تھے، آپ ﷺ داعی و مبلغ بھی تھے ، مجاہد و سپہ سالار بھی ، خطیب و واعظ بھی تھے اور مزکی و مربی بھی ، نماز کے امام بھی تھے اور مملکت اسلامی کے سربراہ بھی ، غرض کہ آپ کی ہستی جامع صفات ہستی تھی ؛ لیکن آپ کے بعد دین کے بعض شعبے تو وہ ہیں، جن کی ذمہ داری پوری اُمت پر ہے ، صرف علماء پر نہیں ، اور بعض شعبے وہ ہیں جن کی ذمہ داری اُمت کے علماء سے متعلق ہے ، ان ذمہ داریوں میں تین باتیں وہ ہیں ، جو موجودہ حالات میں خاص طور پر

قابل توجہ ہیں، اول: احکام شریعت کی تحقیق، دوسرے: داخلی فتنوں سے اسلام کی حفاظت، تیسرے: اعداء اسلام سے علمی وفکری سطح پر مقابلہ۔

شریعت کے بعض احکام وہ ہیں، جو قرآن وحدیث میں بالکل واضح ہیں، یا اجماعِ اُمت سے ثابت ہیں، ان مسائل میں اُمت کے معتبر علماء وفقہاء کے درمیان کوئی قابل ذکر اختلاف نہیں پایا جاتا اور یہ محل اجتہاد نہیں ہیں، کچھ احکام وہ ہیں، جن کے سلسلے میں بظاہر تعارض محسوس ہوتا ہے، یا قرآن وحدیث میں ان کو ایسے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، جن میں ایک سے زیادہ معنوں کی گنجائش ہے، عام طور پر ایسے ہی مسائل میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے اور یہی اجتہادی مسائل ہیں، ایسے مسائل ہر دور میں پیدا ہوتے رہیں گے، جن کے احکام صراحتاً قرآن وحدیث میں ذکر نہیں کئے گئے ہیں، یا فقہاء نے اُن کے زمانہ میں اِن مسائل کے نہ پائے جانے کی وجہ سے ان پر بحث نہیں کی ہے، ایسے مسائل کو حل کرنے کے لئے اجتہاد کی ضرورت پڑتی ہے، اجتہاد میں بنیادی طور پر تین کام کئے جاتے ہیں :

(۱) تحقیق دلیل۔ (۲) تخریج علل۔ (۳) تطبیق علل۔

'تحقیق دلیل' سے مراد یہ ہے کہ جن احادیث یا آثارِ صحابہ سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے، وہ روایت ودرایت کے اعتبار سے قابل قبول ہے یا نہیں؟ نصوص میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، ان کی دلالت ایک ہی معنی پر متعین اور یقینی ہے یا اس میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال ہے؟ محدثین وفقہاء نے نصوص کی تحقیق وتنقید کا کام اس طور پر کر دیا ہے کہ اب حقیقت یہ ہے کہ اس پر کسی نئی محنت کی ضرورت باقی نہیں رہی، اب اگر کوئی شخص ازسرنو اس کام کو کرتا ہے تو وہ اپنا وقت اور اپنی صلاحیت کو ضائع کرتا ہے۔

دوسرا کام 'تخریج علل' کا ہے، قرآن وحدیث کے جو احکام تعبدی نہیں ہیں اور جن میں حکم کی علت کو خود شارع کی طرف سے واضح نہیں فرمایا گیا ہے، اہل علم کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان احکام کی علتیں دریافت کریں اور ان مصالح ومفاسد کو متعین کریں، جن کی وجہ سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے یہ حکم دیا ہے؛ کیوں کہ بقول شیخ الاسلام عزالدین ابن عبدالسلام ؒ شریعت کا کوئی حکم خلافِ مصلحت نہیں ہوسکتا، اللہ جزائے خیر عطا فرمائے ائمہ متبوعین اور فقہاء مجتہدین (رحمہم اللہ) کو، کہ انھوں نے ایسی دقتِ نظر کے ساتھ نصوص شرعیہ کی علتوں کا استنباط واستخراج کیا ہے، کہ بظاہر اس پر اضافہ ممکن نہیں ہے۔

تیسرا کام 'تطبیق علل' کا ہے، یعنی ائمہ مجتہدین اور سلف صالحین نے جن علل کا استنباط کیا ہے، ہر دور میں پیدا ہونے والے نئے واقعات و مسائل پر ان کو منطبق کیا جائے اور اس کی روشنی میں حکم شرعی کی تعیین کی جائے، اسی کو بعض فقہاء نے "تخریج مسائل" اور بعض نے "تحقیق مناط" سے تعبیر کیا ہے، علامہ شاطبی ؒ کے بقول اجتہاد کی یہ صورت قیامت تک باقی رہے گی؛ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد سے تقلید کو عمومی طور پر قبول کرنے کے باوجود کبھی یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوا کہ جو نئے مسائل ہیں، وہ کس طرح حل ہوں اور وہ کیوں کر حل کئے جائیں؟

اللہ کا شکر ہے کہ احکام شریعت کا یہ کام ہر دور میں علماء کرتے رہے ہیں، آج کا یہ اجلاس بھی اسی کی ایک اجتماعی کوشش ہے، اسلامک فقہ اکیڈمی کا بنیادی مقصد ہی یہی ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق عصر حاضر میں جو نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں، اجتماعی کاوش کے ذریعہ ان کا حل دریافت کیا جائے، اس وقت عالم اسلام میں بھی اس سلسلے کی کاوشیں جاری ہیں اور بعض مسلم اقلیت ممالک میں بھی، اس سے جہاں نئے مسائل کو حل کرنے میں مدد مل رہی ہے، وہیں یہ اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ شریعت اسلامی ایک زندہ جاوید اور فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ قانون ہے، جو توازن واعتدال، مصلحت و ضرورت کی رعایت اور اخلاقی اقدار کے تحفظ کے ساتھ ہر دور اور ہر عہد میں رہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہے۔

محترم حضرات ! علماء سے متعلق دوسری اہم ذمہ داری داخلی فتنوں سے اسلام کی حفاظت ہے، یہ بنیادی طور پر دو قسم کے ہیں، ایک: غلو، دوسرے: تجدد — غلو سے مراد یہ ہے کہ دین کے کسی حکم کی اہمیت اس کے حقیقی درجہ سے بڑھا دی جائے اور اس کے مطابق فیصلے کئے جائیں، اس وقت پوری دنیا میں مسلمانوں کے درمیان باہم تکفیر کا فتنہ اپنی انتہا پر ہے، کئی گروہ ایسے ہیں، جو اپنے مخالف کو یا تو کافر سمجھتے ہیں یا حد درجہ ضال و مضل، یہاں تک کہ جن لوگوں کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ وہ راہِ اعتدال پر قائم ہیں، اب ردعمل میں ان کے قدم بھی ڈگمگانے لگے ہیں اور ان میں بھی غلو اور بے اعتدالی جنم لے رہی ہے؛ حالاں کہ انسان کے اعتدال کا امتحان اسی وقت ہوتا ہے، جب فریق مقابل بے اعتدالی سے کام لیتا ہو۔

اس غلو نے اس وقت عالم اسلام کو تباہی و بربادی کے ایسے مقام پر پہنچا دیا ہے کہ غالباً کبھی مسلمانوں پر اتنا برا وقت نہیں آیا تھا، مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل، مسلم حکومتوں کے خلاف

مسلح جدوجہد، دین وشریعت کی حامی منتخب حکومت کے خلاف بغاوت، علماء و مذہبی پیشواؤں کا بے دردانہ قتل، جمہوری ممالک میں پرتشدد احتجاج اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینا، شرائط جہاد کے نہ پائے جانے کے باوجود قتل و غارت گری اور اس فساد کو جہاد کا نام دینا، یا پُرامن جدوجہد اور حکومت وقت پر تعمیری تنقید کو بھی فساد فی الارض اور محاربہ کہنا، یہ سب غلو کے مظاہر ہیں، اور جو لوگ اس کا ارتکاب کررہے ہیں، وہ دانستہ یا نادانستہ اعداء اسلام کے آلۂ کار ہیں، خوارج کو صحابہ اور سلف صالحین نے فرقِ باطلہ میں سب سے زیادہ قابل مذمت سمجھا، یہاں تک کہ ان کے خلاف فوجی کارروائی بھی کی گئی، وہ اسی غلو کی وجہ سے، اور ایسا نہیں ہے کہ خوارج حضرت علی ﷺ کے دور میں پیدا ہوئے اور ختم ہوگئے؛ بلکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں خوارج پیدا ہوتے رہیں گے، یہاں تک کہ دجال کا خروج ہوجائے؛ (ابن ماجہ، عن عبداللہ ابن عمر، باب فی ذکر الخوارج، حدیث نمبر: ۱۷۴) چنانچہ متعدد اہل علم نے قیامت سے پہلے کی علامتوں میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ دجال کے خروج سے پہلے بھی خوارج ظاہر ہوں گے۔

دوسرا فتنہ تجدد کا ہے 'تجدید' کے معنی دین میں شامل کردیئے جانے والے حشو و زوائد کو دُور کرنے کے ہیں اور 'تجدد' دین وشریعت میں معنوی تحریف وتصحیف کی ایک شکل ہے، یعنی عقل کا پرستار بن کر، اتباع نفس کا شکار ہوکر، اعداء اسلام کی باتوں سے مرعوب و متاثر ہوکر، یا حکومت وقت کے دباؤ کا اثر قبول کرکے شریعت کے مفاہیم میں تبدیلیاں پیدا کرنا، یہ ایک طرح کا نفاق ہے، جس کے حاملین اُمت کی صفوں میں ہمیشہ موجود رہے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب ﷫ نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جن باطل گروہوں کا رد ہے، جس کو وہ 'جدل' کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، وہ تمام گروہ کسی نہ کسی شکل میں قیامت تک پائے جائیں گے؛ کیوں کہ قرآن کریم کا پیغام ابدی ہے، قرآن مجید میں ان مضامین کو خاص طور پر ذکر کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اسلام اور مسلمان ہر دور میں ایسی مذموم سازشوں کا ہدف بنتے رہیں گے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شریعت کے بعض وہ احکام جن پر اجماع ہے، جن کا ثبوت واضح نصوص سے ہے، ان کا بھی انکار کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اس انکار کی بنیاد کوئی معتبر دلیل شرعی نہیں ہے؛ بلکہ مغرب سے مرعوبیت ہے، جیسے رجم کا انکار، سبّ رسول کی سزا کا انکار، تجارتی اور غیر تجارتی سود میں فرق کرنا، مخلوط تعلیم کو جائز قرار دینا، رضاعت کبیر کو باعث حرمت ٹھہرانا، یا صوفی اسلام،

ماڈریٹ اسلام اور لبرل اسلام وغیرہ کی اصطلاحیں، اللہ کا شکر ہے کہ عام مسلمان اپنے ایمان ویقین کی وجہ سے اس فتنہ سے محفوظ ہیں؛ لیکن جدید تعلیم یافتہ لوگ اور مغربی درسگاہوں کے پروردہ دانشور اس سے بہت جلد متاثر ہوتے ہیں، کمیونسٹ اقتدار کے عروج کے دور میں اشتراکیت اور ترقی پسندی کا جو طوفان آیا تھا، اس نے یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے مسلمان اساتذہ وطلبہ کو بہ کثرت اپنا شکار بنالیا تھا؛ لیکن کمیونزم اپنی جائے پیدائش ہی میں صرف ۷۰ سال میں پیوند خاک ہوگیا اور اس طرح الحاد کے اس مصنوعی پرندہ کے بال و پر بکھر گئے؛ لیکن اب دوبارہ الحاد وانحراف کا یہ حملہ پوری قوت کے ساتھ مغرب کی طرف سے ہو رہا ہے، اس کو قوت پہنچانے کے لئے تعلیمی وتحقیقی اداروں کے ساتھ ساتھ میڈیا بھی شب وروز سرگرم عمل ہے، اور خاص کر جن اہل علم نے اپنی تعلیمی زندگی کا ایک حصہ مغرب میں گزارا ہے، بہت جلد اور بہت زیادہ اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔

علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ دین کی درست تعبیر وتشریح کو اُمت تک پہنچائیں، عقل وفطرت کی ترازو پر تول کر اسلام کی حقیقی تعلیمات ان کو سمجھائیں، غلو اور تجدد کے اس فتنہ سے اُمت کی حفاظت کریں؛ کیوں کہ الفاظ وکلمات کے اعتبار سے قرآن مجید میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی، رسول اللہ ﷺ کی احادیث کا ریکارڈ اتنی مضبوطی کے ساتھ مرتب ہو چکا ہے کہ اس میں بھی اب لفظی تحریف کی گنجائش نہیں رہی؛ لیکن معنوی تحریف کی ناکام کوششیں ہوتی رہی ہیں اور اب بھی جاری ہیں، خواہ اس کا قبول کرنے والا اُمت کا ایک چھوٹا سا گروہ ہی کیوں نہ ہو، ان فتنوں سے اُمت کی حفاظت ہی اصل میں اس عہد کا تجدیدی کام ہے، جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر نسل میں ایسے لوگ آتے رہیں گے، جو کار تجدید کو انجام دیا کریں گے، خواہ ایک دو افراد ہوں یا پوری جماعت، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

یحمل هذا العلم من کل خلف عدوله ، ینفون عنه تحریف الغالین و انتحال المبطلین ، و تأویل الجاهلین ۔ (مسند بزار، عن ابی ہریرہ وعبداللہ بن عمر: ۱/۸۶، حدیث نمبر: ۱۴۳)

ہر پشت میں سے معتبر و دین دار لوگ اس علم کے حامل ہوں گے، جو غلو کرنے والوں کی تحریف، باطل پرستوں کی خود رائی اور جاہلوں کی غلط تشریح وتوضیح سے اسلام کو پاک کریں گے۔

بزرگانِ محترم ! تیسرا اہم کام اسلام کا دفاع اور اعداء اسلام کا مقابلہ ہے، مسلمانوں اور اسلام دشمنوں کا ایک میدان کارزار وہ ہے، جو اس وقت مغربی قوتوں نے پورے عالم میں جنگ کی صورت میں برپا کر رکھا ہے، ایک میدان سیاست واقتدار کا ہے، مسلم ممالک میں بھی یہ جنگ برپا ہے اور غیر مسلم ممالک میں بھی اسلاموفوبیا کی چنگاری کو آتش فشاں بنانے کی کوشش کی جارہی ہے، خود ہمارے اس ملک میں جہاں صدیوں سے مسلمان اور غیر مسلم دو بھائیوں کی طرح زندگی گزارتے رہے ہیں، فرقہ پرست عناصر گاؤں گاؤں نفرت کی آگ سلگانے میں مصروف ہیں، جنگ کا ایک میدان معیشت ہے، چاندی اور سونے کی کرنسی کو ختم کرکے کاغذی کرنسی کو رواج دے کر اور ورلڈ بینک کی تشکیل کرکے صہیونی اور ان کے آلۂ کار کے طور پر صلیبی طاقتوں نے پوری دنیا کی دولت کو اپنے قابو میں کرلیا ہے، اس صورت حال سے صرف مسلمان ہی دوچار نہیں ہیں؛ بلکہ تمام ترقی پذیر ممالک اس کا شکار ہیں؛ لیکن ملتِ اسلامیہ اس کا خاص نشانہ ہے؛ لیکن ایک جنگ ان تمام جنگوں سے بڑھ کر ہے اور اس کا نقصان دوسری تمام جنگوں کے نقصان سے کہیں زیادہ ہے، اور وہ ہے فکر ونظر کی جنگ۔

اسلام کی اصل طاقت اس کی معنویت، عقل وفطرت سے ہم آہنگی، دل ودماغ کو مسخر کرنے کی صلاحیت، ہر دور کے مسائل کو حل کرنے کی اہلیت اور بے سکون انسانیت کو روحانی سکون سے بہرور کرنے کی غیر معمولی استعداد ہے، اسلام کی سب سے بڑی طاقت یہی ہے: ''**لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ، وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ**'' (الصّف:۹،۸) میں غالباً تمام ادیان پر اسلام کے غالب ہونے سے یہی استدلالی غلبہ مراد ہے نہ کہ مادی غلبہ، یہ غلبہ اسلام کو کل بھی حاصل تھا، آج بھی حاصل ہے اور ہمیشہ حاصل رہے گا، مسلمان شکست کھا سکتے ہیں؛ لیکن اسلام شکست نہیں کھا سکتا۔

اسلام دشمن طاقتوں نے اس حقیقت کو محسوس کرلیا ہے اور انھیں احساس ہے کہ ہزار ابتلاؤں اور آزمائشوں کے باوجود مسلمانوں کا اپنے دین اور اپنے پیغمبر سے عشق اسلام کی اسی معنوی طاقت کا نتیجہ ہے؛ اس لئے اب پوری قوت کے ساتھ اسلام پر فکری یلغار کی جارہی ہے، پہلے ایسی باتیں کتاب کے دفینوں میں ہوتی تھیں؛ لیکن اب میڈیا کے ذریعہ ہر کچے اور پکے گھر میں پہنچائی جارہی ہیں، یہودی ونصرانی طاقتیں تو صدیوں سے اس کو اپنا مشن بنائے ہوئی ہیں اور اس کو صلیبی جنگوں کا حصہ سمجھتی ہیں؛ لیکن اب ہندوستان کے فرقہ پرست سیاسی اور مذہبی قائدین بھی پوری طرح اس میں شامل ہوگئے ہیں، اسلام کے تصور جہاد کو شدت پسندی اور دہشت گردی کی اساس قرار دیا جارہا ہے،

آیاتِ جہاد کو چن چن کر غیر مسلم بھائیوں کو سنایا جاتا ہے، غزوات کے واقعات کو غلط انداز میں پیش کیا جاتا ہے، اسلام کے منصفانہ عائلی قوانین کو عورت مخالف اور ظالمانہ کہا جاتا ہے، پردہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ فرسودگی کی علامت ہے اور مغلوں کی زیادتیوں کی وجہ سے ہندوستان میں پردہ کا رواج ہوا ہے، سوشل میڈیا میں رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور اُمہات المومنین کی مبارک زندگیوں کو مسخ کر کے پیش کیا جارہا ہے، کہا جاتا ہے کہ اسلام میں مذہبی رواداری کا کوئی پہلو نہیں ہے، اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو جانوروں کے ساتھ بے رحمی سکھاتا ہے، اسلام کی اشاعت اس کی تعلیمات کی بنیاد پر نہیں ہوئی ہے؛ بلکہ تلوار کے زور پر ہوئی ہے، ہندوستان کے مسلم عہد کی تاریخ پر جھوٹے اعتراضات کئے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جو مسلم فرماں روا عدل وانصاف اور مذہبی رواداری کا نمونہ تھے اور جن کا خود ہندو مؤرخین نے اعتراف کیا ہے، ان کو بھی ظالم وجابر قرار دیا جارہا ہے، غرض کہ کتنے ہی پروپیگنڈے ہیں، جو پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا، سوشل میڈیا، کتابوں اور تقریروں کے ذریعہ پھیلائے جارہے ہیں اور نفرت وغلط فہمی کے پودوں کو تناور درخت بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

جب ایسے اعتراضات کا علم اور دلیل کے ساتھ جواب نہیں دیا جاتا تو عام مسلمان جذباتی ردعمل کا اظہار کرتے ہیں، ان کا جواب نہ موافق کو مطمئن کر پاتا ہے اور نہ مخالف کو؛ لیکن جو لوگ مسلمانوں کے خلاف سازشیں کررہے ہیں کہ ان کو تنہا کردیا جائے، ان کو اس سے خوب فائدہ پہنچتا ہے اور انھیں کہنے کا موقع ملتا ہے کہ اس قوم کی فطرت میں تشدد ہے اور چوں کہ ان کا دامن دلیل وبرہان سے خالی ہے؛ اسی لئے یہ مشتعل ہوجاتے ہیں، اس لئے علماء کا فریضہ ہے کہ وہ صورت حال کی اس سنگینی کو محسوس کریں اور داخلی اختلافات میں اپنی انرجی صرف کرنے کی بجائے اس یلغار کا مقابلہ کریں، علم اور دلیل کی قوت کے ساتھ سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے اس کا رد کریں، یہ دراصل جہاد باللسان ہے، علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

واما جهاد الكفار والمنافقين فمراتبه أربعة : بالقلب ، واللسان ، والمال ، والنفس ۔ (زادالمعاد: ۳/۱۱)

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے کلمۂ حق کو بھی جہاد قرار دیا: ''**افضل الجهاد كلمة الحق عند السلطان الجائر**'' (ابوداود، باب الامر والنہی، حدیث نمبر: ۴۳۴۶) ہندوستان میں ہمارے اکابر علماء حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ، حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری رحمہ اللہ، حضرت مولانا رحمت اللہ

کیرانوی ؒ، علامہ شبلی نعمانی ؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ، علامہ سید سلیمان ندوی ؒ، علامہ سید انور شاہ کشمیری ؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ اور کتنے ہی علماء ہیں، جنھوں نے مدارس اور خانقاہوں کی چٹائیوں پر بیٹھ کر پوری یکسوئی کے ساتھ اس فریضہ کو انجام دیا ہے اور اسلام کے دفاع کا حق ادا کیا ہے، آج پھر صورت حال علماء کو متوجہ کر رہی ہے کہ دفاع عن الاسلام کی سنت صدیقی کو وہ پوری قوت کے ساتھ انجام دیں اور اس کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں۔

حضرات ! اس وقت ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ فرقہ پرست طاقتیں مسلمانوں کو تنہا کر دینا چاہتی ہیں، اکثریت کو اس بات کا یقین دلایا جا رہا ہے کہ مسلمان تمہارے سخت دشمن ہیں، یہ صرف مجبوری کی وجہ سے اپنا ہاتھ روکے ہوئے ہیں، ورنہ ان کو ذرا بھی غلبہ حاصل ہو جائے تو یہ غیر مسلموں کو معاف نہیں کریں گے، ان حالات میں علماء کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ برادرانِ وطن سے اپنے تعلقات کو استوار کریں اور اسلام میں رواداری کا جو تصور ہے، اس کو واضح کریں۔

اہم بات یہ ہے کہ اگر چہ اسلام کی نظر میں دین حق ایک ہی ہے اور وہ اسلام ہے، جس کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور جس کی تکمیل خاتم النبیین محمد عربی ﷺ پر ہوئی؛ لیکن جو قومیں ہدایت سے دُور ہیں اور انھوں نے الگ الگ مذہب ایجاد کر لئے ہیں، اگر چہ وہ باطل ادیان ہیں؛ لیکن اسلام دنیا کے نظام کے لحاظ سے ان کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بات مقدر نہیں ہے کہ تمام لوگ اسی مذہبِ حقانی اور شریعت ربانی کے پیرو ہو جائیں، اس لئے اگر کچھ قومیں اسلام قبول نہ کریں تو یہ چنداں عجیب نہیں؛ چنانچہ ارشاد ہے :

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا۔ (المائدۃ:۴۸)

اس کے مقابلہ میں ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے، ہم نے تم میں سے ہر ایک (اُمت) کے لئے ایک خاص دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے، اور اگر اللہ چاہتے تو تم سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتے؛ لیکن (ایسا نہیں کیا) تاکہ تم کو ان احکام کے بارے میں آزمائیں جو تم کو دیتے رہے ہیں؛ لہٰذا نیکیوں میں پہل کرو، تم سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے :

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ، اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۔ (ہود:۱۱۸،۱۱۹)

اور اگر آپ کے رب چاہتے تو تمام لوگ ایک ہی راستہ اختیار کر لیتے اور (لیکن) وہ ہمیشہ اختلاف ہی کرتے رہیں گے ، سوائے ان لوگوں کے جن پر آپ کے پروردگار نے مہربانی فرمائی اور اسی (اختلاف باقی رہنے ہی) کے لئے تو ان کو پیدا کیا ہے۔

جب اسلام میں دوسرے مذاہب کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے ، تو مسلمانوں کے لئے ایک تکثیری معاشرہ میں زندگی گذارنے میں کوئی دشواری نہیں ہے ، دشواری ان لوگوں کو ہوتی ہے ، جو اپنے سوا دوسروں کے وجود کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں ، جیسا کہ بعض فرقہ پرست گروہوں کا نقطۂ نظر ہے۔

ایک تکثیری معاشرہ میں مسلمانوں کا کیا رویہ ہونا چاہئے ؟ قرآن مجید اور اُسوۂ نبوی اس کو اچھی طرح واضح کرتا ہے ، اہل مکہ نے آپ ﷺ کے سامنے مصالحت کے دو فارمولے رکھے ، ایک یہ کہ ہم بھی آپ کے خدا کی عبادت کریں اور اس کے بدلہ میں آپ ہماری دیویوں اور دیوتاؤں کی پوجا کریں ، دوسرا فارمولہ یہ تھا کہ دن متعین کرلیں ، ایک دن دونوں فریق آپ کے خدا کی عبادت کریں اور ایک دن دونوں فریق مل کر بتوں کی پوجا کریں ، ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں کسی مسلمان کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتیں ؛ کیوں کہ جیسے روشنی اور تاریکی جمع نہیں ہوسکتی اور دن و رات کا اِکٹھا ہونا ممکن نہیں ہے ، اسی طرح توحید اور شرک کے عقیدہ کو جمع نہیں کیا جاسکتا ؛ چنانچہ قرآن مجید نے صلح کا ایک تیسرا فارمولہ پیش کیا کہ اگر تم کو ہمارے لائے ہوئے دین پر اطمینان نہیں ہے تو ہم تم سے کوئی تعرض نہیں کرتے ہیں اور جن لوگوں نے اس دین حق کو قبول کیا ہے ، تم بھی ان سے تعرض نہ کرو ، ہم دونوں اپنے اپنے طریقہ عبادت اور دین پر رہتے ہوئے ایک سماج میں خوشگواری کے ساتھ زندگی گذاریں :

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ، لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ، وَ لَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ، وَ لَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ، وَ لَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ، لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَ لِيَ دِيْنِ ۔ (کافرون:۱-۶)

تو کہہ اے منکرو ! میں نہیں پوجتا جس کو تم پوجتے ہو ، اور تم پوجو جس کو

میں پوجوں، اور نہ مجھ کو پوجنا ہے اس کا جس کو تم نے پوجا، اور نہ تم کو
پوجنا ہے اس کا جس کو میں پوجوں، تم کو تمہاری راہ اور مجھ کو میری راہ۔

جب آپ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں مسلمان بھی تھے، یہودیوں کے بھی تین قبیلے تھے اور اوس وخزرج میں بچے کھچے مشرکین بھی تھے، آپ ﷺ نے وہاں پہنچ کر سب سے پہلے دو کام کئے، ایک: مسلمانوں کے درمیان مواخات، دوسرے: مسلم وغیر مسلم قبائل کے درمیان میثاق امن —— آپ ﷺ نے ایک ایسا دستاویز معاہدہ مرتب فرمایا، جس کے مطابق تمام لوگوں کو اپنے اپنے مذہب پر عمل کی آزادی دی گئی، یہاں تک کہ یہودیوں کی قومی عدالت بھی قائم رکھی گئی، یہودیوں کے بعض مقدمات جب رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں آئے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق فیصلہ کرلیں، اسی طرح ان کے تعلیم وتعلم کے نظام میں بھی کوئی دخل نہیں دیا گیا، یہاں تک کہ یہودیوں کی خواہش پر آپ ﷺ نے ان کی درسگاہ کا معائنہ بھی فرمایا اور جب تک یہودی قبائل کی طرف سے غدر اور دھوکہ دہی کے واقعات پیش نہیں آئے، آپ ﷺ نے اس معاہدہ کو باقی رکھا۔

اس سلسلہ میں ہمیں صحابہ کا اُسوہ بھی ملتا ہے، جو عہد نبوی ہی کا ہے، اور وہ ہے ''حبشہ کا واقعہ'' مسلمانوں نے حبش کی طرف ہجرت کی اور وہاں امن وامان کو برقرار رکھتے ہوئے اور مقامی قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنے ہم وطن عیسائی بھائیوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھے، اگرچہ میثاق مدینہ کی طرح وہاں باضابطہ کوئی معاہدہ نہیں ہوا؛ لیکن عملاً یہ ایک معاہدہ کی شکل ہی تھی، جس پر دونوں مذہب کے ماننے والے قائم تھے۔

ہندوستان میں ہمارا فریضہ ہے کہ کثیر مذہبی سماج میں زندگی گذارنے سے متعلق جو اسلامی تعلیمات ہیں، ان کو مسلمانوں اور غیر مسلم بھائیوں کے سامنے نمایاں کیا جائے، جس کی بنیاد دو باتوں پر ہو، ایک: اپنے مذہبی وملی تشخصات کی حفاظت اور اسلام پر استقامت، دوسرے: برادرانِ وطن کے ساتھ حسنِ اخلاق، رواداری اور خوشگوار تعلقات۔

ہندوستان میں ہمارے بزرگوں نے ہمیشہ اس کا لحاظ رکھا، جنگ آزادی میں شروع سے اخیر تک ہندو اور مسلمان شانہ بشانہ رہے اور انھوں نے بھائی بھائی کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کیا، سید احمد شہید رحمہ اللہ نے اپنی تحریک میں جہاں مسلمان فرماں رواؤں کو خطوط لکھے، وہیں ہندو راجاؤں کو

بھی خط لکھا اور ان کی طرف سے اس خط کی پذیرائی ہوئی، جلاوطن ہندوستانی حکومت کے قائم کرنے میں ہندو اور مسلمان رہنما برابر کے شریک تھے، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کا گاندھی جی سے قریبی تعلق تھا، جواہر لال نہرو اور اس عہد کے ہندو قائدین سے مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا سید ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے قریبی تعلقات تھے، اگر علماء کا اس وقت کے ہندو مذہبی اور سیاسی قائدین سے قریبی ربط وتعلق نہ ہوتا تو ملک کے دستور میں فرقہ پرست عناصر آج جو تبدیلی چاہتے ہیں، وہ بات ۱۹۴۷ء میں ہی ہوچکی ہوتی؛ اس لئے ضرورت ہے کہ علماء اور دینی مدارس برادرانِ وطن سے تعلقات کو استوار کرنے میں اپنا کردار ادا کریں، انصاف قائم کرنے اور ظلم کو روکنے کے سلسلہ میں انصاف پسند سیکولر، غیر مسلم بھائیوں کا تعاون حاصل کریں، نیز مشترک انسانی مسائل پر مسلمانوں اور غیر مسلموں کو یکجا کریں، جیسا کہ قرآن مجید نے اہل کتاب کو دعوت دی ہے :

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔ (آل عمران: ۶۴)

آپ کہہ دیجئے : اے اہل کتاب ! ایک ایسی بات کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے ؛ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں گے، نہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرائیں گے اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے گا۔

اگر ہم نے انصاف پسند اور سیکولر ذہن غیر مسلم بھائیوں کو قریب کرنے کی سنجیدہ اور سرگرم کوشش نہیں کی تو ہمارے دشمن اپنے مقاصد پورا کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے اور مسلمانوں کو ان کی تمام تر قربانیوں کے باوجود تنہا کر دیا جائے گا۔

حضرات ! اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا سے آپ حضرات بخوبی واقف ہیں، جو نئے شرکاء ہیں، ان کے لئے تعارفی لٹریچر پیش کر دیا گیا ہے، یہ صرف ایک ادارہ نہیں ہے ؛ بلکہ ایک تحریک ہے، جس کا مقصد علماء کو اس بات پر آمادہ کرنا ہے کہ فقہ اسلامی اور فکر اسلامی کی دنیا میں جو خلا پیدا ہو رہا ہے، ہم سب مل کر اسے پورا کریں، مسائل فقہیہ پر غور وفکر کے لئے منعقد ہونے والا سیمینار تو اس کا بنیادی

پروگرام ہے؛ لیکن اکیڈمی وقت کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے بہت سے فکری مسائل پر بھی اجتماعات منعقد کرتی ہے، اسی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے یہ چند معروضات پیش کی گئی ہیں، یہ اکیڈمی کا چوبیسواں فقہی سیمینار ہے۔

اکیڈمی کے اس سیمینار کی میزبانی کے لئے ممتاز نوجوان فاضل جناب مولانا عبد الشکور صاحب قاسمی زید مجدہٗ نے محبت وخلوص کے ساتھ بہ اصرار دعوت دی اور اب آپ حضرات کے لئے دل اور آنکھیں بچھائے ہوئے ہیں، جامعہ اسلامیہ اوچرا کے قیام پر زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے؛ لیکن بحمد اللہ یہ نوخیز دینی درسگاہ تیزی سے ترقی کی طرف گامزن ہے، ذمہ دارانِ مدرسہ، اساتذہ اور طلبہ کا پرخلوص رویہ اور انتھک سعی وکوشش کا جذبہ اس کے روشن مستقبل کا پتہ دیتا ہے، گذشتہ سیمیناروں کی طرح یہ سیمینار بھی نہایت اہم مسائل پر منعقد ہو رہا ہے، جس کا وضاحتی لٹریچر آپ حضرات کو مل چکا ہے، اُمید ہے کہ ان مسائل کے بارے میں آپ کے فیصلے اُمت کے لئے مشعل راہ بنیں گے۔

دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ گزشتہ سیمیناروں کی طرح اسے بھی کامیابی سے ہمکنار فرمائے اور ایسے فیصلوں کی توفیق بخشے جس میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہو :

ربنا تقبل منا إنک أنت السمیع العلیم ،
وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین ۔

●●●

علماء اُمت کی ذمہ داریاں ☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلىٰ آله وصحبه ومن تبعهم بإحسان إلىٰ يوم الدين۔

صدر محترم اور دنیا بھر سے آئے ہوئے علماء کرام! اس حقیر کو پہلی بار ''**الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین**'' کے اجلاس میں شرکت کا موقعہ مل رہا ہے، اور اس کو میں اپنی بہت بڑی سعادت اور خوش بختی تصور کرتا ہوں، واقعہ ہے کہ علماء کا مقام بھی بہت بلند ہے اور اسی نسبت سے ان کی ذمہ داریاں بھی بہت اہم ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ زمین میں علماء کی مثال ایسی ہی ہے، جیسے آسمان میں ستارے :

إن مثل العلماء في الأرض كمثل النجوم فى السماء يهتدى بها فى ظلمات البر والبحر ، فإذا انطمست النجوم ، أوشک أن تضل الهداة ۔ (۱)

اس حدیث میں علماء کو ستاروں سے تشبیہ دی گئی ہے، اگر ہم وجہ شبہ کو سمجھنے کے لئے قرآن مجید کی طرف رُجوع کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ستاروں کے تین بنیادی کام ہیں: پہلا کام یہ ہے کہ وہ آسمان دنیا کے لئے زینت و آرائش کا ذریعہ ہیں: ''**وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ**'' (فصلت:۱۲) دوسرا کام یہ ہے کہ ستارے رات کی تاریکی اور سمندر کی اتھاہ تنہائی میں لوگوں کے لئے رہنمائی کا ذریعہ بنتے ہیں: ''**وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ**'' (النحل:۱۶)، تیسرے: یہ شیطان کے لئے کوڑے ہیں، جو انھیں آسمان کی طرف بڑھنے سے روکتے ہیں: ''**رُجُوماً لِلشَّيَاطِينِ**'' ۔(الملک:۵)

اگر اس تشبیہ کے پس منظر میں غور کیا جائے تو علماء کی تین ذمہ داریاں قرار پاتی ہیں: اول یہ کہ

☆ ''الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین'' کا ایک اہم اجلاس استنبول (ترکی) میں منعقد ہوا تھا، یہ اس خطبہ کا اُردو ترجمہ ہے۔

(۱) المسند الجامع: ۱۴۸/۴، حدیث نمبر: ۱۲۱۶، مسند احمد: ۱۵۷/۳، حدیث نمبر: ۱۲۶۲۷۔

وہ اپنے اخلاق وکردار کے اعتبار سے ایسی اعلیٰ سطح پر ہوں کہ اُمت کے لئے زینت قرار پائیں، ان کے اندر داعیانہ مزاج اور پیغمبرانہ اخلاق ہوں؛ تاکہ اُمت ان کے گرد جمع ہو سکے، دوسرے: وہ اُمت کے لئے رہنما اور مقتدیٰ ہوں، وہ احکام شریعت کی رہنمائی کریں اور اُمت کو ایمان، اعمال اور اخلاق کے فساد سے بچائیں، تیسرے: وہ اُمت کو ان فکری انحرافات اور تہذیبی اور عملی بے راہ روی سے بچائیں، جو دراصل شیطان کی طرف سے ہے اور جس کو دنیا میں شیطانی طاقتیں قوت پہنچاتی ہیں۔

اس وقت ان تینوں پہلوؤں کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے، علماء اخلاقی پہلو سے اس قدر گر گئے ہیں کہ حکومتیں ان سے اپنے منشاء کے مطابق فتاویٰ حاصل کرتی ہیں، دنیا کے معمولی مفادات کے بدلہ وہ اپنے آپ کو فروخت کرنے کو تیار رہتے ہیں، امام ابوحنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور علامہ ابن تیمیہؒ جیسے سلف صالحین نے اپنے اپنے زمانہ میں جو کردار پیش کیا، آج ان کی حیثیت قصہ پارینہ کی ہو کر رہ گئی ہے، اسی طرح علماء کے ایک بڑے گروہ نے اپنی داعیانہ حیثیت کو فراموش کر دیا ہے، اُمت کی رہنمائی، ان کی اصلاح اور انسانیت کو دین حق کی طرف دعوت دینے کے فریضہ کی طرف ان کی توجہ بہت کم ہوگئی ہے، ان کی زندگی اس طرح گذرتی ہے کہ گویا وہ جامعات اور اداروں کے ملازم ہیں، حالاں کہ وارث انبیاء ہونے کی حیثیت سے اصل میں وہ خدا کے ملازم تھے اور: ''**إِنْ أَجْرِيَ إِلاَّ عَلَى اللهِ**'' (یونس: ۷۲) ان کا امتیاز تھا — اسی طرح آج پوری دنیا میں مسلمانوں کو اخلاقی اقدار سے دور کرنے، ایمانی حمیت سے محروم کرنے، مغربی افکار کا اسیر بنانے اور مغربی تہذیب کو مسلط کرنے کا جو ایجنڈہ نئے عالمی نظام اور گلوبلائزیشن کے نام پر پوری دنیا میں جاری وساری ہے، پوری جرأت اور حوصلہ مندی کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنا علماء کا فریضہ ہے اور اس سلسلہ میں عالم اسلام کے علماء کی ذمہ داری زیادہ ہے؛ مگر ہم یہ کہنے کے موقف میں نہیں ہیں کہ علماء واقعی اس فریضہ کو انجام دے رہے ہیں — اس لئے ان تینوں محاذوں پر کام کرنے اور نئے عزم وحوصلہ کے ساتھ آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔

محترم حضرات! میں اس موقع سے تین اہم نکات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں:

۱- سلف صالحین اور علماء سابقین کے کام کرنے کے دو طریقے ہوتے تھے: ایک طریقہ مسلم حکومتوں کے غلط اقدامات پر مقاومت کا تھا، جسے رسول اللہ ﷺ نے جہاد قرار دیا ہے: ''**إن أفضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر**'' (مسند أحمد عن أبي سعيد الخدري، حدیث نمبر: ۱۱۷۶۱۰۷) دوسرا طریقہ مسامحت کا ہے، مسامحت سے میری مراد یہ ہے کہ حکمرانوں سے کہا جائے کہ تخت اقتدار پر آپ ہی متمکن رہیں، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں؛ لیکن آپ اسلامی مقدسات، اسلامی اقدار

اور مسلمانوں کے مفادات کے محافظ بنیں، ہم آپ کے حریف و رقیب نہیں ہیں، ہم آپ کے رفیق اور مؤید ہیں، اس طرح اُن سے اعلاءِ کلمۃ اللہ کا کام لیا جائے، جیسا کہ امام مالکؒ اور امام ابو یوسفؒ نے عباسی دور میں کیا، حالات کے پس منظر میں یہ دوسری صورت زیادہ بہتر ہے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا :

كيف أنتم وأئمة من بعدي يستأثرون بهذا الفيئ ، قلت : إذن والذي بعثك بالحق ، أضع سيفي على عاتقي ، ثم أضرب به حتى ألقاك أو ألحقك ، قال : أولا أدلك على خير من ذلك ، تصبر حتى تلقاني ۔(۱)

نیز وائل حضرمیؓ سے مروی ہے :

سأل سلمة بن يزيد الجعفي رسول الله صلى الله عليه وسلم ، فقال : يا نبي الله ! أرأيت إن قامت علينا أمراء يسألونا حقهم ويمنعونا حقنا فما تأمرنا ؟ فأعرض عنه ، ثم سأله فأعرض عنه ، ثم سأله في الثانية أو في الثالثة ، فجذبه الأشعث بن قيس ، وقال : اسمعوا وأطيعوا فإنما عليهم ما حملوا وعليكم ما حملتم ۔(۲)

یہ وہی طریقہ ہے جس کی آپ ﷺ نے تلقین فرمائی، سیدنا حضرت حسن ابن علی رضی اللہ عنہما کا خلافت کے مسئلہ میں صلح کو ترجیح دینا بھی اسی نوعیت کا واقعہ ہے؛ کیوں کہ مقاومت کی صورت میں ناحق مسلمانوں کی خونریزی ہوتی ہے اور اعداءِ اسلام کو اس بات کا موقع مل جاتا ہے کہ وہ اُمت کے ناپختہ ذہن نوجوانوں کو اپنا آلۂ کار بنائیں اور انھیں اسلام کو بدنام کرنے کا ذریعہ بنائیں: ''**الاتحاد العالمی**'' کو اس بات کی کوشش کرنا چاہئے کہ وہ خود بھی اس طریقۂ کار کو فروغ دے اور دوسرے مسلمانوں کی بھی ان ہی خطوط پر ذہن سازی کرے۔

۲- دوسری ضروری بات یہ ہے کہ یوں تو اُمت میں اختلاف کے بہت سے اسباب ہیں؛ لیکن مذہبی اختلاف کی خرابی بہت گہری ہوتی ہیں اور نفرت کے جذبات کو اُبھارنے میں بڑا اہم کردار

(۱) **سنن أبي داود، باب في قتل الخوارج،** حدیث نمبر: ۴۱۳۲۔

(۲) **مسلم، باب في طاعة الأمراء،** حدیث نمبر: ۳۴۳۳۔

ادا کرتی ہیں، اس اختلاف کا منبع علماء ہیں، یہ تو ممکن نہیں کہ فکری اختلاف ختم ہوجائے اور تمام مکاتب فکر ایک دوسرے میں ضم ہوجائیں، فقہی مسالک کا تنوع باقی نہ رہے؛ لیکن دو باتیں ممکن ہیں: ایک یہ کہ ہم اختلاف کے باوجود اتحاد کا سبق سیکھیں، مشترک ایجنڈے پر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھنے کو تیار رہوں اور اُمت کے مشترک مسائل کو مل جل کر حل کریں، قرآن مجید نے تو اہل کتاب کو بھی مشترک مسائل پر اتحاد کی دعوت دی ہے: ''**قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ**'' (آلِ عمران: ٦٤) تو کیا مسلمانوں کے درمیان مشترک مسائل پر اتحاد نہیں ہوسکتا؟ دوسرے: اختلاف رائے کے اظہار میں احتیاط سے کام لیں اور ایک دوسرے کے احترام کو ملحوظ رکھیں، ہم سلف صالحین کے یہاں دیکھتے ہیں کہ اہل سنت کا خوارج اور معتزلہ سے سخت اختلاف رہا؛ لیکن اس کے باوجود ان کی تکفیر کرنے سے احتیاط برتی گئی؛ لیکن اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہر گروہ دوسرے گروہ کی تکفیر پر کمر بستہ ہے اور انھیں اپنے ہی مختلف الفکر مسلمان بھائیوں سے بمقابلہ غیر مسلموں کے زیادہ نفرت ہے''**الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین**'' کو چاہئے کہ اس کا ایک وفد مختلف ممالک کا دورہ کرے، وہاں مختلف مسلک ومشرب کے علماء اور قائدین کو جمع کرے، ان کے لئے اس ملک کے لحاظ سے مشترک ایجنڈہ مرتب کرے اور انھیں اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ اختلاف رائے کے اظہار میں احتیاط سے کام لیں، اگر علماء کے درمیان اختلاف کی خلیج کم ہوجائے تو اُمت میں خود بخود اختلاف کم ہوجائے گا۔

۳- تیسری ضروری بات یہ ہے کہ علماء کو یہ بات سمجھائی جائے کہ وہ اُمت کے مختلف فرقوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات پر توجہ دینے کی بجائے اعداء اسلام، صہیونی وصلیبی میڈیا اور مستشرقین کی طرف سے اُٹھائے جانے والے سوالات پر توجہ دیں اور کتاب وسنت نیز سلف صالحین کے علمی ورثہ سے استفادہ کرتے ہوئے اسلام کے خلاف پیدا کئے جانے والے شبہات کا نہ صرف بھرپور دفاع کریں؛ بلکہ استشراق کے مقابلہ استغراب کے فن کو وجود میں لائیں، یہودیت، عیسائیت، مغربی افکار، مغربی تہذیب اور مغربی تاریخ کا ناقدانہ مطالعہ کیا جائے اور جدید علمی اُسلوب میں ان کی خامیوں اور کوتاہیوں کو پیش کیا جائے، اس کے لئے اسلامی جامعات میں مستقل شعبہ قائم ہو، نیز اس کام کو اتنی قوت کے ساتھ انجام دیا جائے کہ عالم اسلام اقدامی پوزیشن میں آجائے اور عالم غرب کو دفاعی موقف اختیار کرنا پڑے، یہ اس دور میں اسلام کی حقیقی خدمت ہوگی اور اس طرح علماء اپنے فریضۂ منصبی کو ادا کرسکیں گے۔

میں تنظیم کے سربراہوں کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے ہمیں اس اہم پروگرام میں شرکت کا موقع فراہم کیا، خدا کرے کہ ہمارا یہ جمع ہونا اُمت کی سرفرازی وسربلندی کا ذریعہ بنے۔

واللہ الموفق وهو المستعان ، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔

● ● ●

مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کو قریب کرنے میں علماء کا کردار ☆

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وأصحابه أجمعين ۔

حضرات ! اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا کے موجودہ حالات کے پس منظر میں مذاہب اسلامیہ کے دوران مکالمہ — تا کہ ان کے درمیان قربت اور ایک دوسرے کے تئیں تحمل پیدا ہو — نیز کلمۂ توحید کی بنیاد پر ان کو متحد کرنے کی کوشش وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے؛ بلکہ ایسی کاوشیں اس عہد میں جہاد کا درجہ رکھتی ہیں۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں کے باہمی فاصلوں کو پاٹنے ،مختلف فرقوں کے درمیان ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے اور عامۃ المسلمین کو باہمی جدال یہاں تک کہ خون ریزی سے بچانے کے سلسلہ میں علماء اور مذہبی قائدین نہایت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں اور اس کی اہمیت اس لئے ہے کہ علماء جس بصیرت اور نصح ومحبت کے جذبہ کے ساتھ اُمت کی بے غرض رہنمائی کر سکتے ہیں ،کوئی اور گروہ نہیں کر سکتا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سی کوتاہیوں کے باوجود آج بھی مسلمانوں کے دلوں میں اپنے علماء کی آراء اور فیصلوں کی جو قدر و قیمت ہے، کسی اور گروہ کی ہدایات کو وہ درجہ حاصل نہیں ،عموماً مسلمان دل کی آمادگی کے ساتھ بہت کم کسی اور گروہ کی بات کو قبول کرتے ہیں۔

اس پس منظر میں اس وقت علماء کو اُمت کی صحیح رہنمائی میں افراط وتفریط سے بچتے ہوئے معتدل راستہ اختیار کرنا نہایت ہی ضروری ہے، علماء اُمت کو جوڑنے کے سلسلے میں کن پہلوؤں پر توجہ دیں، اس سلسلہ میں چند اہم نکات پیش ہیں :

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ ایمان بہت بڑی نعمت ہے، اس سے چوں کہ دنیا و آخرت کی فلاح ونجات متعلق ہے، اس لئے خدا نے ایمان لانے کو ایک آسان عمل بنایا ہے، کوئی بھی شخص جو اللہ تعالیٰ کی توحید، رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور آخرت پر یقین کا اظہار کرے، وہ اسلام کے دائرہ میں آ گیا،

☆ یہ ''حوار بین المذاهب الاسلامیہ'' کے نام سے منعقد ہونے والی دوحہ کانفرنس : ۲۰-۳۰ / جنوری ۲۰۰۶ میں پیش کئے گئے خطبہ کا اُردو ترجمہ ہے۔

جیسے ہی اس نے زبان سے توحید و رسالت کی شہادت دی، اس پر مسلمانوں کے احکام جاری ہوں گے، یہاں تک کہ اس کے دل میں جو کچھ ہے، اسے کھرچ کر دیکھنے کا بھی ہمیں حق نہیں ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الإیمان أن تؤمن بالله و ملائکته و بلقائه و برسله وتؤمن بالبعث۔ (۱)

ایمان یہ ہے کہ (تم) اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، (روز قیامت) اس کے دیدار پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔

اسی طرح حضرت عبادہ ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من شهد أن لا إله إلا الله وحده لا شریک له ، وأن محمداً عبده ورسوله ، وأن عیسیٰ عبد الله ورسوله وکلمته ألقاها إلی مریم وروح منه ، والجنة حق والنار حق ، أدخله الله الجنة علی ماکان من العمل۔ (۲)

جو شخص اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ایک اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور اس کا کلمہ ہیں جسے اللہ نے مریم پر نازل کیا، اس کی روح ہیں، جنت حق ہے اور جہنم حق ہے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ جنت میں داخل کرے گا، خواہ اس کے اعمال کیسے ہی ہوں۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں کچھ لوگ منافق تھے، جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے، بہ باطن وہ مسلمان نہیں تھے، حضور ﷺ نے ان کے ساتھ مسلمانوں ہی کا سا معاملہ فرمایا، آپ ﷺ کو من جانب اللہ ان کے اسماء بتادیئے گئے تھے، اس کے باوجود آپ ﷺ نے عام صحابہ کرام ؓ پر اس کو آشکارا نہیں فرمایا؛ تاکہ کہیں لوگ ان کے ساتھ کلمہ گو ہونے کے باوجود ایسا برتاؤ نہ کرنے لگیں جو کسی مسلمان کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا۔

---

(۱) بخاری، باب سوال جبرئیل النبی صلی اللہ علیہ وسلم، عن الایمان والاسلام والاحسان وعلم الساعۃ، حدیث نمبر: ۳۷۔

(۲) بخاری: ۱/ ۲-۴، کتاب احادیث الانبیاء۔

ایمان لانا جتنا آسان ہے اور مسلمان ہونے کا حکم لگانا جتنا سادہ اور سہل ہے، کسی شخص کو دائرۂ ایمان سے باہر قرار دینا اسی قدر نازک بات ہے اور اس میں نہایت احتیاط برتنے کا حکم ہے، جب تک کہ کسی شخص کے کفر کا یقین نہ ہو جائے، اس پر کافر ہونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب کوئی شخص مسلمان کو کافر کہتا ہے تو یہ کفر اسی کی طرف لوٹ کر آجاتا ہے''۔

عن عبد الله بن دينار أنه سمع ابن عمر يقول : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم أيما امرئ قال لأخيه : كافر ، فقد باء بها أحدهما ، إن كان كما قال وإلا رجعت عليه ۔ (مسلم، کتاب الایمان، باب بیان حال الایمان، حدیث نمبر:۲۱۶)

حضرت عبداللہ بن دینار کہتے ہیں کہ انھوں نے حضرت ابن عمر کو کہتے ہوئے سنا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے بھی اپنے بھائی کو کافر کہا تو ایسی صورت میں دو میں سے ایک بات ہوگی یا تو وہ شخص واقعتا کافر ہوگا اور اگر ایسا نہیں ہے تو یہ بددُعا خود اس کی طرف لوٹ جائے گی۔

اسی مضمون کی ایک روایت حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے :

ومن دعا رجلا بالكفر أو قال : عدو الله ، وليس كذلك إلا عاد عليه ۔ (مسلم، کتاب الایمان، حدیث نمبر:۲۱۷)

اگر کسی نے کسی کو کافر کہہ دیا اسے اللہ کا دشمن کہا؛ حالاں کہ وہ ایسا نہیں تھا تو اس کا وبال خود اس پر آئے گا۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ :

إن النبي صلى الله عليه وسلم قال : إذا أكفر الرجل أخاه فقد باء بها أحدهما ۔ (مسلم، کتاب الایمان، حدیث نمبر:۲۱۵)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اگر کوئی شخص اپنے بھائی کو کافر کہتا ہے تو ایسی صورت میں ان دونوں میں سے کوئی ایک اس کو لے کر لوٹے گا۔

اسی لئے فقہاء نے تکفیر کے سلسلہ میں بڑی احتیاط کا حکم دیا ہے؛ چنانچہ معروف حنفی فقیہ علامہ ابن

عابدین شامیؒ فرماتے ہیں :

وینبغي أن یلحق بالضرورة أیضاً ما قدمناه من أنه لا یفتی بکفر مسلم في کفره اختلاف ولو روایة ضعیفة ۔(۱)

یہاں پر وہ بات بھی ذکر کرنی چاہئے جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ کسی ایسے مسلمان کے کفر کے سلسلہ میں فتویٰ نہیں دیا جاسکتا جس کے کفر کے بارے میں اختلاف ہو، اگرچہ اختلاف کے سلسلہ میں روایت کمزور ہی کیوں نہ ہو۔

اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ کا ایک دلچسپ واقعہ بھی قابل ذکر ہے، جسے علامہ ابن نجیم مصریؒ نے نقل کیا ہے :

وسئل الإمام عمن قال : لا أرجو الجنة ، ولا أخاف الله تعالیٰ ، وآکل المیتة ، وأصلي بلا قراء ة وبلا رکوع وسجود ، وأشهد بما لم أره ، وأبغض الحق ، وأحب الفتنة ، فقال أصحابه : أمر هذا الرجل مشکل ، فقال الإمام : هذا الرجل یرجو الله لا الجنة ، ویخاف الله لا النار ، ولا یخاف الظلم من الله تعالیٰ فی عذابه ، ویأکل السمک والجراد ، یصلی علی الجنازة ، ویشهد بالتوحید ، یبغض الموت وهو حق ، ویحب المال والولد وهو فتنة ، فقام السائل وقبل رأسه ، وقال : أشهد أنک للعلم وعاء ۔(۲)

امام ابوحنیفہؒ سے اس شخص کے سلسلہ میں سوال کیا گیا جو یہ کہتا ہے کہ میں نہ ہی جنت کی تمنا کرتا ہوں، نہ ہی جہنم سے ڈرتا ہوں اور نہ ہی خدا کا خوف رکھتا ہوں، میں مردار کھاتا ہوں، میں بغیر قراءت، رکوع اور سجدہ کے نماز پڑھتا ہوں، جو چیزیں میں نے دیکھی نہیں ہیں اس کے

(۱) رسم المفتی: ۱۹۰، مطبوعہ مکتبہ زکریا، دیوبند۔

(۲) الاشباہ والنظائر مع الحموی: ۸/ ۶۸ ۳، باب الفن السابع، الحکایات والمرسلات۔

بارے میں بھی گواہی دیتا ہوں، حق سے گریز کرتا ہوں، فتنہ کو پسند کرتا ہوں، امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں نے کہا کہ اس شخص کا معاملہ تو بڑا ہی مشکل و پیچیدہ ہے؟ امام صاحبؒ نے فرمایا: یہ شخص اللہ کی تمنا رکھتا ہے؛ لیکن جنت کی نہیں، یہ اللہ سے ڈرتا ہے؛ لیکن جہنم سے نہیں، وہ اس بات سے خائف نہیں رہتا کہ اللہ اسے عذاب دینے میں ظلم کرے گا، وہ مچھلی اور ٹڈی کھاتا ہے، وہ جنازہ کی نماز پڑھتا ہے، وہ اللہ کی وحدانیت کی گواہی دیتا ہے، وہ موت کو ناپسند کرتا ہے؛ حالاں کہ وہ حق ہے، وہ مال و اولاد سے محبت رکھتا ہے اور یہ فتنہ ہے، یہ سن کر سوال کرنے والا کھڑا ہو گیا اور اس نے امام صاحبؒ کے پیشانی کو بوسہ دیا اور کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ علم کے سمندر ہیں۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کلمہ شہادتین کے پڑھنے سے انسان اسلام کے دائرہ میں آتا ہے اور عملی زندگی میں اس کے مسلمان ہونے کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھے، کعبۃ اللہ کو قبلہ تسلیم کرے اور مسلمانوں کا ذبیحہ حلال سمجھے؛ چنانچہ حضرت انس ﷺ نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے:

من صلى صلا تنا ، واستقبل قبلتنا ، وأكل ذبيحتنا فذلک المسلم الذى له ذمة الله وذمة رسوله فلا تخفرو الله فى ذمته ۔ (بخاری، کتاب الصلاۃ، باب فضل استقبال القبلۃ، حدیث نمبر: ۳۹۱)

جس کسی نے ہماری طرح نماز پڑھی، ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کیا، ہمارے ذبیحہ کو کھایا تو یہ ایسا شخص مسلمان ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے اپنے ذمہ میں لے لیا ہے؛ لہٰذا تم لوگ اللہ کو اس کے ذمہ کے سلسلہ میں بدعہد نہ کرو۔

خود حضرت انس ﷺ نے ایک صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

من شهد أن لا إله إلا الله واستقبل قبلتنا ، صلى صلا تنا ، وأكل ذبيحتنا ، فهو المسلم ، له ما للمسلم وعليه ما على المسلم ۔ (بخاری، کتاب الصلاۃ، باب فضل استقبال القبلۃ، حدیث نمبر: ۳۹۳)

جو شخص اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ،
ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کرتا ہے، ہماری طرح نماز پڑھتا ہے تو وہ
مسلمان ہے،اس کے لئے وہ حقوق ہیں جو دیگر مسلمانوں کے لئے ہیں
اور اس پر وہ فرائض عائد ہوں گے جو دیگر مسلمانوں کے لئے ہیں
اوراس پر وہ فرائض عائد ہوں گے جو دیگر مسلمانوں پر عائد ہوتے ہیں۔

اسی حدیث کو بنیاد بنا کر امام عبدالوہاب شعرانی نے اپنی معروف کتاب ''الیواقیت والجواہر'' میں فرقِ ضالہ پر گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے :

لا يكفر أحد من المذاهب الإسلامية لأن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال : من صلى صلا تنا واستقبل قبلتنا ، وأكل ذبيحتنا فله ما لنا وعليه ما علينا ۔(۱)

کسی بھی اسلامی مسلک کی تکفیر نہیں کی جاسکتی ؛ کیوں کہ نبی کریم ﷺ کا
ارشاد ہے: ''جو ہماری طرح نماز پڑھے ، ہمارے قبلہ کی طرف رُخ
کرے، ہمارے ذبیحہ کو کھائے تو اس کے وہ حقوق ہوں گے جو ہمارے
ہیں اوراس پر وہ فرائض عائد ہوں گے جو ہم پر عائد ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ صحابہ کرام ﷺ کے اخیر دور میں ہی ان مختلف فرقوں کا ظہور ہو چکا تھا، جن کو راہِ حق سے منحرف سمجھا گیا؛لیکن صحابہ نے ان کو کافر کہنے میں یا ان پر کفر کا حکم لگانے میں احتیاط سے کام لیا،سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد میں خوارج کا ظہور ہوا، یہ اس عہد کے صحابہ کے ان دونوں گروہوں کی تکفیر کرتے تھے جو حضرت علی ﷺ کے ساتھ تھے، یا ان کے مخالف تھے ؛لیکن حضرت علی ﷺ نے ان پر کفر کا حکم لگانے میں احتیاط برتی ؛البتہ فرمایا کہ اگر وہ فساد مچائیں گے تو ہم ان سے جہاد کریں گے، پھر آپ ﷺ نے ان سے جہاد فرمایا اور جہاد میں فتح یاب بھی ہوئے ؛ لیکن مفتوحین اور ان کے اموال کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کیا جو غیر مسلموں کے ساتھ کیا جاتا ہے، یعنی آپ نے ان کی خواتین کو باندی اور ان کے مال کو مالِ غنیمت کا درجہ نہیں دیا۔

بعد کے فقہاء کے یہاں بھی اس کی مثال ملتی ہیں، اہل سنت والجماعت ،معتزلہ اور مرجیہ کے

(۱) الیواقیت والجواہر:۲/ ۱۲۵،مبحث:۵۸۔

درمیان بڑی کشمکش رہی ، اس کشمکش نے بعض اوقات ارباب اقتدار کو بھی متاثر کیا اور حکومت کے سہارے فریق مخالف کو تکلیف پہنچانے کی کوششیں بھی کی گئیں ؛ لیکن معتزلہ اور مرجیہ کو صریحاً کافر کہنے سے احتیاط برتی گئی ، اسی طرح خود اہل سنت میں اشاعرہ ، ماتریدیہ اور حنابلہ کے درمیان سخت اعتقادی اختلافات رہے اور اس کا اثر رجال سے متعلق محدثین کی آراء پر بھی پڑا ؛ لیکن ایک دوسرے کی تکفیر سے ہر ایک نے اجتناب کیا ، اسی طرح اہل تشیع کے بارے میں فقہاء متقدمین کا عام نقطۂ نظر یہی رہا کہ جو لوگ تحریفِ قرآن کے قائل نہیں ہیں ان کی تکفیر نہیں کی جائے گی ؛ چنانچہ امام عبدالوہاب شعرانی نے معتزلہ ، نجاریہ ، روافض اور مشبہہ وغیرہ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ سب مسلمان ہیں ، ان پر کفر کا حکم نہیں لگایا جاسکتا ، اس سلسلہ میں انھوں نے شیخ ابوطاہر قزوینی کے حوالہ سے کہا ہے کہ :

هم من أهل الإجابة بلا شك ، فمن سماهم كفرة فقد ظلم وتعدى ۔ (الیواقیت والجواہر : ۲/۱۲۵، مبحث : ۵۸)

ان لوگوں کا شمار ''اہل الاجابۃ'' (ماننے والوں) میں ہوتا ہے ؛ لہٰذا اگر کوئی ان لوگوں کو کافر کہتا ہے تو وہ زیادتی کرتا ہے ۔

علامہ ابن حزم ظاہری نقل کرتے ہیں :

... وذهب طائفة إلى أنه لا يكفر ولا يفسق مسلم بقول قاله في اعتقاد أو فتيا ، وإن كل من اجتهد في شيئ من ذلك فدان بما رأى أنه الحق ، فإنه ماجور على كل حال ، إن أصاب فأجران وإن أخطأ فأجر واحد ، قال : وهذا قول ابن أبي ليلى وأبي حنيفة والشافعي وسفيان الثوري وداود بن علي ، وهو قول كل من عرفنا له قولان في هذه المسألة من الصحابة رضي الله عنهم لا نعلم منهم خلافاً في ذلك اصلاً ۔ (الملل والنحل : ۳/۳۹۱، مع تحقیق : د، ابراہیم نصر)

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ کسی بھی مسلمان کو اس کے کسی قول یا فتویٰ کے سبب کافر یا فاسق قرار نہیں دیا جاسکتا ، ہر وہ شخص جو کسی مسئلہ میں اجتہاد کرتا ہے اور پھر وہ جس بات کو حق اور درست سمجھتا ہے اسی کو اختیار کرلیتا ہے تو اسے بہر حال اجر ملے گا ، اگر اس نے صحیح اجتہاد کیا تو اسے

دو اجر ملیں گے اور اگر اجتہاد کرنے میں اس سے غلطی ہوگئی تو ایک اجر ملے گا، وہ کہتے ہیں کہ یہ ابن ابی لیلیٰ، ابوحنیفہؒ، شافعیؒ، سفیان ثوریؒ اور داؤد بن علی کا قول ہے، جن صحابہ کرام ؓ سے بھی اس مسئلہ میں دو اقوال مروی ہیں ان کا بھی یہی قول ہے، ہمیں اس مسئلہ میں ان میں سے کسی کے اختلاف کا بھی علم نہیں۔

امام ابوالحسن اشعری کے بارے میں منقول ہے کہ انھوں نے اپنی وفات کے وقت کہا :

أشهدوا على أنني لا أكفر أحداً من أهل القبلة بذنب ، لاني رأيتهم كلهم يشيرون إلى معبود واحد والاسلام يشملهم ويعمهم ۔ (الیواقیت للشعرانی: ۲/۱۲۶، مبحث: ۵۸)

تم سب میرے بارے میں گواہ رہنا کہ میں کسی بھی اہل قبلہ کو کسی گناہ کے سبب کافر قرار نہیں دیتا؛ کیوں کہ میں نے ان تمام ہی لوگوں کو ایک ہی معبود کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھا ہے، یہ سب ہی دین اسلام کے متبع ہیں۔

امام شافعیؒ کا قول منقول ہے :

لا أكفر أهل التأويل المخالف للظاهر بذنب ۔ (۱)

میں تاویل کرنے والے کو جو ظاہر کی مخالفت کرتا ہے کسی گناہ کے سبب کافر قرار نہیں دیتا۔

اسی طرح شوافع قریب قریب اس بات پر متفق ہیں کہ خوارج کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔(۲)

علامہ ابن عابدین شامیؒ خوارج کے بارے میں رقمطراز ہیں :

وحكم الخوارج عند الجمهور وأهل الحديث حكم البغاة ... وذهب بعض أهل الحديث إلى كفره ... قال ابن المنذر : ولا أعلم أحداً وافق أهل الحديث على

---

(۱) **الیواقیت للشعرانی**: ۲/۱۲۶، مبحث: ۵۸۔

(۲) دیکھیے: **الصواعق المحرقة**: ۱۵۲، **لابن الحجر الهيتمي**۔

تکفیرهم ، قال : وهذا یقتضی نقل إجماع الفقهاء علی عدم تکفیر الخوارج ، وقد ذکر فی المحیط ان بعض الفقهاء لا یکفر أحداً من أهل البدع ، بعضهم یکفر من خالف منهم ببدعته دلیلا قطعیاً ونسبه إلی أکثر أهل السنة ، والنقل الأول أثبت ، نعم ، یقع فی کلام أهل المذهب تکفیر کثیر ؛ لکن لیس من کلام الفقهاء الذین هم المجتهدون بل من غیرهم ، ولا عبرة بغیر الفقهاء ، والمنقول عن المجتهدین ما ذکرنا ، وابن المنذر أعرف بنقل المجتهدین ۔ (ردالمحتار:۶/۴۱۳)

جمہور علماء اور محدثین خوارج کو باغیوں کے حکم میں شامل کرتے ہیں ......بعض محدثین نے تو انھیں کافر گردانا ہے......ابن المنذر کہتے ہیں مجھے نہیں معلوم کہ کسی نے بھی خوارج کی تکفیر کے سلسلہ میں محدثین کی رائے سے موافقت کی ہو، وہ کہتے ہیں اس کا تقاضہ ہے کہ خوارج کی عدم تکفیر پر فقہاء کا اجماع نقل کیا جائے ،محیط میں یہ بات مذکور ہے کہ بعض فقہاء کسی بھی بدعتی کو کافر قرار نہیں دیتے ہیں؛ البتہ بعض فقہاء ایسے بدعتیوں کو کافر قرار دیتے ہیں جو کسی دلیل قطعی کی مخالفت کرتے ہیں، صاحب محیط نے اس قول کو اکثر محدثین کی طرف منسوب کیا ہے، پہلی بات جو نقل کی گئی ہے وہ زیادہ صحیح ہے، ہاں اہل مذہب کی تحریروں میں تکفیر بہت پائی جاتی ہے؛ لیکن فقہاء (جو کہ مجتہد ہوتے ہیں) کی تحریروں میں ایسی چیز نہیں پائی جاتی اور فقہاء کے بغیر کسی چیز کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا، مجتہدین سے وہ بات منقول ہے جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں، ابن المنذر مجتہدین کی منقولات سے اچھی طرح سے واقف ہیں۔

انبیاء کرام کے بعد سب سے قدسی صفت گروہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ہے، جن کے ذریعہ پوری دنیا میں اسلام کی روشنی پہنچی اور جو براہ راست رسول اللہ ﷺ کی تربیت سے فیض یاب ہوئے؛ لیکن اس کے باوجود تکفیر کے معاملہ میں علماء اس درجہ محتاط رہے ہیں کہ علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ

سبِّ صحابہ کے مرتکب ہونے والے پر بھی کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جائے گا؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

یحکم فیه قاطعاً باسلام من یتاول فی سب الصحابة مصرحاً بأن القول بتکفیر المتأولین بذلک مخالف لإجماع مناقض لما فی متونهم وشروحهم ، وإن ماوقع فی کلام أهل المذهب من تکفیرهم لیس من کلام الفقهاء الذین هم المجتهدون ، بل من غیرهم ، قال : ولا عبرة بغیر الفقهاء والمنقول عن الفقهاء ما ذکرناه ۔ (ردالمحتار: ۳/ ۲۹۳)

جو شخص سبِّ صحابہ کا مرتکب ہوتا ہے اس پر بھی اسلام کا ہی حکم لگایا جائے گا، سبِّ صحابہ کے مرتکب شخص کی تکفیر کا قول اجماعِ صحابہ کے مخالف اور ان کی متون وشروح کے مغائر ہے، اہل مذہب نے ایسے لوگوں کو کافر قرار دیا ہے؛ لیکن یہ فقہاء (جو کہ مجتہد ہوتے ہیں) کا قول نہیں ہے ؛ بلکہ دیگر لوگوں کا ہے، فقہاء کے علاہ کا اعتبار نہیں ہے اور فقہاء سے وہ بات منقول ہے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

اسی طرح علامہ شامیؒ شرح منیۃ المصلی کے حوالہ سے فرماتے ہیں :

إن ساب الشیخین ومنکر خلافتهما ممن بناه علی شبهة له یکفر ، بخلاف من ادعی أن علیاً إله وأن جبریل غلط ، لأن ذلک لیس من شبهة واستفراغ وسع فی الاجتهاد بل محض هوی ۔ (ردالمحتار: ۶/ ۴۱۳)

شیخین (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ) کو سبّ وشتم کرنے والا اور ان کی خلافت کا انکار کرنے والا چوں کہ ایک شبہ کی بنیاد پر ایسا کرتا ہے؛ لہٰذا اس کو کافر نہیں قرار دیا جائے گا؛ البتہ اگر کوئی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ الٰہ ہیں، حضرت جبرئیل علیہ السلام سے غلطی ہو گئی تھی تو ایسے شخص کو کافر قرار دیا جائے گا؛ کیوں کہ یہ بات شبہ کی بنیاد پر نہیں کہی جا سکتی اور نہ ہی اس مسئلہ میں اجتہاد کرنے کی

گنجائش ہے، تو یہ محض اپنی خواہش نفس کی اتباع ہے۔

اسی کی نظیر ہمیں خود عہد صحابہ میں بھی ملتی ہے؛ چنانچہ قاضی عیاض نے کتاب الشفا کے پہلے باب کی چوتھی قسم میں نقل کیا ہے :

إن رجلا سبّ أبا بكر بمحضر منه ، فقال له أبوبرزة الأسلمی : يا خليفة رسول الله ! دعنی اضرب عنقه ، فقال : اجلس ليس ذلک لأحد إلا لرسول الله صلى الله عليه وسلم . (الشفاء للقاضی عیاض: ۴۹۱/۲-۴۹۲)

ایک شخص نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ان کی موجودگی میں سبّ وشتم کیا تو ان سے حضرت ابو برزہ الاسلمی نے کہا، اے خلیفۂ رسول! مجھے اجازت دیں کہ میں اس کی گردن اڑا دوں، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا بیٹھ جاؤ، یہ حق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔

اسی طرح روایت کیا گیا ہے کہ :

إن عامل عمر بن عبد العزيز بالكوفة استشاره فی قتل رجل سب عمر ، فكتب إليه : لا يحل قتل أمرء مسلم بسب أحد من الناس إلا رجلا سبّ رسول الله صلى الله عليه وسلم ، فمن سبه فقد حل دمه . (حوالۂ سابق)

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی جانب سے کوفہ میں مقرر کردہ گورنر نے ان سے ایک ایسے شخص کو قتل کرنے کے سلسلہ میں مشورہ کیا جس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو گالی دی تھی، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے انھیں لکھ بھیجا کہ کسی بھی مسلمان کو اس وجہ سے قتل کرنا کہ اس نے کسی شخص کو سبّ وشتم کیا ہے، درست نہیں ہے؛ الا یہ کہ کوئی شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سبّ وشتم کرے، اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اس کا خون حلال ہو جاتا ہے۔

فقہاء نے یہ بات بھی لکھی ہے کہ جس بات کے کفر ہونے پر اتفاق نہ ہو، اس کی بنیاد پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جا سکتا ہے؛ چنانچہ علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں :

واعلم أنه لا يفتی بكفر مسلم أمكن حمل كلامه علی

محمل حسن ، أو كان في كفره خلاف ولو كان ذلك رواية ضعيفة ۔ (درمختار مع الرد: ۴؍۲۲۴)

یہ بات جان لیں کہ ایسے مسلمان کو کافر قرار دینا درست نہیں ہے جس کی گفتگو کو کوئی اچھا مفہوم دیا جاسکتا ہے یا اس کی گفتگو ایسی ہو جس کے کفر ہونے میں اختلاف ہو؛ اگرچہ اس سلسلہ میں کوئی ضعیف روایت ہی کیوں نہ ہو۔

موجودہ دور میں علماء کی توجہ دعوتِ اسلام کی طرف سے تو ہٹ گئی اور مسلمان بنانے کا جو فریضہ ان پر عائد ہوا تھا، اس سے تو انھوں نے منھ موڑ لیا؛ لیکن مسلمانوں کو کافر کہنے میں وہ بہت تیز دست ہو گئے، اہل سنت اور اہل تشیع نے ایک دوسرے کو کافر کہا، بعض مقلدین نے سلفی حضرات پر کفر کا فتویٰ لگایا اور سلفی حضرات نے مقلدین کو —— جو اُمت کا سوادِ اعظم ہیں —— مشرک قرار دیا، ہندوستان میں یہی صورت حال دیوبندیوں اور بریلویوں کے درمیان پیش آئی ، یہاں تک کہ مختلف مسلم تنظیمیں جو دعوت واصلاح کے لئے اُٹھی تھیں، وہ بھی ایک دوسرے کو گمراہ کہنے پر کمر بستہ ہیں۔

علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ مخالف نقطۂ نظر کے حاملین پر کفر کا حکم لگانے سے احتراز کریں اور جب تک کہ کسی گروہ کے بارے میں یہ بات ثابت نہ ہوجائے کہ وہ قطعیات دین اور ضروریاتِ دین کے منکر ہیں، اس وقت تک تکفیر سے پوری طرح گریز کریں؛ کیوں کہ مسلمان یا کافر سمجھنے کا تعلق صرف زبان کے بول سے ہی نہیں ہے؛ بلکہ برتاؤ اور سلوک سے بھی ہے اور برادرانہ برتاؤ اور سلوک کے ذریعہ ہی تعلقات استوار ہوتے ہیں اور رواداری کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔

(۲) دوسری اہم بات یہ ہے کہ شریعت نے کچھ اختیارات ''اولی الامر'' سے متعلق کئے ہیں، جیسے جہاد 'اولی الامر' کے حکم سے ہوگا، قصاص 'اولی الامر' کے حکم سے نافذ کیا جائے گا، حدود 'اولی الامر' کے حکم سے جاری کی جائیں گی، ان اُمور کو لوگ اپنے طور پر انجام نہیں دے سکتے؛ چنانچہ عہد صحابہ میں بھی اور اس کے بعد بھی ہمیشہ یہ اُمور امراء وسلاطین کے واسطہ سے انجام پاتے رہے ہیں، یہاں تک کہ بعض فقہاء نے تو جمعہ وعیدین کے قیام کو بھی 'اذن سلطان' سے متعلق کیا ہے، مسلمانوں کو یہ بات سمجھانے کی ہے کہ عام مسلمان ایسے مسائل کو اپنے ہاتھ میں نہ لیں، جو 'اولی الامر' کے لئے خاص ہیں، مسلم ممالک میں وہاں کی حکومتیں اولی الامر ہیں اور غیر مسلم ریاستوں میں وہاں کے مسلمانوں پر واجب

ہے کہ اجتماعی مسائل کے لئے کسی مسلمان کی قیادت پر جمع ہوجائیں اور دار الکفر میں مسلمانوں سے شریعت کے جو احکام متعلق ہیں، ان میں ان کی ہدایت پر عمل کریں؛ چنانچہ فتاویٰ بزازیہ میں ہے :

وأما البلاد التی علیها ولاة کفار ، فیجوز فیها أیضاً إقامة الجمع والاعیاد والقاضی قاض بتراضی المسلمین ویجب علیهم طلب وال مسلم ۔ (فتاویٰ بزازیہ:۶/۳۱۱)

جن ریاستوں کے اولی الامر کفار ہوں وہاں بھی جمعہ وعیدین کی نمازیں پڑھنا درست ہے، قاضی مسلمانوں کی رضامندی سے فیصلے کرے گا اور تمام مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کسی مسلمان حکمراں کی جستجو میں رہیں۔

نیز علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں :

و إذا لم یکن سلطان ولا من یجوز التقلد منه کما هی فی بعض بلاد المسلمین غلب علیهم الکفار کفر طبة فی بلاد المغرب الآن وبلنسیة وبلاد الحبشة وأقروا المسلمین عندهم علی مال یوخذ منهم ، یجب علیهم أن یتفقوا علی واحد منهم یجعلونه والیاً فیولی قاضیاً ویکون هو الذی یقضی بینهم ۔ (فتح القدیر:۶/۳۶۵)

اگر کوئی حکمراں نہ ہو اور نہ ہی کوئی ایسا شخص ہو جس کی تقلید کی جاسکے، جیسا کہ بعض مسلم ملکوں میں ہے تو ایسی صورت میں ان پر کفار غالب آجاتے ہیں، مثلاً مغرب میں قرطبہ بلنسیہ اور حبشہ کے ممالک اور وہ مسلمانوں کو اپنی ریاستوں میں رکھنے کے لئے ان سے کچھ معاوضہ لیتے ہیں، ایسی صورت میں مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اپنے درمیان میں سے ہی کسی ایک شخص پر متفق ہوجائیں اور اسے قضا کا عہدہ سونپ دیں؛ لہٰذا وہی ان کے درمیان فیصلے کرے۔

اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے لائق ہے :

لا اسلام إلا بجماعة ، ولا جماعة إلا بامارة ، ولا إمارة إلا بطاعة ۔ (مسند الشهاب عن واثلة بن الاسقع، حدیث نمبر:۴۲۹)

جماعت کے بغیر اسلام نہیں، امارت کے بغیر جماعت نہیں اور اطاعت کے بغیر امارت نہیں۔

بہت سی دفعہ جب مسلم عوام کسی مرکزی رہنمائی کے بغیر مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں تو اس سے انتشار کی صورت پیدا ہوتی ہے اور فائدہ سے زیادہ نقصان ہوجاتا ہے؛ البتہ امراء مسلمین کا فریضہ ہے کہ وہ قرآن وحدیث کو اپنے لئے رہنما بنائیں، عوام کی مشکلات کو اہمیت دیں اور اپنے اندر خدا کا خوف رکھیں؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۔ (البقرۃ:۱۹۴)

پس جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی کہ تم پر کی گئی۔

فَقَاتِلُوْا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ إِلٰى أَمْرِ اللهِ ۔ (الحجرات:۹)

تو (تم سب) باغی گروہ سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اللہ کے فیصلہ کی طرف واپس آجائے۔

اور فقہاء لکھتے ہیں :

من شهر على المسلمين سيفاً وجب قتله ۔ (فتاویٰ ہندیہ:۶/۷)

جو مسلمانوں پر تلوار سونت لے اس کا قتل واجب ہے۔

لیکن جہاں برسر اقتدار گروہ مسلمان ہو تو گو وہ ظالم ہو یا زور زبردستی کرکے اس نے حکومت پر قبضہ کرلیا ہو، وہ بہر حال مسلمان ہے، اگر ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے سے اُمت کی طاقت ٹوٹتی ہو، انتشار پیدا ہوتا ہو، خون خرابہ کا اندیشہ ہو، تو '**اهون البليتين**' کے طور پر صبر وسکوت کا راستہ اختیار کرلینا بہتر ہے، اس کی تائید ان احادیث سے ہوتی ہے، جن میں رسول اللہ ﷺ نے فاجر امام کے ساتھ جہاد کرنے اور ان کے پیچھے بھی نماز ادا کرلینے کا حکم دیا ہے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

الجهاد واجب عليكم مع كل امير براً كان أو فاجراً ،

والصلاة واجبة عليكم خلف كل مسلم براً كان أو فاجراً و إن عمل الكبائر ۔ (۱)

تم پر ہر امیر کے ساتھ خواہ وہ نیک ہو یا فاسق و فاجر جہاد واجب ہے، اسی طرح تم پر ہر مسلمان کے پیچھے نماز پڑھنا واجب ہے، خواہ وہ نیک ہو یا فاسق و فاجر اور خواہ وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو۔

اسی پس منظر میں صحابہ نے حجاج بن یوسف اور یزید بن معاویہ کے پیچھے بھی نماز پڑھی ہے اور ان ظالم و جابر حکمرانوں کے زیر قیادت بھی جہاد کیا ہے، اسی لئے قاضی ابوالحسن ماوردی اور بعض اہل علم نے امارت کی ایک شکل، امارتِ قاہرہ کو بھی بتایا ہے، کہ کوئی شخص ظلم و جبر کے ذریعہ اقتدار حاصل کرلے، تب بھی وہ امیر ہوجائے گا اور امیر کے ذریعہ جو اُمور انجام پاتے ہیں، وہ اس کے ذریعہ انجام پائیں گے، اسی ذیل میں فقہاء نے زکوٰۃ کا مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کوئی باغی گروہ کسی علاقہ پر قبضہ کرلے اور اسے زکوٰۃ ادا کردی جائے تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی :

قوم من الخوارج غلبوا على قوم من أهل العدل واخذوا صدقات السوائم ثم ظهر عليهم الإمام ، لا يحل له أن ياخذ الزكاة ثانيا منهم ۔ (۲)

اگر کچھ خوارج کچھ عادل لوگوں پر غالب آجاتے ہیں اور وہ لوگوں سے جانور کی زکوٰۃ لے لیتے ہیں، پھر ان پر امام غالب آجاتا ہے تو اس کے لئے ان لوگوں سے دوبارہ زکوٰۃ لینا درست نہیں۔

اس لئے ہمیں اُمت کا یہ مزاج بنانا چاہئے کہ جہاں مقابلہ غیر مسلم قابض طاقتوں سے ہو وہاں تو وہ بہ قدر و قدرت و امکان مقابلہ کریں ؛ لیکن جہاں مسلمانوں کا گروہ برسر اقتدار ہو وہاں پر امن طریقہ پر اور قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے نصح و محبت کے ذریعہ اصلاح کا طریقۂ کار اختیار کریں، یہ بزدلی یا فرار نہیں ہے ؛ بلکہ '**اھون البلیتین**' کا انتخاب ہے اور یہی ہمارے دین کا مزاج ہے، اس پر رسول اللہ ﷺ کی ان احادیث سے روشنی پڑتی ہے :

---

(۱) ابوداؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر: ۲۵۳۳، دارقطنی، کتاب العیدین، باب صفة من تجوز الصلاة معه والصلاة علیه، حدیث نمبر: ۱۷۴۶۔

(۲) الفتاویٰ التاتارخانیة: ۲/ ۲۸۲، نیز دیکھئے: الفتاویٰ الہندیہ: ۱/ ۱۹۰۔

حدثنا زيد بن وهب قال : سمعت عبد الله قال : قال لنا رسول الله صلى الله عليه وسلم : إنكم سترون بعدى أثرة وأموراً تنكرونها ، قالوا : فما تأمرنا يا رسول الله ؟ قال : أدوا إليهم حقوقهم واسألوا الله حقكم ۔ (۱)

ہم سے زید بن وہب نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ کو کہتے ہوئے سنا ہے انھوں نے کہا کہ ہم لوگوں سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم لوگ میرے بعد ترجیحات اور چند ایسے اُمور دیکھو گے جسے تم لوگ ناپسند کرو گے، صحابہ کرام ﷺ نے کہا: اے اللہ کے رسول! ایسی صورت حال میں آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ایسے حکمرانوں کے حقوق ادا کرتے رہنا اور اللہ سے اپنا حق مانگنا۔

عن ابن عباس عن النبى صلى الله عليه وسلم قال : من كره أميره شيئاً فليصبر ، فإنه من خرج من السلطان شبراً ، مات ميتة جاهلية ۔ (۲)

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو شخص اپنے امیر کی جانب سے کوئی ناپسندیدہ امر محسوس کرے تو صبر کرے؛ کیوں کہ کسی نے امیر سے معمولی بغاوت بھی کی تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

عن الزبير بن عدي قال : أتينا أنس بن مالك ، فشكونا إليه ما يلقون من الحجاج فقال : أصبروا ، فانه لا يأتي عليهم زمان إلا والذى بعده شر منه حتى تلقون ربكم ، سمعته من نبيكم صلى الله عليه وسلم ۔ (۳)

---

(۱) بخاری، کتاب الفتن، حدیث نمبر: ۷۰۵۲۔ (۲) بخاری، کتاب الفتن، حدیث نمبر: ۷۰۵۳۔

(۳) بخاری، کتاب الفتن، حدیث نمبر: ۷۰۶۸۔

حضرت زبیر بن عدی فرماتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت بن مالکؓ کے
پاس آئے اور ان سے حجاج کے رویوں کی شکایت کی تو انھوں نے کہا
صبر کرو؛ کیوں کہ اب جو بھی زمانہ آئے گا وہ اپنے سے پہلے والے زمانہ
سے زیادہ خراب ہوگا، (یہ سلسلہ چلتا رہے گا) یہاں تک کہ تم اپنے
رب سے جاملو، میں نے یہ بات تمہارے نبی ﷺ سے سنی ہے۔

(۴) یہ بات ممکن نہیں ہے کہ تمام مسلمانوں کو ایک رائے اور ایک فکر بنا دیا جائے، ان میں نقطۂ نظر کا اختلاف رہا ہے اور باقی رہے گا؛ کیوں کہ قرآن وحدیث میں بہت سے مضامین ایسے اجمال وابہام کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں کہ ان میں ایک سے زیادہ معنوں کی گنجائش ہے، اسی طرح بہت سے اُمور وہ ہیں جن کی نصوص میں صراحت نہیں ہے اور وہ قیاس واجتہاد پر مبنی ہیں، اجتہاد کا تعلق جہاں نصوص سے ہے، وہیں انسان کی قوت فکر اور تعقل سے بھی ہے اور اللہ تعالیٰ نے عقل وذوق کا اختلاف رکھا ہے، اسی اختلافِ ذوق ونظر سے کائنات کی رنگارنگی قائم ہے، اس لئے جو اُمور اجتہاد پر ہوں گے، ان میں عام طور پر ضرور ہی اختلاف رائے پیدا ہوگا، اس لئے نہ اختلاف رائے کو روکا جاسکتا ہے اور نہ اس سے گھبرانا چاہئے، ایک صاحب علم کے بہ قول: ''**اختلاف العقول ثراء واختلاف القلوب وباء**''۔

سلف صالحین اختلاف رائے کو اسی نظر سے دیکھا کرتے تھے؛ چنانچہ علامہ ابن تیمیہ نے اختلاف اُمت کے سلسلہ میں بعض علماء کا قول نقل کیا ہے :

إجماعهم حجة قاطعة ، واختلافهم رحمة واسعة ۔ (۱)

اُمت کے علماء کا اجماع حجت قطعیہ ہے اور ان کا اختلاف وسیع رحمت کا
باعث ہے۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کا قول مشہور ہے :

ما أحب أن أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم لم يختلفوا ؛ لأنهم لو كانوا قولا واحدا كان الناس فى ضيق ، و إنهم أئمة يقتدىٰ بهم ، فلو أخذ رجل بقول أحدهم كان فى سعة ۔ (۲)

---

(۱) فتاویٰ ابن تیمیہ: ۳۰/۱۸۰۔ (۲) ادب الاختلاف فی مسائل العلم والدین للشیخ عوامہ: ۳۰۔

میں یہ نہیں چاہتا ہوں کہ صحابہ کرام ﷺ کے درمیان اختلاف نہ ہو؛
کیوں کہ اگر وہ سب ایک ہی قول کو اختیار کریں تو یہ لوگوں کے لئے تنگی
و پریشانی کا سبب ہوگا، یہ قابل تقلید ائمہ ہیں، اگر کوئی کسی ایک کے قول کو
بھی اختیار کر لیتا ہے تو وہ وسعت میں رہتا ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ ہی کے ایک ہم عصر عون ابن عبد اللہ سے نقل کیا گیا ہے :

ما أحب أن أصحاب محمد لم يختلفوا ، فإنهم لو اجتمعوا على شيئ فتركه رجل ، ترك السنة ، ولو اختلفوا فأخذ رجل بقول أحد أخذ بالسنة ۔ (۱)

میں یہ نہیں چاہتا کہ صحابہ کرام ﷺ کے درمیان اختلاف نہ ہو؛ کیوں کہ
اگر یہ حضرات کسی ایک نقطہ پر متفق ہوجائیں اور پھر کوئی شخص اس پر
عمل نہ کرے تو وہ ترکِ سنت کا مرتکب ہوگا اور اگر ان کے درمیان
اختلاف ہو اور پھر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کے قول پر بھی عمل کرتا
ہے تو وہ سنت پر عمل کرنے والا قرار دیا جائے گا۔

اسی لئے فقہاء کا مزاج یہ تھا کہ جن مسائل میں اختلاف رائے کی گنجائش ہوتی ، ان میں
دوسروں کو اپنی رائے پر مجبور نہیں کرتے ، جیسا کہ سفیان ثوریؒ کا قول ہے :

وإذا رأيت الرجل يعمل العمل الذى قد اختلف فيه وأنت ترى غيره فلا تنهه ۔ (۲)

اگر کسی اختلافی مسئلہ میں تم کسی کو ایسا عمل کرتے ہوئے دیکھو جسے تم
درست نہ سمجھتے ہو تو اسے اس عمل کے کرنے سے نہ روکو۔

امام ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے :

قولنا هذا رأى ، وهو أحسن ما قدرنا عليه ، فمن جاء نا بأحسن من قولنا فهو أولى بالصواب منا ۔ (۳)

---

(۱) سنن الدارمی، باب اختلاف الفقہاء: ۱/ ۱۵۱۔

(۲) **الفقيه والمتفقه**: ۲/ ۳۲۳۔

(۳) تاریخ بغداد: ۱۳/ ۳۵۲۔

ہمارا یہ قول ایک رائے ہے، یہ ہماری کوشش کے مطابق سب سے اچھی رائے ہے، اگر کوئی ہماری رائے اور قول سے اچھی رائے اور قول پیش کرتا ہے تو وہ ہماری رائے اور قول سے زیادہ صحت کا مستحق ہے۔

اسی طرح امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں :

قال الأوزاعی فی الذی یقبل امرأته : إن جاء لیسألنی قلت : یتوضأ ، وإن لم یتوضأ لم أعب علیه ۔(۱)

امام اوزاعی کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو بوسہ دیا اور پھر میرے پاس اس سے متعلق سوال پوچھنے آتا ہے تو میں اس سے کہوں گا کہ وہ وضو کر لے اور اگر وہ وضو نہیں کرتا ہے تو میں اس پر عیب بھی نہیں لگاؤں گا۔

اختلافِ فکر کے باوجود اہل علم ایک دوسرے سے استفادہ بھی کرتے تھے، مثلاً اہل سنت والجماعت کے نزدیک سب سے مستند مجموعۂ حدیث صحیح بخاری ہے، اس کے مؤلف نے جن حضرات سے روایتیں لی ہیں، ان میں ۸۰ سے زیادہ ان فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن سے اہل سنت والجماعت کا سخت اختلاف تھا، ان میں پندرہ مرجیہ، سات ناصبیہ، چھتیس شیعہ، اُٹھائیس قدریہ اور خوارج اور کچھ دوسرے فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں، علامہ سیوطی نے تدریب الراوی میں تفصیل سے نام بہ نام ان کا ذکر کیا ہے۔(۲)

علامہ جار اللہ زمخشری سے بڑھ کر قرآن کی بلاغت اور زبان وادب سے آشنا کون ہوگا، سب جانتے ہیں کہ یہ غالی معتزلی تھے اور اہل سنت کے سخت ناقد؛ لیکن اہل سنت کی کتابوں میں ان کا ذکر نہایت احترام کے ساتھ کیا جاتا ہے اور بہت سے لوگ ان کے نام کے ساتھ ان کا لقب، جار اللہ بھی لکھتے ہیں؛ حالاں کہ ان کا یہ لقب کثرت عبادت کی وجہ سے بہ طور مدح کے تھا، اسی طرح امام راغب اصفہانی صاحب مفردات القرآن بھی معتزلی ہیں اور راغب اصفہانی کے بعد آنے والا شاید ہی کوئی اہل سنت کا مفسر ہو، جس نے مفرداتِ قرآن میں ان کی تحقیق سے فائدہ نہ اُٹھایا ہو۔

---

(۱) التمهید :۲۱/ ۱۷۲، ونحوه فی ''الاستذکار'': ۱/ ۳۲۳۔

(۲) دیکھئے: تدریب الراوی: ۸/ ۲۷۷-۲۸۰۔

اگر اس نقطۂ نظر سے معلومات جمع کی جائیں اور علماء اسلام کے مختلف گروہوں کے ایک دوسرے سے افادہ واستفادہ کے واقعات نقل کئے جائیں تو ایک طویل کتاب ہوسکتی ہے اور یہ واقعی ایک ایسا موضوع ہے جس پر علماء کو کام کرنا چاہئے ؛ لیکن افسوس کہ بڑھتے ہوئے فاصلے اور شدت پسندی کا رجحان ہمیں اس جہت میں سوچنے کا موقع نہیں دیتا۔

(۵) رسول اللہ ﷺ نے پوری اُمت کو جسدِ واحد قرار دیا ہے :

مثل المومنين في توادهم وتراحمهم وتعاطفهم مثل الجسد ، إذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد ۔ (۱)

باہمی جذبہ رحم، محبت اور مودت میں مومن کی مثال جسم کی طرح ہے کہ اگر جسم کے ایک حصہ کو تکلیف پہنچتی ہے تو سارا جسم تڑپ اُٹھتا ہے۔

قبائل اور نسلیں محض انسان کے تشخص کی شناخت کے لئے ہیں، یعنی تعارف کے لئے ہیں، نہ کہ تفاخر کے لئے ؛ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللهِ أَتْقَاكُمْ ۔ (۲)

اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت کے ملاپ سے پیدا کیا ہے اور ہم نے تمہیں قوموں اور قبیلوں میں اس لئے بانٹ دیا ہے ؛ تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو ، بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے معزز وہ ہیں جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہیں۔

آپ ﷺ نے صاف ارشاد فرمادیا کہ رنگ ونسل اور علاقہ وزبان کی بنیاد پر ایک شخص کو دوسرے شخص پر فضیلت حاصل نہیں ہے ؛ بلکہ فضیلت کا معیار تقویٰ ہے :

لا فضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي ، ولا لأحمر على أسود ، ولا لأسود على أبيض ، إلا بالتقوى ، ان اكرمكم عند الله اتقاكم ۔ (۳)

(۱) **مسند احمد :** ۴/۳۶۹، حدیث نمبر : ۱۸۳۴۰/۳۲، **مسلم ، کتاب البر والصلة والأدب ، باب تراحم المومنين وتعاطفهم وتعاضدهم**، حدیث نمبر : ۲۵۸۶۔

(۲) الحجرات : ۱۳۔

(۳) مسند أحمد : ۲۳۴۸۹، عن رجل من أصحاب النبی ، وشعب الایمان : ۴۷۷۴، عن جابرؓ۔

لیکن افسوس کہ آج مسلمانوں نے اپنے آپ کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کرلیا ہے، نسلی ،لسانی تعصّبات ،عرب وعجم کے جھگڑے اور ان جغرافیائی ٹکروں کی بنا پر پیدا ہونے والی تنگ نظری، جن کو خدا کے ہاتھوں نے نہیں کھینچا ہے،خود انسانوں نے بانٹا ہے، اُمتِ مسلمہ کی آفاقیت کو تار تار کردیا ہے اور اس چیز نے اس کو ایسا بے وزن بنادیا ہے کہ وہ دنیا کی مختلف قوموں کے لئے لقمہ تر بن چکی ہیں، ان کا خون پانی سے زیادہ سستا ہے اور ان کی عزت وآبرو کی کوئی قیمت نہیں ہے؟ اس عصبیت جاہلیہ کا مقابلہ کرنے اور مسلمانوں کو اس سے بچانے میں علماء ، مذہبی قائدین اور مسلمان مفکرین نہایت اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔

(۶) ہمیں مسلمانوں کے درمیان مختلف مکاتبِ فکر کے درمیان انضمام کے بجائے اشتراک پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے ، اسلام نے تو غیر مسلموں کے ساتھ بھی مشترکہ قدروں پر اتفاق کر کے اشتراک عمل کا حکم دیا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلاَّ نَعْبُدَ إِلاَّ اللهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوْا اشْهَدُوْا بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۔ (آل عمران: ۶۴)

آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب ! آؤ ایک کلمہ پر جمع ہوجائیں جس میں ہم اور تم برابر ہیں ، وہ یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا معبود نہ بنائے ، پس اگر وہ اعراض کریں تو (مسلمانو) تم کہہ دو ! گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔

اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان مشترک کلمہ صرف عقیدۂ توحید ہے اور اس میں بھی اہل کتاب کا عقیدۂ توحید خالص نہیں تھا، بہت سے یہود حضرت عزیر کو ابن اللہ مانتے تھے اور عیسائیوں کی اکثریت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو، اس کے باوجود قرآن مجید نے انھیں اشتراکِ عمل کی دعوت دی ، مسلمانوں کے مختلف مذاہب اور فرقوں کے درمیان کلمہ مشترک کا دائرہ بہت وسیع ہے ، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت ،قرآن کی حقانیت ، بنیادی فرائض وواجبات ،مستحبات اور محرمات

میں یکسانیت، زندگی سے متعلق تقریباً ۸۰ فیصد مسائل میں کسی نہ کسی درجہ میں اتفاق رائے اور کلمہ اور قبلہ کی وحدت یہ تمام باتیں وہ ہیں جو مسلمانوں کو ایک دوسرے جوڑتی ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ ہم کلمہ توحید کی بنیاد پر پوری اُمت کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کریں اور اسلام کی حفاظت و مدافعت اور اس کے غلبہ وظہور نیز پوری دنیا کے مسلمانوں کی صیانت کے لئے مشترکہ پروگرام بنائیں اور مختلف حلقوں سے اس اُمت میں افتراق پیدا کرنے کی جو کوششیں کی جارہی ہیں، ان سے خود آگاہ رہیں اور عام مسلمانوں کو آگاہ کریں۔

● ● ●

شاید کہ اُتر جائے تیرے دل میں میری بات! ☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين وعلى آله وأصحابه أجمعين ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أما بعد !

عزیزانِ گرامی ! اللہ کا شکر واحسان ہے کہ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے قیام پر ۱۰ سال کا عرصہ گذر چکا ہے، اب وہ اپنی عمر کے گیارہویں سال میں ہے، اس درمیان رہروانِ علم ونظر کے کئی قافلے آئے، اس گلشن فکر ونظر میں خیمہ زن ہوئے، جو کچھ خوشبو انہیں میسر آئی، اس کی سوغات اپنے ساتھ لے کر ملک کے مختلف علاقوں میں پہنچے، آج پھر چند لمحات کے لئے یہ بکھرے ہوئے غنچہ وگل یہاں جمع ہیں، اس موقع پر آپ کے اساتذہ اور اس ادارہ کے منتظمین کو جو مسرت ہوسکتی ہے، شاید کسی پیمانہ کے ذریعہ اس کو تولنا ممکن نہ ہو؛ کیوں کہ اداروں کی پہچان خشت وسنگ کی عمارتوں سے نہیں ہوتی، اُن افراد سے ہوتی ہے، جو اُن کی آغوش تربیت سے فیض یاب ہوکر نکلتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان توقعات کو پوری فرمائے، جو آپ سے متعلق امت نے قائم کی ہیں اور ان آرزوؤں کو برلائے، جو اس ادارہ نے آپ سے وابستہ رکھی ہیں۔

فضلاء عزیز ! اگر سوال کیا جائے کہ اس ادارہ کے قیام کا مقصد کیا ہے اور بہت سی دینی درسگاہوں کے موجود ہوتے ہوئے اس کی کیا ضرورت تھی؟ اور ایک لفظ میں اس کا جواب مانگا جائے تو شاید اس کا جواب ہوگا: دینی کاموں میں 'احسان' کا حامل بنانا، — احسان سے مراد یہ ہے کہ جس کام کو کیا جائے خوش سلیقگی کے ساتھ اور درست طریقہ پر کیا جائے، اللہ تعالیٰ کی عبادت وبندگی میں احسان یہ ہے کہ انسان یوں محسوس کرے کہ گویا اس کا خدا اس کے سامنے ہے، بندہ اپنے رب کو دیکھ رہا ہے اور کم سے کم یہ تصور ہو کہ خدا کی نگاہ اس کے بندہ کی طرف متوجہ ہے: "**أن تعبد الله كأنك تراه فإن لم تكن تراه فإنه يراك**" (صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب سؤال جبرئیل النبی عن الایمان والاسلام، حدیث نمبر: ۵۰) نماز کی صفیں بن رہی ہوں تو احسان یہ ہے کہ صفیں درست ہوں،

☆ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے بین الاقوامی قرآن مجید سیمینار منعقدہ: ۲۰۱۱ء میں فضلاء معہد سے خطاب۔

بکھری ہوئی نہ ہوں ، (**صحیح مسلم ،کتاب الصلاۃ ، باب تسویۃ الصفوف**......حدیث نمبر :۱۰۰۳ ، **سنن النسائی ، کتاب الجنائز ، باب فضل من صلی علیہ مائۃ** ، حدیث نمبر : ۲۰۰۵) بال رکھتا ہو تو احسان یہ ہے کہ بال الجھے ہوئے نہ ہوں ، آپس میں معاملات کئے جائیں تو احسان یہ ہے کہ ایثار سے کام لیا جائے ، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے ہر چیز میں احسان کو ضروری قرار دیا ہے : ''**إن اللہ عز وجل کتب الإحسان علی کل شئ**'' (سنن ابن ماجۃ ، کتاب الذبائح ، باب إذا ذبحتم فاحسنوا الذبح ، حدیث نمبر : ۳۱۷۰) یہاں تک کہ اگر کسی مستحق قتل کو قتل کرو تو اس میں بھی احسان ہو اور کسی جانور کو ذبح کرو تو اس میں بھی احسان کا پہلو ملحوظ رکھو : ''**فإذا قتلتم فأحسنوا القتلۃ و إذا ذبحتم فأحسنوا الذبح**'' (حوالہ سابق) غرض کہ زندگی کے ہر کام میں احسان کا پہلو ہو ، تعلیم وتربیت کارہائے نبوت میں سے ہے ، اس کی فضلیت کے کیا کہنے ؛ لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس میں بھی اجر وثواب کو احسان سے مربوط فرمادیا ، آپ ﷺ نے فرمایا : ''**علمھا فأحسن تعلیمھا و أدبھا فأحسن تأدیبھا**'' ۔

(صحیح البخاری ، کتاب النکاح ، باب اتخاذ السراری ، حدیث نمبر : ۵۰۸۳)

غرض احسان کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں اور دین کے تمام کاموں سے ہے ، اگر آپ امام ہوں تو بہتر امام ہوں ، آپ حسن قرأت اور افعال صلاۃ میں تعدیل کے ساتھ نماز پڑھائیں اور اپنے مقتدیوں کی نماز کے بارے میں بھی فکر مند رہیں ، رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر خشوع وخضوع کس کی نماز میں ہوسکتا تھا ؛ لیکن پھر بھی آپ گوشۂ چشم سے مقتدیوں کے افعال کو ملاحظہ کرتے رہتے تھے اور حسب ضرورت ان کی اصلاح فرماتے تھے ، اگر آپ جمعہ وعیدین کے خطیب ہوں تو آپ کی خطابت کا ایک معیار ہو ، سلیقہ مندی اور نرمی کے ساتھ اپنی بات کو پیش کریں ، مدعو کتنا بھی خودسر اور بداخلاق ونافرمان ہو ؛ لیکن داعی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی زبان میں قند ونبات کی مٹھاس اور شبنم کی ٹھنڈک ہو ؛ چنانچہ حضرت موسی علیہ السلام وہارون علیہ السلام سے فرمایا گیا : ''**فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا**'' (طٰہٰ : ۴۴) آپ کی گفتگو سے محسوس ہو کہ آپ کی انگلیاں زمانہ کی نبض پر ہیں اور وقت کی دھڑکنوں کو آپ سمجھتے ہیں ، آپ کی نصیحتیں قرآن مجید کی آیات ، معتبر احادیث اور صحابہ کے مستند واقعات پر مبنی ہوں ، اگر آپ مدرس ہوں تو آپ کی زبان شائستہ ہو ، آپ کا سینہ طلبہ کی محبت سے معمور ہو ، آپ اپنے موضوع پر مطالعہ کا حق ادا کریں ، آپ کی تفہیم مرتب اور آپ کی زبان شائستہ ہو ، نیز آپ جدید طریقۂ تعلیم سے بھی آشنا ہوں ، اگر آپ داعی ہوں تو جس بات کی دعوت دے رہے ہوں خود آپ کے اندر اس کا بھرپور

یقین ہو، مدعو کی نجات کی فکر آپ کو خون کے آنسو رلاتی ہو، اور جب آپ ان سے گفتگو کرتے ہوں تو آپ کی زبان سے محبت و پیار کے پھول جھڑتے ہوں، اگر آپ افتاء کی خدمت انجام دے رہے ہوں تو آپ میں تحقیق کا جذبہ اور آنکھوں کا چراغ جلانے کا حوصلہ ہو؛ کیوں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''**من أفتى بغير علم كان إثمه على من أفتاه**'' (سنن أبی داؤد، کتاب العلم، باب التوقی فی الفتیا، حدیث نمبر: ۳۶۵۹) آپ زمانہ کے احوال، شریعت کے مقاصد اور لوگوں کی مصالح سے بھی واقف ہوں، اس بات کا بھی ادراک رکھتے ہوں کہ مسلم اکثریت ممالک اور مسلم اقلیت ممالک، قدیم الاسلام مسلمانوں اور حدیث الاسلام مسلمانوں کی صورتحال مختلف ہوتی ہے، اگر آپ منصب قضا پر فائز کئے جائیں تو اس موضوع پر پوری بصیرت حاصل کریں، جو مسائل آپ کے سامنے آئیں ان میں قرآن وحدیث اور مذاہب اربعہ پر آپ کی نظر ہو، آپ کے ورع واحتیاط اور عدل وانصاف کے دامن پر دھبہ نہ لگ جائے، اور کبھی متانت ووقار کے خلاف کوئی بات آپ سے سرزد نہ ہونے پائے۔

اگر آپ کا تعلق صحافت اور تصنیف وتألیف سے ہو تو آپ کے قلم اٹھانے کا مقصد یا تو اسلام کی دعوت ہو یا اسلام کی حفاظت، یا شریعت اسلامی کی تحقیق و وضاحت، نہ آپ کی منزل شہرت ونا موری ہو اور نہ آپ کا مقصد درہم ودینار ہو، آپ کی ہر تحریر وسیع تحقیق اور گہری فکر پر مبنی ہو نہ کہ سنی سنائی باتوں کو نقل کرنے پر، غرض آپ زندگی کے جس شعبہ میں ہوں، وہاں اپنے آپ کو اسلام کا سپاہی، دین کا نقیب اور شریعت اسلامی کا ترجمان سمجھیں اور اپنی طاقت بھر علم وتحقیق، حسنِ اخلاق، ورع واحتیاط اور اتباع شریعت وسنت کے لحاظ سے اس مقام پر ہوں کہ لوگ آپ کو نمونہ بنانا چاہیں۔

حضرات ! غالباً 'احسان' کی یہی مراد ہے اور معہد کے قیام کا بنیادی مقصد یہی ہے، اس کے ساتھ ساتھ اسی ذیل میں چند نکات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے، جو آپ کے مادر علمی کے مزاج میں داخل ہے اور جس کی اس وقت امت کو صحیح راستہ پر قائم رکھنے کے لئے سخت ضرورت ہے :

اعتدال فکر

قانون فطرت یہ ہے کہ بڑی سے بڑی نعمت بھی اگر حد اعتدال سے بڑھ جائے تو وہ انسانیت کے لئے رحمت کی بجائے زحمت بن جاتی ہے، ہَوا پر انسانی زندگی کا مدار ہے؛ لیکن آندھی چلنے لگے اور طوفان اُٹھ کھڑا ہو تو یہی ہَوا انسانیت کے لئے تباہی وبربادی کا سبب بن جاتی ہے، پانی زندگی کے لوازم میں سے ہے، قرآن نے خود اسے سرچشمۂ حیات قرار دیا ہے: ''**وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ**

حَيٍّ ''(الأنبياء: ۳۰) لیکن جب سمندر اور دریا ابل آتے ہیں اور آبادیوں میں پانی داخل ہوجاتا ہے تو یہی پانی کتنے ہی جانوروں اور انسانوں کے لئے پروانۂ موت بن جاتا ہے، فکر وعمل کی بے اعتدالی بھی اسی طرح انسان کو نقصان پہنچاتی ہے، عیسائیوں نے رجال اللہ کے معاملہ میں افراط سے کام لیا اور یہودیوں نے تفریط سے؛ اسی لئے ایک ''ضَآلِّيْنَ'' کہلائے اور دوسرے ''**مغضوب علیهم**'' یہ حقیقت میں فکری بے اعتدالی ہی کا نتیجہ ہے!

خود امت میں اہل سنت والجماعت کے مسلک کا امتیاز 'اعتدال' ہے، مرجیہ نے اعمال کی اہمیت ختم کردی اور خوارج نے اعمال کی اہمیت میں غلو سے کام لیا؛ حالاں کہ ان کے اندر ظاہری دینداری کی کوئی کمی نہیں تھی، روافض نے اہل بیت کی محبت میں غلو سے کام لیا اور ناصبیہ نے تفریط کا راستہ اختیار کیا؛ اسی لئے دونوں گمراہ کہلائے، اہل سنت والجماعت نے ان کے درمیان اعتدال اور میانہ روی کا راستہ اختیار کیا، جو صراط مستقیم ہے اور دین میں مطلوب ہے۔

علماء کے لئے ہر زمانہ میں اسی طرز عمل کو اختیار کرنا ضروری ہے، بعض اعتقادی مسائل میں عہد صحابہ میں بھی اختلاف ہوا ہے، اشاعرہ، ماتریدیہ اور حنابلہ بھی صفات باری کی تشریح اور بعض دوسرے مسائل میں ایک دوسرے سے مختلف رہے ہیں، ایسے مسائل میں ایک نقطۂ نظر کو حق وہدایت کی اساس سمجھ لینا غلو اور بے اعتدالی ہے، احکام فقہیہ میں بعض نصوص پر مبنی ہیں اور بعض غیر منصوص ہیں، پھر منصوص مسائل میں کچھ وہ ہیں، جو نصوص قطعیہ سے ثابت ہیں اور کچھ نصوص ظنیہ سے، بعض نصوص اپنے معانی اور مفاہیم کے اعتبار سے بالکل واضح ہیں اور بعض میں ابہام ہے، بعض احکام فقہاء کے اجتہاد پر مبنی ہیں اور ان میں قیاس واجتہاد کے ایک سے زیادہ پہلو ہیں، ان تمام کو ایک ہی درجہ میں نہیں رکھا جاسکتا، اسی طرح تقلید ایک ضرورت ہے اور یہ موجودہ دور میں اتباع شہوات سے بچانے کا ایک اہم ذریعہ ہے؛ لیکن بہت سے مسائل میں خود صاحب مذہب سے مختلف اقوال منقول ہیں، بعض مسائل صاحب مذہب کے اجتہاد پر مبنی نہیں؛ بلکہ متبعین مذہب کے اجتہاد پر مبنی ہیں، جس کو فقہ کی اصطلاح میں ''تخریج'' کہتے ہیں، پھر اس اجتہاد میں مختلف متبعین مذہب کے الگ الگ اقوال ہیں، مقلدین کے لئے یہ تمام احکام ایک درجہ کے نہیں ہیں۔

اسی طرح شارع کی نصوص اور فقہاء کے اجتہادات یکساں نہیں ہیں؛ کیوں کہ نص معصوم ہے اور اجتہاد میں خطا کا احتمال ہے؛ اسی لئے ہر دبستانِ فقہ میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ بوقت

ضرورت دوسرے مذاہب کی آراء سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، یا مذہب کے قول ضعیف کو بھی لیا جاسکتا ہے؛ البتہ یہ کام اصحاب تحقیق علماء اور زمانہ شناس فقہاء کے کرنے کا ہے، نہ یہ درست ہے کہ ہم اپنے سلف صالحین سے بدگمان ہوجائیں، اپنے آپ کو ان کے اجتہادات سے آزاد کرلیں، اور تقلید کو غیر ضروری سمجھنے لگیں، اور نہ یہ درست ہے کہ ہم فقہاء کے اقوال واجتہادات کو کتاب وسنت کے درجہ میں رکھ دیں، اور اس سے ایک سرمو ہٹنے کو بھی ضلالت وگمراہی تصور کریں۔

یہی فکر تھی شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی، یہی نقطۂ نظر تھا مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کا، اسی راہ کو اختیار کیا مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ نے، اس فکری اعتدال کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ امت میں اتحاد قائم ہوتا ہے، فاصلے گھٹتے ہیں، غیر حقیقی مسائل میں اُلجھنے کی بجائے حقیقی مسائل کو حل کرنے کی طرف توجہ ہوتی ہے، لوگوں میں شریعت کی محبت پیدا ہوتی ہے اور ان کا یقین بڑھتا ہے کہ شریعت اسلامی زندگی کے تمام مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، اس اعتدال کا امتحان اس وقت ہوتا ہے، جب کسی فریق کی طرف سے بے اعتدالی کا اظہار ہو، تو انسان کے اندر ردعمل پیدا ہوتا ہے اور یہ ردعمل حد سے تجاوز کرتے ہوئے غلو میں داخل ہوجاتا ہے، ایسے وقت میں اعتدال کے دامن کو تھامے رکھنا اور غلو کی روش سے اپنے آپ کو بچائے رکھنا آسان نہیں ہوتا، قرآن مجید میں انبیاء کے اپنی قوم سے خطاب، قوم کی طرف سے نامعقولیت کا اظہار اور پھر انبیاء کرام کے جوابات کو دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سخت سے سخت گفتگو پر بھی ان میں منفی ردعمل واشتعال پیدا نہیں ہوتا تھا، علماء ربانیین اور داعیان دین متین کی شان یہی ہے۔

اعتدال ہی کا ایک پہلو یہ ہے کہ مختلف مکاتب فکر اور دبستان فقہ کی اہم شخصیتوں کا احترام ملحوظ رکھا جائے، انسان اپنے بارے میں بدگوئی کو گوارا کرلیتا ہے؛ لیکن جو اس کا رہبر ومقتدیٰ ہو، وہ اس کی ذرا بھی بے احترامی کو گوارہ نہیں کرتا، قرآن مجید نے لوگوں کے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے معبودان باطل کو بھی برا بھلا کہنے سے منع فرمایا ہے؛ **(الأنعام:۱۰۸)** کیوں کہ اس سے نفرتیں بڑھتی ہیں، امن وآشتی کا ماحول متأثر ہوتا ہے، یہی طریقہ سلف صالحین کا رہا ہے، علامہ زمخشریؒ معتزلی ہیں؛ لیکن اس کے باوجود اہل سنت ان کا نام احترام سے لیتے رہے ہیں، یہاں تک کہ کثرت عبادت کی وجہ سے ان کا لقب 'جار اللہ' پڑ گیا تھا، بہت سے علماء اہل سنت ان کا ذکر اسی لقب سے کرتے ہیں، بعض اور معتزلی محدثین فقہاء کے تذکرہ میں اکابر علماء اہل سنت نے اس پہلو کو ملحوظ رکھا ہے، اسی طرح کسی

گروہ یا کسی شخص سے کتنا بھی اختلاف ہو، اس کی خوبیوں کا اعتراف کرنا چاہئے، محدثین و ماہرین اسماء رجال کو دیکھئے کہ بہت سے منحرف فرقوں کے رواۃ کا ذکر کرتے ہوئے ان کی فکر باطل کا بھی ذکر کرتے ہیں اور ان کو 'ثقہ وصدوق' بھی قرار دیتے ہیں، خود امام بخاری کے یہاں سو کے قریب رواۃ ہیں، جن کی نسبت فرق مبتدعہ کی طرف کی گئی ہے۔

اعتدال کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ ایک شخص نے بصیرت کے ساتھ جس بات کو درست سمجھا ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ اس سے ہٹ جائے اور منحرف افکار سے متأثر ہو جائے ، اپنی فکر پر استقامت ہونی چاہئے اور جن افکار کو وہ نادرست سمجھتا ہے، ان پر حسب ضرورت دلیل کے ساتھ سنجیدہ زبان، نرم لب ولہجہ، داعیانہ اسلوب اور ناصحانہ انداز میں نقد بھی کر سکتا ہے ؛ بلکہ بعض دفعہ ایسا کرنا ضروری ہو جاتا ہے، اتنی رواداری نہ ہو کہ انسان اپنی شناخت سے محروم ہو جائے اور اتنا تشدد نہ ہو کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقع ختم ہو جائے۔

عصری تقاضوں کا شعور

اللہ نے زمانہ کی قسم کھائی ہے، (العصر: ۱) اس سے زمانہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، زمانہ کی اہمیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ ایک تغیر پذیر شئ ہے، زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ثقافتی، اخلاقی، فکری اور سیاسی تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں، ان تبدیلیوں کا شعور علماء کے لئے ضروری ہے، امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دین حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک ایک ہی رہا ہے؛ کیوں کہ دین کی بنیاد ایمانیات پر ہے اور ان میں تبدیلی ناقابل تصور ہے؛ لیکن شریعت مختلف ادوار میں بدلتی رہی ہے ؛ کیوں کہ شریعت کا تعلق عملی احکام سے ہے اور مختلف اسباب کی وجہ سے عملی زندگی کے تقاضے ہمیشہ یکساں نہیں رہتے ، یہ گویا اس بات کا اشارہ ہے کہ عصری تبدیلیاں انسان کے فکر و عمل اور تہذیب وثقافت پر اثر انداز ہوتی ہیں، علماء کے لئے ضروری ہے کہ اس پر ان کی نگاہ ہو؛ اسی لئے امام ابو یوسف کی طرف یہ قول منسوب ہے اور بہت سے فقہاء نے اس کا ذکر کیا ہے کہ جو اپنے زمانہ کے لوگوں سے واقف نہ ہو وہ علم نا آشنا ہے: ''**من لم يعرف أهل زمانه فهو جاهل**''۔

زمانہ شناسی کی ضرورت ہر میدان کے لئے ہے ، ہم نے اپنی کتابوں میں فرق باطلہ اور افکار زائغہ کا ذکر پڑھا ہے، جن کا ذکر سلف نے اپنے عہد کے پس منظر میں کیا ہے ؛ لیکن آج کے افکار الگ ہیں، اسلام پر کئے جانے والے اعتراضات بھی الگ ہیں، اور ان کو ثابت کرنے کا اسلوب

بھی الگ ہے، جس طرز استدلال سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے وہ بھی جداگانہ ہے، سیاسی نظام بدل چکا ہے، اقتصادیات کا ایک نیا نظام وجود میں آچکا ہے، اور پوری دنیا سمٹ کر گاؤں بن چکی ہے، نئے نئے وسائل پیدا ہوئے ہیں اور ان وسائل وذرائع نے نہ صرف آسانیاں پیدا کی ہیں؛ بلکہ اندازِ فکر پر بھی اثر ڈالا ہے، علماء کے لئے ضروری ہے کہ وہ صرف ماضی کے حصار میں مقید نہ رہیں؛ بلکہ اپنے عہد کے افکار، ان افکار کے اسباب، اپنے عہد کے تقاضوں اور ضرورتوں نیز اس دور کے طرز استدلال سے واقف ہوں، شاہ ولی اللہ صاحب کی معروف ومقبول تالیف ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کی پذیرائی کا اصل سبب یہی ہے کہ وہ اپنے عہد کی عقلی افتاد کے پس منظر میں لکھی گئی ہے، اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا یہی امتیاز ہے کہ انھوں نے ایک جدید علم کلام کی بنیاد رکھی اور نظری استدلالات کی بجائے محسوسات سے معنویات کو ثابت کیا، بہر حال یہ بات ضروری ہے کہ ہم جس میدان میں بھی کام کریں، اپنے عہد کے تقاضوں کو سمجھیں اور لوگ محسوس کریں کہ ہم آثار قدیمہ نہیں ہیں؛ بلکہ ایک باشعور، زمانہ شناس اور بلند نگاہ گروہ ہیں۔

دفاع عن الدین

دعوت اصل میں دین کی ہے نہ کہ مسلک ومشرب کی، سلف صالحین نے کبھی کسی کو اپنے مسلک کی طرف آنے کی دعوت نہیں دی، اہل علم کے لئے یہ واقعہ محتاجِ اظہار نہیں کہ جب امام مالکؒ کی فقہ پر عباسی خلفاء نے پوری امت کو جمع کرنے کی کوشش کی تو امام مالکؒ نے اس سے منع فرمادیا، اس سے جہاں امام مالک کا اخلاص، للّٰہیت اور خداترسی معلوم ہوتی ہے، وہیں یہ پہلو بھی واضح ہوتا ہے کہ ہمارے سلف صالحین نے کبھی اس بات کی کوشش نہیں کی کہ فروع دین میں سارے لوگ ہماری فکر پر آجائیں، انہوں نے اختلاف رائے کا احترام کیا اور اُمت کے لئے اسے رحمت سمجھا، دعوت جس چیز کی مطلوب ہے، وہ دین ہے؛ اس لئے اصل میں دفاع بھی دین ہی کا واجب ہے۔

بعض دفعہ فروعی اور مسلکی اختلاف میں غلو کی وجہ سے لوگ 'دفاع عن الدین' کی بجائے 'دفاع عن المسلک' کو اپنی مہم اور اپنی سعی وکاوش کا محور بنالیتے ہیں، ہندوستان کی دو عظیم اور تاریخی درسگاہوں — دار العلوم دیوبند اور دار العلوم ندوۃ العلماء — کے بانیان میں ایک بات مشترک معلوم ہوتی ہے کہ ان کی توجہ زیادہ تر اسلام کے خلاف ہونے والی فکری یلغار تھی اور دین کے دفاع کو انھوں نے اپنی زندگی کا مشن بنایا تھا، ایک آدھ مختصر تحریر کو چھوڑ کر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی

تمام کتابیں آریہ سماجیوں اور عیسائیوں کے رد میں اور اسلام کے خلاف کئے جانے والے اعتراضات کے جواب میں ہیں، اگر بہ تقاضائے ضرورت اہل سنت کے کسی گروہ یا اہل قبلہ میں سے کسی باطل فرقہ کے خلاف لکھا ہے تو اس کا لب ولہجہ بہت نرم اور انتہائی ناصحانہ ہے، جبکہ معاندین اسلام کے خلاف آپ کا قلم شمشیر برہنہ ہے، یہی مزاج ہمیں حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے یہاں ملتا ہے، انھوں نے اپنی پوری زندگی فتنۂ قادیانیت، عیسائیت اور آریہ سماجیت کے رد میں صرف فرمائی اور ایک بڑے علاقہ کو کفر وارتداد کے فتنہ سے بچایا، دوسری طرف مسلکی اور فروعی اختلافات پر قلم اُٹھانے سے گریز کیا اور اہل سنت کے مختلف طبقوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کرنے کے لئے 'تحریک ندوۃ العلماء' کی بنیاد رکھی۔

اس وقت صہیونی اور صلیبی طاقتیں کمر بستہ ہیں کہ جو مسلمان دین سے دور ہیں، ان میں علاقائی، لسانی اور نسلی بنیادوں پر افتراق پیدا کیا جائے اور جو مسلمان دین سے مربوط ہیں، انہیں مسلکی جھگڑوں میں الجھایا جائے، ضروری ہے کہ علماء اس صورت حال کو سمجھیں اور سوچیں کہ کہیں ہم نادانستہ طور پر پورے جذبۂ اخلاص کے ساتھ اعداء اسلام کے آلۂ کار تو نہیں بن رہے ہیں؟

فکر اُمت

علماء کے لئے جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے، وہ ہے اُمت کی فکر، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**من لم یهتم للمسلمین فلیس منهم**'' (المستدرک حاکم، کتاب الرقاق، حدیث نمبر: ۷۹۰۲) ''جس کو مسلمانوں کے مسائل کی فکر نہ ہو، وہ مسلمانوں میں نہیں ہے'' پھر آپ ﷺ نے یہاں فکر کے لئے ''**هم**'' کا لفظ فرمایا ہے، جس کے معنی 'گہری فکر' کے ہیں، ایسی فکر جو انسان کو بے قرار کردے، پس جیسی فکر انسان اپنے لئے اور اپنے قریبی متعلقین کے لئے کرتا ہے، ویسی ہی فکر اس کے دل میں پوری اُمت کی پیدا ہو جائے۔

یہ جہت اس وقت علماء کی بہت کمزور ہوگئی ہے، ہم مدرس ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہمارا کام چند گھنٹے پڑھا دینا ہے، نہ ہمارے دل میں بچوں کی محبت، نہ ان میں لیاقت پیدا کرنے کی فکر، نہ علم کی امانت دوسروں تک پہنچانے کے لئے کوئی بے قراری؛ حالاں کہ جو بچے ہمارے زیر درس ہیں، ان کے بارے میں ہم دنیا سے آخرت تک جواب دہ ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**کلکم راع وکلکم مسؤول عن رعیته**'' (صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب الجمعة فی القری والمدن، حدیث نمبر: ۸۹۳) ہم

امام ہیں تو ہم نے سمجھا کہ ہمارا کام صرف نماز پڑھا دینا ہے، مصلیوں اور محلہ والوں کے دینی ودنیوی مسائل کے بارے میں ہماری کوئی ذمہ داری نہیں ؛ حالاں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''**الإمام ضامن**'' (سنن أبي داود، کتاب الصلاۃ، باب ما یجب علی المؤذن من تعاہد الوقت، حدیث نمبر: ۵۱۷) فقہاء نے اس سے یقیناً نماز کے بعض اہم مسائل اخذ کئے ہیں ؛ لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ لفظ عام ہے، یعنی امام مقتدیوں کا، مصلیانِ مسجد کا اور محلۂ مسجد کا ذمہ دار ہے، ذمہ دار ہے ان کو نماز پڑھانے کا، وہ ذمہ دار ہے ان کی نمازوں کے درست کرنے کا، وہ ذمہ دار ہے ان کی دینی تعلیم وتربیت کرنے کا، وہ ذمہ دار ہے مسلمان بچوں اور ان کے سرپرستوں کو عصری تعلیم کی طرف راغب کرنے کا، اس محلہ میں سماجی اصلاح کی تحریک چلانے کا، خدمت خلق کے کاموں کے منظم کرنے کا، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کو خوش گوار بنانے کا، خاندانی تنازعات کو طے کرنے کا، غرض کہ وہ اقبال کی زبان میں صرف 'دو رکعت کا امام' نہیں ہے ؛ بلکہ اپنے حلقہ کے مسلمانوں کی پوری زندگی کا امام ہے، اگر علماء اس طرح امامت کو اپنے ہاتھ میں لے لیں اور کام کریں تو یقیناً ہمیں قوم کے پیچھے چلنا اور دست سوال دراز کرنا نہیں ہوگا ؛ بلکہ امت ہمارے پیچھے چلے گی، اور ہمیں سر آنکھوں پر رکھے گی۔

اُمت کی فکر کے مفقود ہو جانے اور سماج سے کنارہ کشی اختیار کر لینے کی وجہ سے آج مسلمانوں کی نئی نسل مغربی تہذیب کی برائیوں کو قبول کرتی جا رہی ہے اور تہذیبی ارتداد سے آگے بڑھ کر ایمانی ارتداد تک پہنچ چکی ہے، اُمت بننے کی بجائے ایک گروہ بننے کا مزاج ہمارے اندر کچھ اس طرح رچ بس گیا ہے کہ دین کے ہر چھوٹے بڑے مسئلہ کو ہم اسی عینک سے دیکھنے لگے ہیں، حد یہ ہے کہ آسمانی مصیبتوں کے وقت بھی ہم بعض اوقات گروہ بندی سے آزاد نہیں ہو پاتے۔

اُمت کی فکر سے محروم ہو جانے کا ایک پہلو یہ ہے کہ دینی تعلیم یافتہ حضرات اور عصری تعلیم یافتہ حضرات کے درمیان فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں، وہ علماء کو از کار رفتہ چیز سمجھتے ہیں، جن کی اصل جگہ 'میوزیم' ہے، اور ہم ان کو بے دین، خدانا ترس اور خواہشات میں ڈوبے ہوئے لوگ تصور کرتے ہیں ؛ حالاں کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں، جب ہمارا دین آؤٹ آف ڈیٹ نہیں ہو سکتا تو اس دین کے علماء کیسے از کار رفتہ ہو سکتے ہیں، اور نہ یہ سمجھنا درست ہے کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات سارے کے سارے یا اکثر دین بیزار اور خشیت سے محروم لوگ ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ان کے دلوں میں بھی ایمان کی روشنی موجود ہے، بہت سے لوگ جو عام لباسوں میں رہتے ہیں، آپ ان کے اندر ایسی خشیت پائیں گے کہ

خود آپ کو ان کے ورع وتقویٰ پر رشک آنے لگے گا، اس دوری کی وجہ سے ایسے حضرات جب دین کی خدمت کے لئے آگے بڑھتے ہیں تو نادانستہ طور پر انحراف کے راستہ پر پڑ جاتے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء آگے بڑھ کر اس فاصلے کو کم کریں، اپنے علم واخلاق کی تلوار سے ان کے دلوں کو فتح کریں اور انھیں اُمت کے بہترین کاموں کے لئے استعمال کریں، یہ وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے کہ جدید وقدیم کے فاصلوں کو سمیٹا جائے اور گروہ بندی کی جگہ امت پن کو فروغ دیا جائے، اس نسبت سے ہر عالم دین کو مفتی شفیع صاحبؒ کا رسالہ ''وحدت اُمت'' اور تحریک دعوت وتبلیغ کے دوسرے امیر مولانا محمد یوسفؒ صاحب کی آخری تقریر کو ضرور پڑھنا چاہئے۔

تحقیق وتثبت

بقدر ضرورت دین کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے: ''**طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم**'' (سنن ابن ماجۃ، المقدمۃ، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، حدیث نمبر: ۲۲۹) یہ علماء کے لئے بھی ضروری ہے اور عوام کے لئے بھی؛ لیکن فرق یہ ہے کہ عوام کے لئے تقلیدی علم کافی ہے کہ وہ کسی عالم سے پوچھ کر عمل کرلیں، کسی کتاب میں پڑھ کر ضروری معلومات حاصل کرلیں؛ لیکن علماء کا علم تحقیقی ہونا چاہئے، اگر کسی حدیث کو سنیں اور اسے بیان کرنا ہو یا لکھنا ہو تو وہ اس حدیث کے اصل ماخذ تک پہنچیں، اس کے بارے میں محدثین کی رائے جاننے کی کوشش کریں، پھر اسے بیان کریں، کسی مسئلہ کی رہنمائی کرنی ہو تو پہلے کتابوں سے رجوع کریں، اس کے مستدل کو جاننے کی کوشش کریں، پھر لوگوں سے اسے بیان کریں، کوئی سبق آموز واقعہ ذکر کرنا ہو تو اس کا حوالہ اور ثبوت دیکھیں، پھر غور کریں کہ یہ واقعہ شریعت کے مزاج کے مطابق ہے بھی یا نہیں؟ اس کے بعد لوگوں کے سامنے اسے پیش کریں۔

ہر عالم میں اس جذبۂ تحقیق کا رہنا ضروری ہے، محدثین اور فقہاء کا ذوق یہ ہے کہ ان کے کسی بزرگ کی کتنی ہی عظمت واحترام دل میں کیوں نہ ہو؛ لیکن جب وہ ان کی کوئی بات نقل کرتے ہیں تو نقد کی کسوٹی پر کس کر اور علم کی ترازو میں تول کر، عقیدت واحترام اور حسن ظن کبھی ان کی تحقیق میں رکاوٹ نہیں بنتا تھا؛ لیکن ہمارے یہاں اب صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ عمل اور اخلاق کے معاملہ میں تو بزرگوں کا اسوہ پس پشت ڈال دیا جاتا ہے، اور تن آسانی اور تحقیق وتلاش کی کاوش سے بچنے کے لئے اپنے کسی بزرگ کے حوالہ کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے، علم کے راستہ میں یہ بہت بڑی رکاوٹ ہے اور علماء

کے لئے بے حد نقصان دہ ہے؛ اس لئے آپ یہ مزاج بنائیں کہ ہر بات کو اس کے اصل ماخذ سے دیکھا جائے اور اہل فن کے نزدیک استناد کے اعتبار سے اس کا کیا درجہ ہے؟ اس کو معلوم کیا جائے، یہ پہلو تقریر میں بھی ملحوظ ہونا چاہئے اور تحریر میں بھی، تصنیف وتالیف میں بھی اور تدریس وفتاوی میں بھی، کہ متاعِ سیم وزر کے معاملہ میں قناعت سے بڑھ کر کوئی وصف محمود نہیں اور علم وتحقیق کے راستہ میں قناعت سے بڑھ کر کوئی شئے عیب نہیں!

دعوتِ دین

جو چیز زیادہ اہم ہوتی ہے، بعض اوقات اس کی اہمیت کی وجہ سے اس کا ذکر آخر میں کیا جاتا ہے؛ اس لئے یہ حقیر سب سے آخر میں دعوت دین کا ذکر کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس امت کو ''خیر اُمت'' اس لئے بنایا ہے کہ اسے پوری انسانیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے بھیجا گیا ہے: ''**كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ**'' (آل عمران:۱۱۰) اس آیت میں مسلمین اور مؤمنین کے بجائے ''ناس'' یعنی پوری انسانیت کا ذکر کیا گیا ہے، جس میں کفار ومشرکین بھی شامل ہیں؛ بلکہ اہل علم نے لکھا ہے کہ قرآن مجید میں ''**یا أیها الناس**'' کے لفظ سے زیادہ تر مشرکین کو مخاطب کیا گیا ہے، اور امام رازی نے لکھا ہے کہ ''معروف'' سے مراد ''ایمان'' اور ''منکر'' سے مراد ''شرک'' ہے؛ اور امام رازی کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ 'معروف' کا فرد اعلیٰ 'ایمان' ہی ہوسکتا ہے اور 'منکر' کا فرد اعلیٰ 'کفر' ہی ہوسکتا ہے؛ لہٰذا اس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ مسلمانوں کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ غیر مسلموں کو ایمان کی دعوت دیں اور کفر سے بچائیں، اسی خاص ڈیوٹی کی وجہ سے وہ ''خیر امت'' ہیں۔

یہ ذمہ داری یوں تو پوری امت پر ہے؛ لیکن جس کا رتبہ جتنا بڑھا ہوا ہو، اس کی ذمہ داری اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے، اگر کسی کے پاس دو لاکھ روپے ہوں تو اس پر اسی لحاظ سے زکوۃ واجب ہوگی اور ایک کروڑ ہوں تو اسی نسبت سے واجب ہوگی، اسی طرح دعوت دین کے سلسلہ میں امت کے عوام کے مقابلہ امت کے خواص کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں اور دوسروں کے مقابلہ علماء کی ذمہ داریاں سب سے زیادہ ہیں، ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں دعوت کے وسیع مواقع ہیں؛ کیوں کہ ہمارے برادران وطن میں اللہ کی معرفت نہیں ہے؛ لیکن اللہ کی محبت ہے، دین حق کی پہچان نہیں ہے؛ لیکن دین کی عظمت ہے؛ اس لئے ان کے دلوں کو فتح کرنا آسان ہے، اور پوری اسلامی تاریخ ہمیں بتاتی

ہے کہ دنیا کے ہر خطہ میں بمقابلہ اہل کتاب کے مشرکین نے زیادہ آسانی سے اسلام کی دعوت پر لبیک کہا ہے۔

اس لئے عزیزانِ گرامی ! برادران وطن کے حقوق کو پہچانئے، کہیں اللہ کے یہاں ہم ان کے بارے میں جواب دہ نہ ہوجائیں اور کہیں رسول اللہ ﷺ کا سامنا کرنے میں ہمارے لئے شرمندگی کا سامان نہ ہو کہ نبی تو دعوت ایمان کے لئے 'طائف'' میں پتھر کھائیں اور ''احد'' میں ان کے خون کے فوارے بہہ پڑیں؛ لیکن نائبین نبی کے تلوؤں میں اس فرض کو ادا کرنے میں کبھی ایک کانٹا بھی نہ چبھے اور ان کے دل میں انسانیت کے لئے کوئی ٹیس بھی نہ پیدا ہو۔

عزیزان محترم ! ایک عرصہ کے بعد آپ سے ملاقات اور کچھ کہنے اور سننے کا موقعہ ملا؛ اس لئے اس طویل سمع خراشی کی جسارت کی گئی ہے کہ :

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ لے
پھر التفاتِ دل دوستاں رہے ، نہ رہے

یہ سیمینار جو آپ حضرات کو جمع کرنے کی ایک تقریب ہے، اس سے آپ ایک نیا عزم وحوصلہ لے کر جائیے، عزم دین کی خدمت کا، عزم اسلام کی دعوت واشاعت کا، عزم امت کو جوڑنے کا، عزم علم وتحقیق کے نئے چراغ جلانے کا اور عزم خود اعتدال کے راستہ پر رہنے اور دوسرے کو اس پر لانے کا، اور ان سب کے لئے ضروری ہے اخلاص، اللہ کی خوشنودی کا جذبہ، اللہ کے سامنے رونے اور آنسوؤں سے وضو کرنے کا مزاج، کہ اس کے بغیر پہاڑ جیسا نظر آنے والا کام رائی سے کمتر ہے اور اگر اخلاص اور جذبۂ رضاء جوئی عمل کا رفیق ہو تو رائی نظر آنے والا عمل بھی ہمالیہ سے بڑھ کر ہے، اخیر میں دعا ہے کہ بار الٰہا! آپ اپنے دین کی خدمت کے لئے ہم جیسے خطا کاروں کے یقیناً محتاج نہیں ہیں؛ لیکن ہم آپ کے محتاج ہیں کہ آپ ہمیں اپنے دین کی خدمت کے لئے قبول فرمائیں اور اپنے غلاموں میں شمار کرلیں؛ اس لئے ہم سبھوں سے زندگی کی آخری سانس تک اپنے دین کی خدمت لے لیجئے اور اپنی خوشنودی کے عمل پر ہم سب کو اس جہانِ فانی سے اٹھائیے!

ربنا تقبل منا إنک أنت السمیع العلیم ۔

● ● ●

امن اور ترقی میں مذہب کارول ☆

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين ، وعلى آله وصحبه أجمعين ۔

حضرات ! خدا نے کرۂ ارض کی اس وسیع وعریض، خوبصورت اور ہر طرح کی نعمت سے مالا مال بستی کو انسانیت کے لئے بسایا ہے، اس کائنات اور اس سے متعلق تمام چیزیں ہمہ وقت انسانیت کی خدمت میں مشغول ہیں، سورج اس کے لئے ہر دن روشنی کا انتظام کرتا ہے، زمین اس کے قدموں میں بچھی ہوئی ہے اور اس کی غذائی ضرورت کے لئے بار بار اپنے سینے کا چاک ہونا اور پامال کیا جانا قبول کرتی ہے، درختوں کا کام یہ ہے کہ مزے دار پھل اور عطر بار پھول مہیا کرنے کے علاوہ آلودہ ہواؤں کو اس کے لئے صاف کریں؛ تاکہ اسے آکسیجن کی کمی کا سامنا نہ کرنا پڑے، بادل سمندر سے کھارے پانی کا ڈول بھر بھر کر اسے صاف کرتا اور شیریں بناتا ہے اور کھیتوں اور آبادیوں تک باران رحمت پہنچاتا ہے، سمندر کی متلاطم موجیں نہ جانے کتنی ساری آلودگیوں کو ہضم کرتی ہیں اور ان کی زہرناکی سے انسان کو محفوظ رکھتی ہیں، ہوائیں ہر وقت اس کے مفاد کے لئے دوڑ بھاگ میں لگی ہوئی ہے اور دنیا میں جتنے جاندار ہیں، وہ سب کسی نہ کسی پہلو سے اس کی خدمت میں مصروف ہیں، یہاں تک کہ جن جانوروں کی درندگی انسان کو لرزاں وترساں رکھتی ہیں، ان کا وجود بھی کسی نہ کسی پہلو سے انسان کے لئے فائدہ مند ونفع بخش ہی ہے، غرض کہ پوری کائنات انسان کی خدمت اور اس کے لئے عیش وراحت کی فراہمی میں مشغول ہے؛ اسی لئے قرآن کا تصور یہ ہے کہ کائنات انسان کا معبود نہیں ہے؛ بلکہ اس کی خادم ہے: **''وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعاً مِّنْهُ''** ۔ **(الجاثية: ۱۳)**

لیکن دو چیزیں ایسی ہیں جو انسان کے لئے بے حد ضروری ہیں، عیش وعشرت کے جتنے بھی وسائل حاصل ہو جائیں، اگر یہ دو چیزیں اسے میسر نہ ہوں تو اس کی زندگی بے سکون اور اس کی آرزوئیں ناتمام رہتی ہیں: امن اور ترقی ــــ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ پر اپنے احسانات کا ذکر

☆ کلیدی خطبہ جو ۲۵ سالہ جشن انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو دہلی کے ایک سیمینار منعقدہ علی گڑھ میں پیش کیا گیا۔

کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہیں اس لئے بھی رب کعبہ کی عبادت کرنی چاہئے کہ اس نے عرب کے صحرا میں غذائی ضرورت اور کسی حکومت اور لا اینڈ آرڈر کا انتظام نہ ہونے کے باوجود امن کا انتظام فرمایا ہے ''فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ، الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ'' (قریش: ۳-۴) خوف و دہشت سے حفاظت کا تعلق امن سے ہے اور غذائی اشیاء کی فراہمی کا تعلق ترقی سے ہے، زندگی کے لئے مطلوب ساری سہولتیں اللہ تعالیٰ کا خصوصی عطیہ ہیں، مگر یہ دونوں نعمتیں وہ ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے ارادہ اور کوششوں سے متعلق رکھا ہے اور انسان کو ایسی بصیرت اور صلاحیت عطا کی گئی ہے کہ اگر اس کی کوشش صحیح سمت میں ہو تو وہ ان کو حاصل کر سکتا ہے۔

حضرات! حقیقت یہ ہے کہ امن کے قائم ہونے کا تعلق قیام عدل سے ہے، عدل کی تفصیل یہ ہے کہ زندگی گذارنے کے تین طریقے ہو سکتے ہیں، جن کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے: عدل، احسان اور ظلم، عدل کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کو اس کا حق پورا پورا دے دیا جائے اور خود اپنے حق سے زیادہ نہ لیا جائے، احسان یہ ہے کہ دوسرے کو اس کا حق اس کے حصہ سے بڑھ کر دیا جائے اور خود اپنے حصہ سے کم لیا جائے یا اپنا حصہ نہیں لیا جائے، قرآن مجید نے ان ہی دونوں طریقہ کار کو درست اور قابل قبول قرار دیا ہے: ''إِنَّ اللهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ وَإِيْتَاءِ ذِي الْقُرْبَى وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ'' (النحل: ۹۰) لیکن آئیڈیل طریقہ یہ ہے کہ انسان 'احسان' سے کام لے، جس کو بندے کے حقوق کے معاملہ میں 'ایثار' کے لفظ سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے؛ چنانچہ قرآن مجید میں جگہ جگہ احسان کی تعریف کی گئی ہے، فرمایا گیا: اللہ احسان کرنے والے لوگوں کو پسند فرماتے ہیں ''وَاللهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ'' (آلِ عمران: ۱۳۴) یہ بھی فرمایا گیا کہ جو لوگ احسان کا رویہ اختیار کریں، اللہ تعالیٰ ان کو بہتر بدلہ اور انعام سے محروم نہیں کریں گے: ''إِنَّ اللهَ لاَ يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ'' (التوبۃ: ۱۲۰) اس کے بالمقابل ''ظلم'' اسلام کی نظر میں بدترین گناہ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ظالم کامیاب نہیں ہو سکتا، ناکامی و نامرادی ہی اس کا حصہ ہے: ''إِنَّهُ لاَ يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ'' (الانعام: ۲۱) ظالموں کا انجام ہلاکت و بربادی ہے: ''هَلْ يُهْلَكُ إِلاَّ الْقَوْمُ الظَّالِمُونَ'' (الانعام: ۴۷) اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں فرماتے: ''وَاللهُ لاَ يُحِبُّ الظَّالِمِيْنَ'' (آلِ عمران: ۵۷) قرآن پاک میں دو سو سے زائد مقامات پر مختلف جہتوں سے ظلم کی اور ظالموں کی مذمت فرمائی گئی ہے اور کم و بیش ایک درجن مقامات پر عدل کا اور تقریباً دو درجن مقامات پر احسان کا حکم دیا گیا ہے یا اس کی تحسین کی گئی ہے، جب معاشرہ میں عدل قائم ہوگا، لوگوں میں احسان کا جذبہ پیدا ہوگا

اور "ظلم" کرنے والے ہاتھ تھام لئے جائیں گے تو یقیناً وہ معاشرہ امن کی دولت سے بہرہ ور ہوگا۔

حضرات گرامی ! اسلام نے مختلف جہتوں سے ایسی قانونی تدبیر کی ہے، جو امن قائم کرنے میں معاون ہو اور ظلم ونفرت کو روکنے کا ذریعہ بن سکے، عام طور پر جو چیز انسان کو ظلم وزیادتی پر آمادہ کرتی ہے، وہ ایک گروہ کا دوسرے گروہ کے مقابلہ احساس برتری میں مبتلا ہونا اور دوسرے کو اپنے مقابلہ میں حقیر سمجھنا ہے، مختلف ادوار میں دنیا کی مختلف قومیں اس مرض کا شکار رہی ہیں، خود ہندوستان میں ذات پات کی بنیاد پر آبادی کی اکثریت ہزاروں سال بدترین ظلم وزیادتی کا شکار رہی ہے اور آج بھی اس کے اثرات باقی ہیں، جرمنی میں نازیوں کا احساس تفوق اور دوسری قوموں کے ساتھ ان کا سلوک سب کو معلوم ہے، بیس بائیس سال پہلے تک جنوبی افریقہ اور بعض دوسرے افریقی ممالک بدترین نسلی امتیاز کا شکار تھے، جن کی داستانیں سن کر کلیجہ کانپ اُٹھتا ہے، شاید جور وظلم کے ان واقعات کو دیکھ کر درندے بھی شرمسار ہوئے ہوں گے، آج بھی دنیا میں نسل پرستی پر مبنی ایک مملکت "اسرائیل" کی شکل میں موجود ہے، جو صرف حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد کو ارض فلسطین کا حقدار سمجھتی ہے، حد یہ ہے کہ اسی اُصول پر وہاں کی عدالتیں فیصلے کرتی ہیں، ماضی بعید میں اگر روم وایران اور بعض دیگر ممالک کی تاریخ دیکھی جائے تو نسلی تفریق کے اس تصور نے جس ظلم وجور کو جنم دیا تھا، اس کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

قرآن مجید نے بنیادی طور پر اس فاسد فکر کی نفی کی ہے اور انسانی وحدت کا تصور پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، اس لئے نسلی بنیاد پر نہ کوئی انسان بالاتر ہے اور نہ کوئی کمتر :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْراً وَنِسَاء ۔ (النساء:۱)

اور یہ کہ ہر انسان بحیثیت انسان قابل تکریم واحترام ہے "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْ آدَمَ" (بنی اسرائیل:۷۰) ـــــ اسلام کا بنیادی تصور یہ ہے کہ فضیلت وشرافت کا معیار اکتسابی چیزیں ہیں نہ کہ اتفاقی چیزیں، یعنی انسان کا عمل، اس کی بہتر کوششیں، اس کے اچھے کارنامے اور اس کے بلند اخلاق وجہ فضیلت ہیں، نہ کہ یہ بات کہ وہ اتفاق سے کسی خاندان، کسی نسل یا کسی علاقہ میں پیدا ہوگیا، جس میں

خوداس کے ارادہ واختیار اور جدوجہد کو کوئی دخل نہیں، دنیا میں جس وقت اسلام آیا، اس وقت دنیا کی اکثر قوموں کا حال یہی تھا کہ انھوں نے اتفاقات کو کسی گروہ کے باعزت ہونے کا معیار بنالیا تھا، جیسے اس کا عربی النسل ہونا، ایرانی ہونا، بادشاہ کے خاندان سے تعلق رکھنا، کسی خاص زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنانا وغیرہ، اسلام اس سوچ کو بدلا اور اعلان کیا: ''إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللهِ أَتْقَاكُمْ'' (الحجرات:۱۳) یہ ایک انقلابی فکر تھی جو اسلام نے انسانیت کو عطا کی اور آج دنیا میں جمہوریت اور مساوات کی جو باتیں کہی جارہی ہیں، وہ دراصل اس صدائے حق کی بازگشت ہے۔

حضرات ! ذات پات کی تفریق کے علاوہ دوسری چیز جو عدل وانصاف کو مجروح کرتی ہے اور جس سے بعض اوقات معاشرہ کا امن پارہ پارہ ہوجاتا ہے، وہ ہے مذہب کو اختلاف اور نفرت کی بنیاد بنانا، اور ایک مذہب سے تعلق رکھنے والوں کا دوسرے مذہب کے ماننے والوں سے بیر رکھنا —— اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دین حق تو ایک ہی ہے، جس کی بنیاد توحید پر قائم ہے، یہی دین ہے جس کی ہر عہد میں اللہ کی طرف سے آنے والے پیغمبروں نے دعوت دی ہے؛ لیکن دین کے معاملہ میں تشدد درست نہیں، یعنی ایک شخص دوسرے کو اس بات پر مجبور نہیں کرسکتا کہ وہ اس کے دین کو قبول کرلے ''لاَ إِكْرَاهَ فِيْ الدِّيْنِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ'' (البقرة:۲۵۶) بلکہ یہ بھی درست نہیں کہ کسی شخص کے ساتھ حسن سلوک کرنے کو اس لئے روک دیا جائے کہ وہ مسلمان نہیں ہوتا، اسی پس منظر میں قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی :

لَّيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَـكِنَّ اللهَ يَهْدِيْ مَن يَشَاءُ وَمَا تُنفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلأَنفُسِكُمْ وَمَا تُنفِقُوْنَ إِلاَّ ابْتِغَاء وَجْهِ اللهِ وَمَا تُنفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لاَ تُظْلَمُوْنَ ۔ (البقرة:۲۷۲)

ان لوگوں کی ہدایت آپ کے ذمہ نہیں ہے، اللہ جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور تم (ان کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہوئے) جو کچھ مال خرچ کرتے ہو، وہ اپنے ہی لئے، اور خرچ نہیں کرتے ہو؛ مگر اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں، اور جو بھی خرچ کروگے تم کو پورا پورا دیا جائے گا (یعنی اس کا اجر ملے گا) اور تم پر ظلم نہیں ہوگا۔

مذہب کی بنیاد پر کسی کی مال و جان کو نشانہ بنانا قطعاً جائز نہیں ہے، اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے ایک اُصولی بات فرمائی ہے کہ غیر مسلم بھائیوں کے خون ہمارے خون کی طرح اور ان کا مال ہمارے مال کی طرح ہے ''**دماؤهم كدمائنا واموالهم كاموالنا**'' (نصب الرایہ: ۳۶۹/۴) یعنی جو حرمت کسی مسلمان کی جان و مال کی ہے، وہی غیر مسلموں کی جان مال کی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے کسی ''معاہد'' یعنی ایسے غیر مسلم کو قتل کر دیا، جس سے امن و آشتی کے ساتھ ایک ساتھ رہنے کا معاہدہ تھا، وہ جنت کی خوشبو سے بھی محروم رہے گا ''**من قتل معاهداً لم يرح رائحة الجنة**'' (بخاری عن عبداللہ بن عمرؓ، حدیث نمبر: ۳۱۶۶) اسی طرح جیسے کسی مسلمان کی عزت وآبرو کا احترام واجب ہے، اسی طرح غیر مسلم کی عزت وآبرو کی بھی رعایت واجب ہے: ''**يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَومٌ مِّن قَوْمٍ**'' (الحجرات: ۱۱) اس بات کو بھی ضروری قرار دیا گیا کہ دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام کیا جائے؛ چنانچہ غیر مسلم جن دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرتے ہیں، ان کو برا بھلا کہنے سے منع فرمایا گیا: ''**لَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللهِ**'' (الانعام: ۱۰۸) کسی بھی قوم کی عبادت گاہ کے منہدم کرنے کو منع کیا گیا ہے؛ چنانچہ قرآن مجید نے جہاں عبادت گاہوں کے منہدم کرنے کی مذمت کی ہے، وہاں مسلمانوں کی مسجدوں سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کے گرجوں کا ذکر فرمایا ہے، (الحج: ۴۰) اس سے ظاہر ہے کہ عبادت گاہیں — خواہ کسی مذہب کی ہوں — ان کا احترام ملحوظ رکھنا چاہئے، رسول اللہ ﷺ نے بنو نجران سے جو معاہدہ کیا، اس میں یہ صراحت فرمائی کہ ان کی عبادت گاہیں منہدم نہیں کی جائیں گی اور نہ مذہبی اُمور میں کوئی مداخلت کی جائے گی، (ابوداود، حدیث نمبر: ۳۰۴۱) عہد صدیقی میں حضرت خالد بن ولید ﷺ کے ذریعہ حیرہ کا علاقہ فتح ہوا، اہل حیرہ کے لئے انھوں نے جو دستاویز تیار فرمائی، اس میں بھی یہ صراحت موجود ہے کہ ان کے چرچ اور گرجے منہدم نہیں کئے جائیں گے، امام ابویوسفؒ نے اسے نقل کیا ہے۔ (موسوعۃ الخراج: ۱۴۳)

اسی طرح قرآن نے ایک کثیر مذہبی معاشرہ کے لئے جو نقشہ پیش کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ہر مذہبی گروہ اپنے عقیدہ کے مطابق عمل کرے اور دوسروں کے معاملہ میں دخل نہ دے؛ چنانچہ قرآن نے مشرکین مکہ کے سامنے صلح کا جو فارمولہ پیش کیا، وہ یہی تھا: ''**لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ**'' (الکافرون: ۶) ایک اور موقع پر ارشاد ہے: ''**لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ**'' (الشوریٰ: ۱۵) ''ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال'' رسول اللہ ﷺ کی رواداری کا حال یہ تھا کہ نجران کے عیسائیوں کا وفد بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے ان کو ان کے مذہب کے مطابق اور ان کے قبلہ

کی طرف رُخ کر کے مسجد نبوی ﷺ میں نماز ادا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی ، (احکام الذمۃ: ۱/۳۱۶)
فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی مسلمان کی بیوی یہودی اور عیسائی ہو اور اس کے عقیدہ کے مطابق کسی خاص دن روزہ رکھنا واجب ہو تو مسلمان شوہر اسے روزہ رکھنے سے روک نہیں سکتا ہے، گو اس کی وجہ سے وہ جنسی استفادہ کے حق سے محروم ہوتا ہو، (حوالۂ سابق) اسی طرح اگر وہ اپنے عقیدہ کے مطابق صلیب پہنے یا مسلمان شوہر کے گھر میں صلیب رکھے تو اسے یہ حق ہے، شوہر اس کو روک نہیں سکتا، (حوالۂ سابق) غرض کہ مذہب کے اختلاف کو نفرت، ظلم و زیادتی اور سلوک و رویہ میں تشدد کا ذریعہ بنانے کی اجازت نہیں ہے۔

حضرات ! امن وامان کو نقصان پہنچانے والی تیسری چیز معاشی نابرابری اور کسی گروہ کی اقتصادی محرومی بھی ہوتی ہے، آج ہمارے ملک میں نکسلائٹ تحریک کے فروغ پانے کا بنیادی سبب یہی ہے، سرمایہ دارانہ نظام دولت کو چند ہاتھوں میں مرتکز کر کے رکھ دیتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دولت منداور دولت مند بنتا چلا جاتا ہے اور غریب غریب تر ہوتا جاتا ہے، اسلام اس بات کا قائل تو نہیں ہے کہ جبراً سب کو معاشی اعتبار سے برابر کر دیا جائے؛ کیوں کہ یہ بات فطرت کے خلاف ہے، اسی غیر فطری طرز عمل کی وجہ سے اشتراکی نظام نے دم توڑ دیا؛ لیکن یہ ضروری ہے کہ دولت کی منصفانہ تقسیم ہو، اس کے ارتکاز کو روکا جائے اور سماج کے تمام لوگوں کی بنیادی ضروریات ضرور پوری کی جائیں، اسی لئے اسلام نے زکوٰۃ واجب قرار دی، قرآن مجید نے کہا کہ دولت مندوں کے مال میں ناداروں اور اپنی ناداری کی وجہ سے دستِ سوال پھیلانے والوں کا حق ہے: ''وَالَّذِيْنَ فِيْٓ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ، لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ''۔ (المعارج: ۲۴-۲۵)

مزدوروں کے حقوق کو خاص طور پر اہمیت دی گئی، ایسی اُجرت مقرر کرنے کا حکم دیا گیا، جس میں مزدور قریب قریب آجر کے معیار پر اپنی بنیادی ضرورتوں کو پوری کر سکیں، جیسا کہ حضور ﷺ نے غلاموں کے بارے میں فرمایا :

> وہ تمہارے بھائی ہیں، جن کو خدا نے تمہارے ماتحت رکھا ہے؛ لہٰذا خدا نے جس کے ماتحت اس کے بھائی کو کیا ہو، اس کو چاہئے کہ اس کو وہی کھلائے جو خود کھائے، جو خود پہنے وہی اس کو پہنائے، اس کو ایسے کام کی تکلیف نہ دے، جو اس کے لئے دشوار ہو، اور اگر ایسے کام کی ذمہ

داری سونپ ہی دے تو پھر اس کی مدد کرے۔ (بخاری، مسلم، ابوداو، ترمذی)

اس حدیث سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ مزدوروں کی اُجرت اتنی ہونی چاہئے کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات کو آجرین کے معیار پر پوری کرسکیں، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اہل وعیال کی بھی اسی سطح پر پرورش کرسکیں، حسبِ ضرورت خادم رکھ سکیں اور مکان بناسکیں، آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص ہمارا عامل (ملازم) بنے، اسے چاہئے کہ بیوی حاصل کرلے، خادم نہ ہو تو ایک خادم رکھ لے اور مکان نہ ہو تو ایک مکان حاصل کرلے۔ (ابوداود، عن مستورد بن شدادؓ)

اگر دولت کی تقسیم اس درجہ نامنصفانہ ہو کہ ایک شخص کے پاس تو اپنی دولت کا حساب بھی نہ ہو اور دوسرا شخص فاقہ مستی پر مجبور ہو تو پھر بغاوت اور نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور اس کا ضمیر اس کو للکارتا ہے کہ :

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں یہ تفصیل بھی ملتی ہے کہ مزدور سے اس کی طاقت کے بقدر ہی کام لیا جاسکتا ہے، نیز یہ تاکید کہ وقت پر اس کی اُجرت ادا کی جائے، اس کے ساتھ باعزت سلوک کیا جائے، کاروبار میں اسے پارٹنر بنانے کی کوشش کی جائے، وغیرہ، ان سب باتوں کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ معاشی اعتبار سے معاشرہ عدل پر قائم ہو، کسی گروہ کا استحصال نہ کیا جائے اور کسی طبقہ کے ساتھ ظلم نہ ہو، اسی استحصال کو روکنے کے لئے اسلامی شریعت نے سود اور ذخیرہ اندوزی کو منع کیا ہے۔

یوں تو امن و امان کو پارہ پارہ کرنے والی اور بھی باتیں ہیں؛ لیکن ذات پات کی بنیاد پر انسانیت کی تقسیم، مذہب کی بنا پر تشدد و نفرت اور معاشی نا انصافی وہ باتیں ہیں، جو زیادہ تر امن کو خاکستر کر کے رکھ دیتی ہیں، اسلام نے ان تینوں شعبوں میں ظلم و انصافی کو روکنے پر خصوصی توجہ دی ہے، — اس کے علاوہ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ علم پر کسی طبقہ کی اجارہ داری نہیں ہوسکتی، ہر شخص کو تعلیم حاصل کرنے کے یکساں مواقع فراہم ہونے چاہئیں ''**طلب العلم فریضة علی کل مسلم**'' (ابن ماجہ: ۲۲۰۴) عوام کو خود اپنے حکمراں منتخب کرنے کا حق حاصل ہونا چاہئے، اسلام میں آمریت اور ڈکٹیٹرشپ کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، اسلام عوام کو حق دیتا ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں کا احتساب کریں، ایک عام شہری کی طرح فرمانروائے مملکت کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جاسکتا ہے، اسلام یہ بھی

چاہتا ہے کہ حکمراں کے لئے صلاحیت اور اخلاق کا ایک معیار ہونا چاہئے ، نہ یہ کہ چور، رہزن ، قاتل اور زانی ۵۱ فیصد ووٹ لے کر ایوان اقتدار میں پہنچ جائیں اور عوام کے بارے میں فیصلے کرنے لگیں، ان ساری ہدایات کا مقصد سماج میں عدل کو قائم رکھنا اور عدل کے واسطہ سے امن کو قائم رکھنا ہے۔

حضرات ! جب معاشرہ میں امن قائم ہوگا، تمام لوگوں کو انسان ہونے کی حیثیت سے مساویانہ درجہ دیا جائے گا؛ انھیں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ہوگی ، دولت کی منصفانہ تقسیم ہوگی ، ہر شخص کی بنیادی ضرورتیں مہیا ہوں گی اور سیاسی اعتبار سے قوم کو آزادی حاصل ہوگی تو پھر اعتدال اور استحکام کی فضا قائم ہوگی اور اس فضاء میں ترقی کی کوششیں بارآور ہو سکیں گی۔

’ترقی‘ ایک وسیع الجہات لفظ ہے، جس کا تعلق تعلیم و تحقیق اور ٹکنالوجی سے بھی ہے، صنعت وحرفت سے بھی ہے، معیشت سے بھی ہے اور اسلام نے ترقی کی ان تمام جہتوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی ہے ؛ بلکہ ضرورت کے لحاظ سے بعض اُمور کی ترغیب دی گئی ہے اور بعض کا حکم دیا گیا ہے، آپ ﷺ نے ہر شخص کو علم حاصل کرنے کا حکم دیا، گویا آپ ﷺ نے ڈیڑھ ہزار سال پہلے ’’لازمی حق تعلیم‘‘ کا تصور دیا، آپ ﷺ نے صنعت وٹکنالوجی کی حوصلہ افزائی کی اور فرمایا جولوگ اس راہ میں آگے بڑھیں، اللہ انھیں پسند کرتے ہیں: ’’**ان الله يحب المؤمن المحترف**‘‘ (شعب الایمان، باب التوکل علی اللہ: ۱۲۳۷) آپ ﷺ نے معاشی ترقی کے لئے تگ و دو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ آدمی کو کوشش کرنی چاہئے کہ اس کے پاس دینے والا ہاتھ ہو نہ کہ لینے والا: ’’**اليد العليا خير من اليد السفلى**‘‘ (بخاری، کتاب النفقات: ۵۰۴۰) آپ ﷺ نے ہر علم نافع کی تحسین کی ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کی دُعاء فرمائی ہے اور ایسے علم کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے جو انسانیت کے لئے نفع کے بجائے نقصان کا سبب بن جائے اور اس سے پناہ چاہی ہے۔

لیکن انسانی سماج کے لئے صرف مادی ترقی کافی نہیں ؛ بلکہ سب سے بڑی ضرورت اخلاقی ترقی ہے، اگر مادی وسائل حاصل ہو جائیں ؛ لیکن انسان اخلاقی بگاڑ میں مبتلا ہو تو یہ وسائل انسانیت کو نفع پہنچانے کی بجائے نقصان پہنچ جانے کا سبب بن جاتے ہیں، آج قدم قدم پر اس کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں، طب و علاج ایک مقدس فن ہے ؛ لیکن آج اس کی حیثیت محض ایک تجارت کی ہوگئی ہے، مریضوں کا استحصال کچھ اس طرح کیا جاتا ہے کہ گویا انسان نے اپنے فریق مخالف پر فتح پالی ہے اور اب اس کا ایک ایک قطرۂ خون نچوڑ کر ہی دم لینا ہے، تعلیم ایک نہایت قابل احترام پیشہ ہے؛ لیکن

آج یہ بھی بڑی حد تک تجارت کے رنگ میں رنگ گیا ہے، استاذ اور شاگرد کا رشتہ محبت و خیر خواہی اور ایثار و بے غرضی کی بجائے کسب زر اور خود غرضی کا ہوتا جا رہا ہے، سائنس و ٹکنالوجی کی قوت کو ایسے ہتھیاروں کی تیاری پر استعمال کیا جا رہا ہے، جو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ انسانوں کو ہلاک کر سکیں، پیداوار کو اس لئے ضائع کر دیا جاتا ہے کہ اشیاء ضروریہ کی قیمتیں کم نہ ہو جائیں اور سرمایہ داروں کا نفع متاثر نہ ہو جائے، اعلیٰ ترین تعلیم یافتہ لوگ اور بلند ترین عہدوں پر فائز شخصیتیں بھی ایسے کرپشن میں مبتلا ہیں، جنھیں سن کر شرم آتی ہے، مگر افسوس کہ ملک وقوم کے غداروں کو کوئی شرمساری نہیں، ان کی بھوک اس درجہ بڑھی ہوئی ہے اور ان کی حرص ایسی اتھاہ ہے کہ شاید ہفت اقلیم بھی ان کے پیٹ نہ بھر سکے، یہ سب اس بات کا نتیجہ ہے کہ صرف مادی ترقی کو ترقی سمجھ لیا گیا ہے، ترقی کا پیمانہ صرف مادی وسائل میں اضافہ کو بنالیا گیا ہے، انسانیت، ایثار و بے غرضی، بھلائی کا جذبہ، انسانی ہمدردی، فرض شناسی اور اخلاقی قدروں کو ترقی کے تصور سے باہر کر دیا گیا ہے؛ حالاں کہ یہی ترقی اصل ترقی ہے، اگر ایک سماج معاشی اعتبار سے کم درجہ ہو، تعلیم میں بھی اس کی ترقی کم ہو؛ لیکن اخلاق کی دولت سے مالا مال ہو تو وہ سماج ایک پُرامن سماج ہوگا، وہ معاشرہ ایسا معاشرہ ہوگا، جس میں سارے لوگ قلبی سکون اور طمانینت کے ساتھ زندگی گزار سکیں گے، نیز جو معاشرہ اس سے محروم ہو تو وہ دولت کی فراوانی، مادی وسائل کی بہتات اور علم کی حصول یابی کے باوجود ایک ایسا معاشرہ ہوگا، جس میں اضطراب ہوگا، سکون سے محرومی ہوگی، ایک دوسرے کے تئیں بے اطمینانی ہوگی، رقابت اور حسد کا جذبہ ہوگا اور حرص کی آگ بجھائے نہ بجھ سکے گی، علامہ اقبالؒ نے بندۂ مومن کے لئے کہا تھا :

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

انسان کی اخلاقی ترقی میں اگرچہ انسانی فطرت کا بھی حصہ ہے، تعلیم و تربیت کا بھی اور ماحول کا بھی؛ لیکن اس سلسلہ میں سب سے اہم رول عقیدہ و مذہب کا ہے؛ کیوں کہ مذہب بنیادی طور پر انسانی سوچ کو درست کرتا ہے، دل کی دنیا کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے اور اسی سے انسان کا پورا رویہ متعلق ہوتا ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا ہے :

ان فی الجسد لمضغة ، اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت الجسد فسد کله ، ألا وهی القلب ۔ (مسلم، کتاب المساقاة: ۱۰۷)

انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکرا ہے، جب وہ درست ہوتا ہے
تو اس کا پورا وجود درست ہوتا ہے، اور جب اس میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے
تو انسان کے پورے وجود میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ قلب ہے۔

حضرات ! دنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں، اگر چہ ان کی بعض تعلیمات میں اختلاف پایا جاتا ہے؛ لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ انسان کا اصل جوہر اس کے اخلاق ہے اور اخلاق کی بنیاد بنی نوع انسان کے ساتھ حسن سلوک اور بہتر برتاؤ ہے؛ اس لئے مادی ترقی اور معاشی تگ ودو کے اس عہد میں سب سے زیادہ جس ترقی کی ضرورت ہے، وہ ہے انسان کی اخلاقی ترقی، اور جس چیز نے انسانی معاشرہ کو بے سکون کر دیا ہے، وہ ہے انسانوں کا انسانیت سے محروم ہو جانا؛ اس لئے مذہبی قائدین کا فریضہ ہے کہ وہ آگے بڑھیں، سماج کو اخلاق اور انسانیت کی طرف بلائیں اور ایک ایسے معاشرہ کو فروغ دینے کی کوشش کریں، جو محبت اور پیار پر مبنی ہو، جس میں لوگوں کی سوچ بہتر ہو، جس میں ہر انسان کے سینے میں انسانوں کے لئے تڑپنے والا دل ہو، جو انسانیت کے لئے خیر خواہی اور بھلائی کو اپنی منزلِ مقصود بناتا ہو، جو دوسروں کے لئے وہی پسند کرتا ہو، جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، اس طرح ایک ایسا سماج فروغ پا سکے گا جس میں عدل وانصاف ہو، امن ہو، مادی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانیت زندہ ہو اور اخلاقی بلندی لوگوں کے لئے عزت وشرافت کا معیار ہو، خدا کرے کہ یہ پروگرام اس سوچ کو اُبھارنے اور اس فکر کو پیدا کرنے میں مدد ومعاون ثابت ہو اور ہمارا دیش نہ صرف اپنی سائنسی صلاحیت اور معاشی قوت کے اعتبار سے سپر پاور بنے؛ بلکہ وہ اخلاق وانسانیت کے لحاظ سے بھی سپر پاور بن جائے، کہ :

فرشتوں سے بڑھ کر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیاد

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين ۔

● ● ●

ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی ترقی ☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلىٰ آله وأصحابه أجمعين ، ومن تبعهم بإحسان إلىٰ يوم الدين ، أما بعد۔

جناب صدر، بزرگانِ محترم، علماء کرام اور دانشورانِ ذی احترام! اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے قیام پر ۲۰ رسال کا عرصہ مکمل ہورہا ہے، اس عرصہ میں اس نے ۱۹ رعالمی فقہی سیمینار کئے ہیں، جن میں تقریباً ڈیڑھ سو جدید مسائل پر فقہی نقطۂ نظر سے بحث ہوئی ہے اور تجاویز منظور کی گئی ہیں، ۲۳ رورکشاپ، توسیعی خطبات اور تربیتی پروگرام رکھے گئے ہیں، عمومی طور پر ان کا نفع محسوس کیا گیا ہے، ۸۶ رکتابیں اُردو، عربی، انگریزی، ہندی، فارسی، ملیالم، تلگو، بنگلہ اور گجراتی وغیرہ میں شائع کی گئی ہیں اور یہ سب علمی و تحقیقی موضوعات پر ہیں، سب سے اہم بات یہ ہے کہ اکیڈمی نے افراد سازی اور مردم گری پر اول دن سے توجہ دی ہے اور یہ اکیڈمی ہی کی کاوشوں کا اثر ہے کہ ملک میں آج درجنوں نوجوان فضلاء اہم فقہی موضوعات اور نئے مسائل پر تحقیقی کام کررہے ہیں۔

موجودہ سیمینار بھی اکیڈمی کی ایسی ہی کاوشوں کا ایک حصہ ہے، اصطلاحی اعتبار سے تو فقہی موضوعات میں سے نہیں، مگر وسیع تر مفہوم میں ''فقہ الحیاۃ'' کے موضوع سے مربوط ہے؛ کیوں کہ معاش کے بغیر انسانی زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا؛ اسی لئے اسلام نے کسبِ معاش کی ترغیب دی ہے اور اس کو بعض دوسرے مذاہب کی طرح تقویٰ اور خدا پرستی کے مغائر قرار نہیں دیا۔

معیشت کے سلسلہ میں اگر اسلام کے بنیادی تصور کو واضح کیا جائے تو انھیں چند نکات میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے :

☆ ''ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی ترقی'' کے موضوع پر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے زیر اہتمام منعقدہ سیمینار: ۲۴-۲۵ راکتوبر ۲۰۰۹ء کا کلیدی خطبہ۔

(الف) زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح معیشت کے بارے میں بھی اسلامی تعلیمات اعتدال پر مبنی ہیں، اسلام نے مال کو ''خیر'' (البقرۃ:۲۱۵) اور ''فضل الٰہی'' (الجمعہ:۱۰) سے تعبیر کیا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ مال کے حقوق ادا کرتے ہوئے اسے حاصل کرنا اسلام کی نظر میں کوئی مذموم بات نہیں ہے؛ بلکہ مباح اور بعض حالات میں واجب ہے، قرآن مجید میں ۳۲؍مواقع پر تو اُسلوب وتعبیر کے قدرے فرق کے ساتھ صراحتاً زکوٰۃ دینے کی تلقین کی گئی ہے اور صرف ایک آیت میں زکوٰۃ لینے کا ذکر فرمایا گیا ہے، یہ اس بات کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ قرآن چاہتا ہے کہ اُمت میں زکوٰۃ دینے والے مرفہ الحال افراد زیادہ ہوں اور زکوٰۃ لینے والے تنگ دست حضرات کم ہوں، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے: ''**الید العلیا خیر من الید السفلیٰ**'' (صحیح البخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب لاصدقۃ إلا عن ظہر غنی، حدیث نمبر:۱۳۶۱) سے تعبیر فرمایا ہے اور نماز کے بعد کسب حلال کو اہم ترین فریضہ قرار دیا ہے: ''**کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ**'' اس لئے مسلمانوں کی معاشی ترقی کے سلسلہ میں غور کرنا، اس مسئلہ کے لئے منصوبہ بندی کرنا اور اُمت کے پسماندہ لوگوں کو معاشی ترقی کے اعتبار سے اوپر اُٹھانے کی کوشش کرنا ایک مستحسن عمل اور اجتماعی فریضہ ہے۔

(ب) معیشت کے سلسلہ میں اسلام کے بنیادی تصورات میں سے یہ بھی ہے کہ کسب وصَرف یعنی مال کا حاصل کرنا اور اس کا خرچ کرنا اس طور پر ہو کہ وہ افراد اور سماج کے لئے نفع بخش ہو، نقصان دہ نہ ہو؛ اسی لئے قمار کو منع کیا گیا کہ اس کی وجہ سے کسی معقول سبب کے بغیر بہت سے لوگوں کی دولت ضائع ہوجاتی ہے اور انسان کے اندر بغیر محنت کے دوسروں کا مال ہڑپ لینے کا مزاج پیدا ہوتا ہے، ایسی چیزوں کی تجارت سے منع کیا گیا جو لوگوں کے لئے نقصان دہ ہو، جیسے: منشیات، تجارت میں احتکار سے منع کیا گیا؛ کیوں کہ ذخیرہ اندوزی کا عمل ایک شخص کو فائدہ پہنچاتا ہے اور پورے سماج کو نقصان، اسی طرح خرچ کرنے میں بھی فرد اور سماج کے نفع ونقصان کو ملحوظ رکھا گیا، فضول خرچی کی ممانعت کی گئی؛ کیوں کہ اس سے قومیں معاشی پسماندگی میں مبتلا ہوتی ہیں اور تعلیم، صحت اور دوسرے مفید کاموں میں خرچ نہیں کر پاتی ہیں۔

(ج) اسلام میں اس بات کو بڑی اہمیت دی گئی کہ دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہ رہ جائے؛ بلکہ وہ زیادہ سے زیادہ تقسیم ہو اور گردش میں رہے:

مَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ

وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْلَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنكُمْ۔ (الحشر:۷)

چنانچہ قدرتی وسائل اگر شخصی زمین میں بھی دریافت ہوں تو ان کا معتد بہ حصہ بیت المال کا حق قرار دیا گیا؛ تاکہ تمام لوگ اس سے فائدہ اُٹھا سکیں، میراث کا مکمل نظام مقرر ہوا، زکوٰۃ وعشر کو واجب قرار دیا گیا، وغیرہ —— غرض کہ شریعت میں یہ بات پسندیدہ نہیں ہے کہ سماج میں دولت اوراس کے وسائل چند ہاتھوں میں مرتکز ہوکر رہ جائیں۔

(د) اسلام میں نفع کا فطری تصور ہے؛ اسی لئے سود کو حرام قرار دیا گیا، سود ایک غیر فطری چیز ہے؛ کیوں کہ خود پیسوں سے پیسے پیدا نہیں ہوسکتے اور سود خوار یہ فرض کر کے نفع وصول کرتا ہے کہ اس کے پیسوں سے لامحالہ پیسوں میں اضافہ ہوگا؛ اسی طرح اسلام میں انسانی محنت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے؛ کیوں کہ فطری اُصول یہ ہے کہ جب تک مال کے ساتھ انسانی محنت کی شمولیت نہ ہو، وہ نفع آور نہیں ہوتا، اسی اُصول پر اسلام میں استثمار کے طریقوں میں مضاربت اور مزارعت شامل ہے، مضاربت میں ایک شخص کا سرمایہ ہوتا ہے اور دوسرے کی محنت اور مزارعت میں ایک شخص کی زمین ہوتی ہے اور دوسرے کی محنت، دونوں صورتوں میں یہ ضروری ہے کہ فریقین کی رضامندی ہو اور کہ محنت کار کے نفع کا تناسب زیادہ رکھا جائے۔

اسلام کے نظام معیشت میں —— جیسا کہ عرض کیا گیا —— بلکہ پورے نظام حیات میں اس بات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے کہ کوئی ایسا عمل نہیں ہونا چاہئے، جو فطرت سے بغاوت پر مبنی ہو؛ اسی لئے تلقی جلب، بیع حاضر للبادی، تناجش اور احتکار وغیرہ کو منع کیا گیا؛ کیوں کہ ان تمام صورتوں میں قیمتوں میں غیر فطری اُتار چڑھاؤ پیدا کیا جاتا ہے، آج کل تشہیری وسائل **(Advertising)** کے ذریعہ مصنوعی طور پر چیزوں کی طلب بڑھائی جاتی ہے، یہ بھی اسلام کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے تجارت میں جھوٹ بولنے اور دھوکہ دینے سے منع فرمایا ہے اور کسی چیز کے فائدہ کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنا اوراس کے نقصانات کے پہلو پر پردہ ڈالنا بھی جھوٹ میں داخل ہے، جس کا زبردست مظاہرہ موجودہ دور میں اشتہارات کے ذریعہ ہوتا رہتا ہے۔

اس عہد میں اسلام کے مقابلے میں دو بڑے معاشی نظام وجود میں آئے، ایک: اشتراکیت، جس نے ستر سالہ تجربہ کے بعد اپنی جائے پیدائش ہی میں دم توڑ دیا اور جہاں اب بھی باقی ہے وہاں

بھی اس نے اپنے بعض بنیادی تصورات سے سبکدوشی قبول کر لی ہے؛ اشتراکیت کی بنیاد دو نظریات پر تھی: معاشی مساوات اور اجتماعی ملکیت، اور یہ دونوں ہی باتیں قانون فطرت کے خلاف ہیں، خدا نے انسان کے اندر صلاحیتوں کا فرق رکھا ہے اور معاشی ترقی میں انسان کی صلاحیت اور لیاقت کا بڑا دخل ہے، اس کے باوجود ان سب کے درمیان معاشی مساوات ایک خواب تو ہوسکتا ہے، حقیقت نہیں بن سکتا، اسی طرح افراد کے اندر اپنی املاک میں محنت کرنے اور اسے ترقی دینے کا فطری جذبہ ہوتا ہے، ایسی چیز جو تنہا اس کی ملکیت نہ ہو؛ بلکہ سماج کی ملکیت ہو، اس میں محنت کا جذبہ اس درجہ نہیں پایا جاتا؛ لیکن اشتراکیت کے نمائندوں نے اجتماعی ملکیت کا تصور دیا اور انفرادی ملکیت کا انکار کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں محنت کرنے کا فطری جذبہ مفقود ہوتا گیا اور معاشری ترقی رُک گئی، اسلام کا تصور یہ ہے کہ بنیادی ضرورتیں سبھوں کو مہیا ہوں؛ لیکن یہ ضروری نہیں کہ معاشی معیار بھی سب کا ایک ہی ہو، اسی طرح اسلام انفرادی ملکیت کا قائل ہے؛ لیکن افراد پر اس بات کو واجب قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے مال میں سماج کا حق محسوس کریں، نیز شریعت اسلامی میں زیادہ تر قدرتی وسائل کو حکومت کی ملکیت قرار دیا گیا ہے؛ تا کہ اس کا نفع زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔

اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام بھی اس وقت موت و زیست کی کیفیت میں ہے؛ کیوں کہ اس نظام میں افراد کو ایسا بے لگام بنا دیا ہے کہ ان کے لئے کوئی اخلاقی سرحد نہیں ہے، سرمایہ دارانہ نظام کی سب سے بڑی خرابی سود اور قمار کی اجازت ہے؛ کیوں کہ یہ نفع حاصل کرنے کے غیر فطری طریقے ہیں، اس میں مال کو مبالغہ آمیز اہمیت دی جاتی ہے اور مزدوروں کی محنت کو کوئی خاص درجہ نہیں دیا جاتا ہے، یہ نظام ذخیرہ اندوزی کی اجازت دیتا ہے؛ حالاں کہ یہ سماج کے غریب لوگوں کے ساتھ ظلم ہے، اس میں مصنوعی طور پر صارفیت کو بڑھایا جاتا ہے اور اشتہارات اور بے جا ترغیبات کے ذریعہ سماج کا مزاج بنایا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ضروریات پر قانع نہیں رکھے؛ بلکہ خواہشات کا غلام بن جائے اور اپنی صلاحیت سے زیادہ خرچ کرے؛ تا کہ سرمایہ داروں کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچے، چاہے غریب لوگ قرض اور فضول خرچی کے بوجھ سے دب کر مر ہی کیوں نہ جائیں۔

ان حالات میں خاص طور پر ضرورت ہے کہ اسلام کے معاشی نظام کو اس کی معقولیت اور منطقیت کے ساتھ دنیا کے سامنے رکھا جائے اور واضح کیا جائے کہ انسانیت کی حقیقی فلاح و بہبود

اور معاشی اعتبار سے عدل کا قائم کرنا اس کے بغیر ممکن نہیں۔

حضرات ! ہندوستان ایک ایسا ملک ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ قدرتی اور افرادی وسائل سے نوازا ہے، تقریباً تمام ہی قدرتی وسائل اس ملک میں موجود ہیں اور افرادی وسائل کا حال یہ ہے کہ ایشیاء، یورپ اور امریکہ میں بے شمار ہندوستانی ماہرین اور مزدور کام کر رہے ہیں اور ان کی خدمت کو ہر جگہ تحسین کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، ان میں ایک اچھی خاصی تعداد مسلمانوں کی بھی ہے، مسلمان اس ملک کی دوسری سب سے بڑی اکثریت یا پہلی بڑی اقلیت ہیں اور انڈونیشیا کے بعد سب سے زیادہ مسلمان اسی ملک میں آباد ہیں، کم وبیش ایک ہزار سال تک اس ملک کے مختلف خطوں پر مسلم سلاطین کی حکومت بھی رہی ہے؛ لیکن اس وقت مسلمان یہاں انتہائی درجہ پسماندہ ہیں؛ چنانچہ ۱۹۹۹-۲۰۰۰ء کے ایک سروے کے مطابق شہری علاقوں میں 24% اور دیہاتوں میں 31% کے قریب مسلمان خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں، ایک قومی سطح کے سروے کے مطابق بیس فیصد مالدار لوگ وہ تھے جن کی فی کس آمدنی کا اوسط شہر میں =/1120 روپے ماہانہ اور دیہات میں =/615 روپے ماہانہ تھا، ایسے لوگوں کا اوسط قومی سطح پر بالترتیب 16% اور 15% ہے اور مسلمانوں میں یہ اوسط صرف 6% اور 12% ہے۔

معاش کے بنیادی طور پر تین ذرائع ہیں، تجارت، ملازمت اور صنعت —— یہ حقیقت ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کا تجارت کی طرف رجحان مسلمانوں کے دور حکومت ہی سے کم تھا، پھر آزادی کے بعد بہت سے مسلمان سرمایہ دار پڑوسی ملک کو منتقل ہوگئے اور جو یہاں رہے، فرقہ وارانہ فسادات نے ان کی کمر توڑ دی؛ کیوں کہ ان فسادات میں مسلمانوں کی تجارت اور معیشت کو خاص طور پر نشانہ بنایا جاتا تھا۔

مسلمانوں میں ملازمت کا رجحان زیادہ تھا؛ لیکن چوں کہ انگریزوں کے خلاف جدو جہد میں مسلمان پیش پیش تھے اور انگریز بھی ان کو اپنا بڑا دشمن خیال کرتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ چوں کہ حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے چھینی گئی ہے؛ اس لئے وہی ہماری حکومت کے اصل باغی ہیں اور ان کو زیر کرنا اور محروم کرنا ضروری ہے؛ اس لئے منصوبہ بند طور پر مسلمانوں کے لئے سرکاری ملازمت کے مواقع محدود کر دیئے گئے، آزادی کے بعد نقل مکانی اور اُردو زبان کی سرکاری حیثیت ختم کر دینے کی وجہ سے ملازمت میں ان کا تناسب اور کم ہوگیا، فرقہ وارانہ تعصب نے بھی مسلمانوں کو بے حد نقصان

پہنچایا، صنعتی ترقی کے لئے کثیر سرمایہ اور قانونی سہولتوں کی ضرورت ہوتی ہے؛ چنانچہ معاشی پسماندگی اور ملک کی انتظامیہ میں فرقہ پرست افسروں کے درآنے کی وجہ سے صنعت میں بھی ان کا حصہ کم سے کم تر ہوتا چلا گیا۔

اسی پس منظر میں موجودہ حالات میں ہندوستان میں مسلمانوں کی معاشی ترقی کے لئے چند اُمور پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے :

(۱) مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں سرمایہ کاری کے مواقع بہت محدود ہو گئے ہیں ؛ کیوں کہ اسلام نے سود کو حرام قرار دیا ہے اور بینک کا نظام اصلاً سود پر مبنی ہے؛ اسی لئے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد منافع حاصل کرنے کے لئے بینکوں میں اپنی رقم محفوظ نہیں کرتی ، یہی حال انشورنس کمپنیوں کا ہے کہ سود و قمار پر مشتمل ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کا دین دار طبقہ اختیاری طور پر انشورنس سے استفادہ نہیں کرتا ، اسٹاک ایکسچینج میں گو ان کے لئے گنجائش موجود ہے ؛ لیکن بہت سی کمپنیاں وہ ہیں جن کے کاروبار جواز کے دائرہ میں نہیں ہیں ؛ اس لئے وہ میچول فنڈ سے بھی استفادہ نہیں کر پاتے ؛ البتہ یہ خوش آئند بات ہے کہ بعض ایسے ادارے قائم ہو گئے ہیں جو حلال وحرام کمپنیوں کے بارے میں نشاندہی کرتے ہیں۔

ان حالات میں ہندوستان میں اسلامی مالیاتی اداروں کا قیام نہایت اہمیت کا حامل ہے ، اس سے ایک طرف سرمایہ کاروں کو حلال نفع مل سکے گا ، دوسری طرف مسلمان تاجروں اور صنعت کاروں کو شرکت ومضاربت کے اُصول پر سرمایہ حاصل ہوگا اور ممکنہ خطرات سے نبرد آزما ہونے کے لئے اسلامی تکافل سے مدد لی جائے گی ، اگر ہندوستان میں اسلامی بینک کاری شروع ہو جائے تو اُمید کی جاتی ہے کہ بہت سے مسلم ممالک کے سرمایہ کار بھی ان کے واسطہ سے یہاں اپنا سرمایہ مشغول کریں گے ؛ اس لئے اگر حکومت ہند اسلامی بینک کاری کا دروازہ کھولتی ہے تو اس سے نہ صرف مسلمانوں کی دیرینہ آرزو پوری ہوگی اور انھیں معاشی ترقی حاصل ہوگی ؛ بلکہ ملک کو بھی فائدہ پہنچے گا۔

(۲) دوسرا اہم مسئلہ مسلمانوں میں تعلیمی اوسط کو بڑھانے کا ہے، ۲۰۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق مسلمانوں میں خواندگی کا اوسط ۵۹ رفیصد اور عورتوں میں ۵۰ رفیصد ہے ؛ جب کہ ہندوؤں میں ۶۵ رفیصد اور ہندو خواتین میں ۵۳ رفیصد سے کچھ اوپر ہے ، یہ ہندوستان میں بسنے والی تمام مذہبی

اکائیوں میں سب سے کم شرح خواندگی ہے، ورنہ جین کمیونٹی میں عام شرح خواندگی ۹۴ رفیصد اور خواتین میں ۹۱ رفیصد کے قریب ہے، یہاں تک کہ بودھ فرقہ میں بھی جو پسماندہ ترین سمجھے جاتے ہیں، شرح خواندگی ۷۳ رفیصد ہے۔

۲۰۰۰ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۵ سال اور اس سے زیادہ عمر کے مسلمانوں میں تعلیم کا تناسب پرائمری سطح تک 25.40 فیصد، مڈل میں 13.86 فیصد، سکنڈری میں 7.78 فیصد، ہائر سکنڈری میں 3.43 فیصد اور گریجویشن اور اس سے اوپر 2.52 فیصد ہے، مسلمانوں میں اسکول جانے والے بچوں کی تعداد 61.9 فیصد ہے، جب کہ اسکول جانے والے بچوں کی قومی شرح 72 فیصد ہے، چھ تا چودہ سال کی عمر میں تعلیمی سلسلہ منقطع کرنے والے بچوں کا اوسط مسلمان سماج میں 7 فیصد ہے؛ جب کہ قومی سطح پر یہ تناسب 4.8 فیصد ہے، اگرچہ گزشتہ دو دہائیوں سے مسلمانوں میں تعلیمی رجحان بڑھا ہے اور جنوبی ہند کی ریاستوں میں مسلمانوں نے اپنے تعلیمی ادارے بھی بہ کثرت قائم کئے ہیں، مگر اب بھی تعلیم میں ہم کافی پسماندہ ہیں۔

یوں تو ہمیشہ سے ہی معیشت کا تعلق تعلیم سے رہا ہے، مگر موجودہ دور میں معاشی ترقی کے لئے اس کی اہمیت وضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے، جب تک تعلیمی اعتبار سے مسلمانوں کی حالت بہتر نہ ہو، وہ معاشی پسماندگی کے دلدل سے باہر نہیں نکل سکتے، موجودہ حکومت ایک حد تک مسلمانوں کے لئے تعلیمی مواقع بڑھانے پر توجہ دے رہی ہے؛ لیکن یہ مسلم سماج کی پسماندگی کے لحاظ سے اب بھی بہت کم ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ سرکاری سطح پر بھی اس کے لئے کوششیں ہوں اور مسلمان تنظیمیں بھی ایسے ادارے قائم کریں جو ان مسلمان نوجوانوں کی مدد کریں، جو بعض دفعہ بہت معمولی اسباب کی بناء پر تعلیم کا سلسلہ منقطع کردیتے ہیں، نیز مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اعلیٰ مسابقتی امتحانات کے لئے تیار کریں۔

(۳) مسلمان تاجروں، صنعت کاروں اور کاشتکاروں کے لئے بھی رہنما اداروں کی ضرورت ہے، جن میں ماہرین ایسی چیزوں کی نشاندہی کریں، جن کی تجارت مفید ہوسکتی ہے، کونسی صنعت اس وقت اس کے حالات کے لحاظ سے بہتر ہوسکتی ہے اور کس علاقہ میں کونسی کاشت بارآور ہوسکتی ہے اور اس کے لئے کیا مواقع ہیں؟ ان کے بارے میں معلومات فراہم کریں، اسی طرح مسلمان تاجر، کاشت کار اور صنعت کار اپنی پیداوار کو کس طرح اور کہاں برآمد کرسکتے ہیں، اس کی

رہنمائی کریں ، ایسے رہنما ادارے مسلمانوں کی معیشت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

(۴) ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں کو تجارت کی طرف راغب کیا جائے اور اس کے لئے ان کا ذہن بنایا جائے ؛ کیوں کہ تجارت خود اختیاری چیز ہے ، عام قسم کی تجارت میں نہ حکومت کی مدد ضروری ہے نہ پرائیوٹ کمپنیوں کی ؛ بلکہ حوصلہ، شعور اور محنت کی ضرورت ہے اور اکثر فقہاء کے نزدیک تجارت کو کسب کی دوسری صورتوں پر فضیلت حاصل ہے، اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود تجارت فرمائی ہے، حضرت ابوبکر ؓ وعمر ؓ اور حضرت عثمان ؓ بھی تاجر تھے اور زیادہ تر صحابہ ؓ کا ذریعہ معاش یہی تھا۔

(۵) ناخواندہ اور کم تعلیم یافتہ مسلمان مردوں اور خواتین کو باعزت روزگار سے مربوط کرنے کے لئے اسلامی شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے مائیکرو فائنانس (Micro Finance) کا نظام قائم کرنا بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس طرح نہ صرف سماج کے غریب لوگ باعزت طور پر زندگی گزارنے کے لائق ہوسکیں گے ؛ بلکہ اس سے غربت سے پیدا ہونے والی سماج برائیوں کو بھی دور کیا جاسکتا ہے۔

حضرات ! اس وقت سیمینار کا مقصد یہی ہے کہ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے معاشی ترقی کے مواقع پر غور کیا جائے اور رہنما خطوط متعین کئے جائیں کہ مسلمان کس طرح معاشی پسماندگی سے باہر آسکتے ہیں اور ملک کی ترقی وخوشحالی میں بھی اپنا کردار ادا کرنے کے لائق بن سکتے ہیں ، نیز ہندوستان میں اسلامی بینک کاری کے مواقع اور امکانات کا جائزہ لیا جائے اور اس کے لئے علمی ، سماجی اور سیاسی سطح پر کوششیں کی جائیں ، اس موقع پر اس بات کی وضاحت مناسب ہوگی کہ اکیڈمی شروع سے غیر سودی بینک کاری کے موضوع کو اہمیت دیتی رہی ہے، اس نے اس موضوع کو اپنے دوسرے، تیسرے اور چوتھے سیمینار میں بحث کا مستقل موضوع بنایا ہے، نیز ماہرین اقتصادیات اور اربابِ افتاء کے اشتراک سے ایک جامع رپورٹ تیار کی ہے جو طبع ہوچکی ہے، پھر اسلامی معاشیات سے متعلق کم سے کم ۲۳ رموضوعات مختلف سیمیناروں میں زیر غور آچکے ہیں۔

اس وقت اکیڈمی اس سیمینار کا انعقاد اس لئے کررہی ہے کہ معیشت سے ایک مسلمان کی

صرف دنیوی ضرورتیں ہی متعلق نہیں ہیں ؛ بلکہ مفلس وکم معاش قوم فکری ،تہذیبی یہاں تک کہ مذہبی اعتبار سے بھی احساس کمتری میں مبتلا ہوجاتی ہے اور بعض دفعہ تو یہ صورت حال ان کو کفر وارتداد تک پہنچا دیتی ہے ،جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**كاد الفقر أن يكون كفرا**'' (**شعب الایمان للبیهقی**، حدیث نمبر: ۶۶۱۲) خدا کرے یہ سیمینار اس سلسلہ میں مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کرسکے اور اپنے مقاصد واہداف کے اعتبار سے نتیجہ خیز ثابت ہو۔

وباللہ التوفیق وھو المستعان۔

● ● ●